برصغیر ہند میں تحریک احیائے دین اور سرفروشانہ جدوجہد کی مکمل سرگزشت

تحریک سید احمد شہیدؒ

جلد سوم

المعروف بہ ''جماعتِ مجاہدین''

تالیف

حضرت مولانا غلام رسول مہر رحمۃ اللہ علیہ

حسب ایماء

حضرت مولانا شمس الحق صاحب قاسمی، ممبئی

جملہ حقوق کتابت بحق ناشر محفوظ ہیں

تصریحات

نام کتاب	تحریک سید احمد شہیدؒ جلد سوم
مؤلف	مولانا غلام رسول مہر صاحبؒ
تصحیح	مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی
تعداد صفحات	۴۱۶
باہتمام	شمشیر احمد قاسمی (دیوبند)
کتابت	عمران کمپیوٹرس مظفر نگر (PH: 09219417735)
سن اشاعت	جنوری 2008

ملنے کے پتے

❖ دارالکتاب دیوبند
❖ کتب خانہ اعزازیہ دیوبند
❖ مسعود پبلشنگ ہاؤس دیوبند
❖ دکن ٹریڈرس مغل پورہ حیدرآباد
❖ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
❖ مدینہ بک اسٹال بھنڈی بازار ممبئی
❖ کتب خانہ حسینیہ دیوبند
❖ توحید بک ڈپو پھول پورا اعظم گڑھ
❖ مولانا عبدالسلام خاں قاسمی 179 کتاب مارکیٹ، بھنڈی بازار ممبئی

برصغیر ہند میں تحریک احیائے دین اور سرفروشانہ جدوجہد کی مکمل سرگذشت

جماعتِ مجاہدین

مجاہد کبیر حضرت سید احمد بریلوی کی جماعت کے تنظیمی حالات اور ان
اکابر رفقاء کے سوانح حیات جو سید صاحب کی زندگی میں یا ان کے
ساتھ شہید ہوئے، یا جنھوں نے بعد ازآں جہاد میں کوئی حصہ نہ لیا

مولانا غلام رسول مہرؔ

فہرست عنوانات

عنوان	صفحہ
سطورِ اولین	۱۹
عرضِ ناشر	۲۲
پیش لفظ	۲۴

حصہ اول

جماعت اور اس کی تنظیم

پہلا باب

عنوان	صفحہ
سکھ یا انگریز؟	۲۹
مزید شہادتوں کی ضرورت	۲۹
جہاد کی بنیاد	۲۹
سلطانِ ہرات کے نام مکتوب	۳۰
ہندو راؤ کو تلقین	۳۱
بدھی کی شہادت	۳۳
سوہن کی شہادت	۳۴

دوسرا باب

عنوان	صفحہ
تنظیم کی بنیاد	۳۵
امیر خاں کی معیت	۳۵
مستقل جماعت کی بنیاد	۳۶
فنونِ جنگ کی مشق	۳۷
تنظیم کی حیثیت	۳۸
غور طلب امور	۳۹
دعوت و تبلیغ کا انتظام	۴۰

تیسرا باب

عنوان	صفحہ
عسکری تنظیمات (۱)	۴۱
مجاہدین کی جماعتیں	۴۱
باقی جماعتیں	۴۲
نیلے پیادے	۴۳
رسالدار	۴۴
رسد کا انتظام	۴۵
رسد کی تقسیم	۴۶
سپاہی	۴۷
ایک روشن حقیقت	۴۸

چوتھا باب

عنوان	صفحہ
عسکری تنظیمات (۲)	۴۹
زخمیوں کا علاج	۴۹
سامانِ جنگ	۵۰
بارود، گولے، ٹل اور گنڈاسے	۵۱
فنونِ جنگ کی مشق	۵۲

عنوان صفحہ

- اکھاڑے ۵۴
- لشکر کے نشان ۵۴
- متفرق امور ۵۵
- شجاعت اور حسن تدبیر ۵۶
- مجاہدین پر شفقت ۵۷

پانچواں باب

- ادارہ و انتظام کا نقشہ ۵۸
- ضروری گزارش ۵۸
- عہدہ داروں کا تقرر ۵۸
- تحصیل عشر کا انتظام ۶۰
- تاکیدی احکام ۶۱
- مجلس شوریٰ ۶۲
- امان نامے اور عطیات ۶۳
- اتباع شریعت ۶۴
- اعلان عام ۶۴
- جرائم کے لئے سزائیں ۶۶

چھٹا باب

- دفتری ترتیبات ۶۷
- محکمۂ تحریر ۶۷
- اطلاعات کا اہتمام ۶۸
- طریق مکاتبت ۶۸
- روزنامچہ ۶۹
- کاغذات کا صندوق ۶۹
- نشان تاکید ۷۰
- مختلف مہریں ۷۰
- منشیوں کا اخلاص اور سادگی ۷۱
- غور طلب حقیقت ۷۲

ساتواں باب

- خط و کتابت ۷۳
- مجموعۂ مکاتیب ۷۳
- مرموز خط و کتابت ۷۳
- ایک مثال ۷۵
- شاہ اسحٰق اور شاہ یعقوب کے نام خطوط ۷۵
- کاتب اور مکتوب الیہما کے اسماء ۷۶
- قاصدوں کی کیفیت ۷۷
- رقعوں کی رسید ۷۸
- مرموز الفاظ ۷۸
- رقوم کے متعلق ہدایات ۷۹
- مجاہدین کا عمل ۷۹

آٹھواں باب

- دعوت و تبلیغ ۸۱
- تحریک کی بنیاد ۸۱
- ضروری انتظامات ۸۲
- خاص داعیوں کا تقرر ۸۲

عنوان صفحہ

- مولوی سید محمد علی رام پوری ۸۳
- مولوی ولایت علی عظیم آبادی ۸۴
- مولوی عنایت علی عظیم آبادی ۸۴
- باقی اصحاب ۸۵
- نتائج ۸۵

نواں باب

- مالی انتظامات ۸۷
- ابتدائی دور ۸۷
- متفرق تحائف ۸۸
- سرحد کے حالات ۸۸
- دورِ کشائش ۸۹
- خطوط کی شہادت ۸۹
- میاں دین محمد کا بیان ۹۰
- حیات النساء بیگم کا واقعہ ۹۰
- پانچ ہزار کی تقسیم ۹۱
- ضروری گزارش ۹۲

دسواں باب

- جماعت کی اسلامی اور اخلاقی شان (۱) ۹۳
- اسلامیت کا لب لباب ۹۳
- للّٰہیت کی شان ۹۴
- سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ۹۵

عنوان صفحہ

- راہِ رضا ۹۶
- اخلاص فی العمل ۹۷
- ایک اہم اصل ۹۸
- تسلیم وتوکل ۹۹
- سید صاحب کا نمونہ ۱۰۰
- اطاعت رب العالمین کی لذت ۱۰۱

گیارہواں باب

- جماعت کی اسلامی اور اخلاقی شان (۲) ۱۰۳
- جماعت اور اس کا سروسامان ۱۰۳
- فتوحات ۱۰۳
- کمال عجز وانکسار ۱۰۴
- طریق زندگی ۱۰۵
- نیکی میں سبقت ۱۰۸
- شہادت یا منزل مراد ۱۰۹
- موت سے بے پروائی

بارہواں باب

- جماعت کی اسلامی اور اخلاقی شان (۳) ۱۱۰
- اخوت ومساوات ۱۱۰
- مسلمانوں سے جنگ ۱۱۲
- عزیمت ۱۱۳
- تحمل شدائد ۱۱۵

عنوان	صفحہ
ہاتھ سے کام	۱۱۶
حق گوئی میں بیباکی	۱۱۷
عفت و پاکبازی	۱۱۸
شانِ تربیت	۱۱۹
سیادت	۱۱۹
آخری گزارش	۱۲۰

تیرھواں باب

عنوان	صفحہ
پیر محمد قاصد کا ایک سفر	۱۲۲
سید صاحب کے قاصد	۱۲۲
پیر محمد قاصد	۱۲۳
مظفر نگر سے دہلی	۱۲۳
قیام دہلی	۱۲۳
سفر ٹونک	۱۲۴
واپسی کی تیاری	۱۲۵
سفر مراجعت اور گرفتاری	۱۲۵
تلاشی اور قید	۱۲۶
حالاتِ اسیری	۱۲۶
رہائی کے بعد	۱۲۷
لاہور سے دہلی	۱۲۸
دوسرا سفر	۱۲۹
ایک سید کی شفقت	۱۳۰
ایک فقیر کی دغابازی	۱۳۰
کشمیری کی مہربانی	۱۳۰
دغاباز فقیر کی تلاش	۱۳۱
آخری منازل	۱۳۱
غور طلب نکتے	۱۳۲

چودھواں باب

عنوان	صفحہ
منظومات	۱۳۳
مدحیات منظوم	۱۳۳
پہلی نظم	۱۳۳
دوسری نظم	۱۳۴
مومن کے فارسی قصیدے	۱۳۵
مومن کے اردو اشعار	۱۳۷
ایک قطعہ	۱۳۷
مثنوی جہادیہ	۱۳۸
فارسی کی دو نظمیں	۱۴۰

حصہ دوم

مجاہدین و رفقاء

پہلا باب

عنوان	صفحہ
مولانا عبدالحئی	۱۴۵
ملازمت	۱۴۵
بیعت	۱۴۶
رفاقت	۱۴۷
ہجرت	۱۴۸
سفر کا راستہ	۱۴۸

عنوان صفحہ

● وفات ۱۴۹
● تربیت کا عمدہ نمونہ ۱۵۰
● اہل و عیال ۱۵۱
● بعض مبالغہ آمیز باتیں ۱۵۱
● صراط مستقیم کا عربی ترجمہ ۱۵۲
● علم و فضل ۱۵۳

دوسرا باب

● شاہ اسمٰعیل ۱۵۵
● بلند نسبتیں ۱۵۵
● ولادت ۱۵۵
● ابتدائی تعلیم ۱۵۶
● غیر معمولی دل و دماغ ۱۵۷
● دعوت و تبلیغ ۱۵۸
● بعض غیر مستند روایتیں ۱۵۹
● کارنامہ ہائے جہاد ۱۶۰
● اطاعت امام ۱۶۱
● حقانی ربانی بزرگ ۱۶۲
● نواب صدیق حسن خاں کا بیان ۱۶۳
● فراست مومن ۱۶۴
● بے مثال شخصیت ۱۶۵
● تصانیف ۱۶۶
● امت محمدیہ کا حکیم ۱۶۷
● مزاج ۱۶۸

عنوان صفحہ

● زہد و تقویٰ ۱۶۸
● دو خطرناک موقعے ۱۶۹
● افراط و تفریط اور توسط ۱۷۰
● شہادت ۱۷۱

تیسرا باب

● سید صاحب کے بھانجے ۱۷۲
● سید محمد علی ۱۷۲
● سفر حج ۱۷۲
● ٹونک کی زندگی ۱۷۳
● ازواج و اولاد ۱۷۳
● سید احمد علی ۱۷۴
● جہاد ۱۷۴
● عزم پھولڑہ ۱۷۵
● لشکر کی تقسیم ۱۷۵
● آغاز جنگ ۱۷۶
● شہادت ۱۷۶
● خبر شہادت ۱۷۷
● اولاد ۱۷۷
● سید موسیٰ ۱۷۸
● مجروحیت ۱۷۸
● سید صاحب کے ارشادات ۱۷۹
● شان صبر و شکیب ۱۷۹

عنوان	صفحہ
وفات	۱۸۰
سید حمید الدین	۱۸۱
سید عبد الرحمن	۱۸
سندھ میں اقامت	۱۸۲
بقیہ زندگی	۱۸۳
سید محمد یعقوب	۱۸۳
بقیہ زندگی	۱۸۴
چوتھا باب	
مولانا محمد یوسف پھلتی	۱۸۵
شانِ اتقاء	۱۸۶
علالت	۱۸۶
علاج	۱۸۷
وفات	۱۸۷
ولی اللہ	۱۸۸
لشکر اسلام کے قطب	۱۸۸
کمال دیانت	۱۸۹
پانچواں باب	
سید ابو محمد اور سید ابو الحسن	۱۹۰
ہجرت	۱۹۰
بیعت رضا	۱۹۱
عزم جنگ	۹۱
شہادت	۱۹۳

عنوان	صفحہ
اخلاق و عادات اور کمالات	۱۹۳
جذبۂ خدمت	۱۹۳
سید ابو الحسن	۱۹۴
چھٹا باب	
قاضی محمد حیان	۱۹۵
قاضی القضاۃ	۱۹۵
ایک لطیفہ	۱۹۶
اہل رسوم کا معاملہ	۱۹۷
انتظام عشر	۱۹۷
مردان پر یورش	۱۹۸
شہادت	۱۹۹
مدفن	۱۹۹
ساتواں باب	
مولوی خیر الدین شیرکوٹی	۲۰۰
مختلف خدمات	۲۰۰
سفارت	۲۰۱
چھتر بائی اور لونڈ خوڑ	۲۰۲
دانش و تدبر	۲۰۲
ہجرت ثانیہ سے اختلاف	۲۰۳
تنخواہ دار سپاہ کی تجویز	۲۰۳
بھوگڑ منگ اور بالاکوٹ	۲۰۴
سکھوں پر ہیبت	۲۰۴
مظفر آباد	۲۰۵

عنوان — صفحہ

[illegible] ۳۰۵
[illegible] ۳۰۶
مظفر آباد سے واپسی کا راستہ ۳۰۷

آٹھواں باب

شیخ بلند بخت و شیخ ولی محمد ۳۰۸
صبر و استقامت ۳۰۸
تحصیل ادب ۳۰۹
شیخ کی ولایت ۳۰۹
نصب العین ۳۱۰
شہادت ۳۱۱
شیخ ولی محمد ۳۱۲
[illegible] خدمات ۳۱۲
شہادت ۳۱۲
تعزیت ۳۱۳

نواں باب

مولوی مظہر علی عظیم آبادی ۳۱۵
ولادت و تعلیم ۳۱۵
[illegible] ۳۱۶
[illegible] ۳۱۶
[illegible] ۳۱۷
[illegible] ۳۱۷
[illegible] ۳۱۸
[illegible] ۳۱۸
شہادت ۳۱۵

دسواں باب

شیخ محمد اسحاق گورکھپوری ۳۲۰
بیعت ۳۲۰
ہجرت ۳۲۱
جنگ مایار ۳۲۱
[illegible] ۳۲۲
بالاکوٹ ۳۲۲
شہادت ۳۲۳

گیارہواں باب

ارباب بہرام خان ۳۲۶
[illegible] ۳۲۶
کارنامے ۳۲۷
پشاور سے ہجرت ثانیہ ۳۲۸
بالاکوٹ ۳۲۸
شہادت ۳۲۹
شخصیت ۳۲۹
[illegible] ۳۳۰
[illegible] ۳۳۰
ایک سبق آموز واقعہ ۳۳۱

بارہواں باب

[illegible] ۳۳۲

عنوان صفحہ

عہدہ رسالداری ۲۳۲
دعاء ۲۳۳
جنگِ امب ۲۳۴
انتظامِ عشر ۲۳۵
جنگِ ہنیار ۲۳۵
شانِ انتظام ۲۳۶
اہل وعیال ۲۳۶

تیرھواں باب

سید محمد علی رام پوری ۲۳۷
وقائع کا بیان ۲۳۷
حیدر آباد ۲۳۸
مدراس ۲۳۹
تبلیغ کے نتائج ۲۳۹
مدراس کا دوسرا سفر ۲۴۰
خان عالم خاں کی استقامت ۲۴۱
سید پر ظلم وجور ۲۴۱

چودھواں باب

میاں جی محی الدین چشتی ۲۴۴

پندرھواں باب

نواب وزیر الدولہ ۲۴۵
روزانہ زندگی ۲۴۵
شانِ عقیدت ۲۴۶
سید صاحب کے حالات ۲۴۷
خدمتِ حق ۲۴۷
وصایا ۲۴۸
پیکرِ اتباع ۲۴۹

سولھواں باب

سید قطب علی اور سید جعفر علی ۲۵۰
سید صاحب کی شہادت کا غم ۲۵۰
وفات ۲۵۱
جعفر علی ۲۵۱
قطعی فیصلہ ۲۵۲
روانگی ۲۵۳
راہِ حق میں پہلا قدم ۲۵۳
دعوت وایثار ۲۵۴

سترھواں باب

سید جعفر علی اور سفر کی صعوبتیں ۲۵۵
غازی پور اور جون پور ۲۵۵
شیخ غلام علی الہ آبادی ۲۵۶
گھنی، کان پور اور قنوج ۲۵۶
آزمائش در آزمائش ۲۵۸
قیامِ دہلی ۲۵۹
انبالہ ۲۵۹

عنوان صفحہ

اٹھارہواں باب

- چملہ سے سرحد ۴۵۹
- [illegible] ۴۶۰
- بہالی پیر ۴۶۱
- ترلہ ۴۶۲
- خواجہ جیمان سے گفتگو ۴۶۲
- راجہ ارسلان خاں ۴۶۳
- [illegible] ۴۶۴
- سفر کی دعوتیں ۴۶۴
- منزل مقصود ۴۶۶
- ذکر و موعظت ۴۶۷
- [illegible] ۴۶۷

انیسواں باب

- [illegible] ۴۶۸
- قصد مراجعت ۴۶۹
- سفر ۴۷۰
- ایک عجیب واقعہ ۴۷۰
- سرچشمہ ۴۷۱
- وطن ۴۷۲
- [illegible] ۴۷۳
- دو قافلے قندھار میں ۴۷۴
- وفات ۴۷۴
- [illegible] کی ترتیب ۴۷۵

بیسواں باب

- اللہ داد خاں [illegible] ۴۷۶
- مفسدوں کی شکست ۴۷۶
- شہادت ۴۷۷
- پڑول اور محمد سعید ۴۷۷
- اللہ داد خاں ۴۷۸
- تنظیم مجاہدین ۴۷۸
- محمد یوسف خاں ۴۷۹
- محمد اسمٰعیل خاں ۴۷۹
- حوادث غدر ۴۸۰
- [illegible] ۴۸۰
- محمد افضل خاں ۴۸۱
- [illegible] ۴۸۲

اکیسواں باب

- محمد مقیم عبداللہ و باب [illegible] ۴۸۳
- میاں محمد مقیم [illegible] ۴۸۳
- چمکنی میں جہاد ۴۸۳
- ارسلان خاں کی وفات ۴۸۴
- [illegible] ۴۸۴
- میاں [illegible] کی [illegible] ۴۸۵
- مراجعت اور وفات ۴۸۵
- تحریک محمدیہ ۴۸۶
- مولوی عبداللہ و باب ۴۸۷

عنوان صفحہ
- حفظ قرآن اور حسن تقسیم ۲۸۷
- عفو و حلم ۲۸۷
- رضائے باری تعالیٰ ۲۸۸
- شاہ یقین اللہ ۲۸۹
- مولوی نور احمد نگرامی ۲۹۰
- شہادت ۲۹۰

بائیسواں باب

- محمدی، باقر علی، محمد حسین، قمر الدین ۲۹۲
- منشی محمدی انصاری ۲۹۲
- اہل و عیال ۲۹۲
- ہجرت ۲۹۳
- انتظام دفتر ۲۹۳
- خاص نشانات ۲۹۳
- شہادت ۲۹۴
- اخلاق و عادات ۲۹۴
- باقر علی عظیم آبادی ۲۹۴
- شانِ ارادت ۲۹۵
- نائب تقسیم رسد ۲۹۵
- راہ حق کا پہلا شہید ۲۹۵
- شاہ محمد حسین عظیم آبادی ۲۹۶
- دعوت و تبلیغ ۲۹۶
- توسیع مسجد اور حج ۲۹۷
- سواری و سپہ گری ۲۹۷

عنوان صفحہ
- وقت ۲۹۸
- اوراد ۲۹۸
- قمر الدین حسینی ۲۹۹
- بیعت و رفاقت ۲۹۹
- شہادت ۳۰۰

تیئیسواں باب

- احمد اللہ، خیر آبادی گھرانا، عبدالمجید خاں ۳۰۱
- احمد اللہ ناگ پوری ۳۰۱
- کمالات ۳۰۱
- مختلف خدمات ۳۰۲
- بالاکوٹ ۳۰۲
- نیزہ بازی ۳۰۳
- خیر آبادی مجاہد ۳۰۳
- گوہر خاں ۳۰۴
- امام خاں ۳۰۴
- محمد خاں ۳۰۵
- ابراہیم خاں ۳۰۶
- احمد خاں اور ارادت خاں ۳۰۶
- عبدالمجید خاں آفریدی ۳۰۷
- نیکی میں سبقت ۳۰۷
- شہادت ۳۰۸

عنوان صفحہ

چوبیسواں باب

- شہزادہ گدڑی، انور شاہ، اکبر خاں ۳۰۹
- شہزادہ گدڑی ۳۰۹
- شہادت ۳۱۰
- منظورہ کا بیان ۳۱۰
- سید انور شاہ ۳۱۱
- یلادا ۳۱۱
- ہجرت ۳۱۲
- جنگ بازار ۳۱۲
- مراجعت ۳۱۳
- اکبر خاں ۳۱۳
- اکوڑہ اور بازار ۳۱۳

پچیسواں باب

- اللہ بخش، امیر اللہ، کالے خاں ۳۱۵
- اللہ بخش مورائیں ۳۱۵
- سید صاحب کی بیعت ۳۱۵
- ساقۃ الجیش کے امیر ۳۱۵
- پہلے جنگی جیش کے سالارِ اعظم ۳۱۶
- شہادت ۳۱۶
- پیر خاں ۳۱۷
- شیخ امیر اللہ ۳۱۷
- بیٹے کو خط ۳۱۸
- مایار اور بالاکوٹ ۳۱۹
- کالے خاں شمس آبادی ۳۱۹
- شہادت ۳۲۰
- سید صاحب کی شانِ تربیت ۳۲۱

چھبیسواں باب

- حسن علی، احمد بیگ، نورداد خاں ۳۲۲
- شیخ حسن علی کا خاندان ۳۲۲
- حج اور ہجرت ۳۲۲
- سازش کی خبریں ۳۲۳
- ٹونک میں سکونت ۳۲۴
- اخلاق و عادات ۳۲۴
- شانِ ایثار ۳۲۵
- میرزا احمد بیگ ۳۲۵
- دعوت و ارشاد ۳۲۶
- احمد بیگ کی سبقت ۳۲۶
- میرزا کی شہادت ۳۲۷
- نورداد خاں ۳۲۷
- واقعہ بیعت ۳۲۸
- شہادت ۳۲۹

ستائیسواں باب

- فیض علی، امجد علی، مصطفیٰ شاہ سید ۳۳۰
- میر فیض علی ۳۳۰

عنوان	صفحہ
پھوزہ پرورش	۳۳۰
شہادت	۳۳۱
امجدی	۳۳۲
مجروحیت	۳۳۲
زندہ شہید	۳۳۲
شہادت	۳۳۳
حافظ مصطفی	۳۳۳
شان استقامت	۳۳۴
دانش و تدبر	۳۳۴
شہادت	۳۳۵
ما شاد سید	۳۳۵
شہادت	۳۳۶

اٹھائیسواں باب

عنوان	صفحہ
امام الدین، اولاد حسن، غلام علی	۳۳۷
مولوی امام الدین بنگالی	۳۳۷
مراجعت	۳۳۸
سید اولاد حسن قنوجی	۳۳۸
جہاد اور دعوت و ارشاد	۳۳۹
وفات	۳۴۰
والد کے ترکے کا معاملہ	۳۴۱
ایک غلط روایت	۳۴۲
شیخ غلام علی الہ آبادی	۳۴۲
سید صاحب سے عقیدت	۳۴۲
خدمت	۳۴۲
شہادت	۳۴۳

انتیسواں باب

عنوان	صفحہ
مختلف اصحاب (۱)	۳۴۴
نواب احمد علی خاں	۳۴۴
بیعت جہاد	۳۴۴
قاضی احمد اللہ میرٹھی	۳۴۵
سید اسمٰعیل رائے بریلوی	۳۴۶
صوفی نور محمد بنگالی	۳۴۷
شیخ منور علی قدوائی	۳۴۷
اخوند فیض محمد	۳۴۸
امجد خاں	۳۴۹
امام الدین جیبی والے	۳۴۹
حاجی زین العابدین	۳۵۰
سید عبدالرؤف	۳۵۰
محمد عرب اور فرج اللہ	۳۵۱
داراب اور غریب اللہ	۳۵۱

تیسواں باب

عنوان	صفحہ
مختلف اصحاب (۲)	۳۵۲
حاجی بہادر شاہ خان	۳۵۲
سندھ کے شہداء	۳۵۲

عنوان	صفحہ
شیوہ کے شہداء	۳۵۳
ترلانڈی اور ترکئی کے شہداء	۳۵۴
مینئی کے شہداء	۳۵۴
سید چراغ علی شاہ	۳۵۵
باقر علی عظیم آبادی	۳۵۵
مولوی طالب علی	۳۵۶
کریم بخش ہاشم پوری	۳۵۶
حافظ جانی وحافظ مانی	۳۵۷
قاضی علاء الدین بگھروی	۳۵۷
مایار کے شہداء	۳۵۷
کھیرزئی کے شہداء	۳۵۸
چھتر بائی کے شہداء	۳۵۸
سید مردان علی شاہ	۳۵۹

اکتیسواں باب

عنوان	صفحہ
مختلف اصحاب (۳)	۳۶۰
مولوی محمد حسن	۳۶۰
شہادت	۳۶۱
میرزا عبدالقدوس کشمیری	۳۶۱
میر احمد علی بہاری	۳۶۲
شہیدانِ ڈمگلہ	۳۶۲
قاضی مدنی	۳۶۲
ملا اسماعیل اخوندزادہ	۳۶۳
ارباب فیض اللہ خاں مہمند	۳۶۳
ناصر خاں بھٹ گرامی	۳۶۴
اخوند سید میر	۳۶۵
خواجہ محمد	۳۶۶
مولوی عبدالحق نیوتنوی	۳۶۶
حافظ عبداللطیف	۳۶۷
چھتر بائی کا واقعہ	۳۶۷
مراجعت	۳۶۸
خضر خاں قندھاری	۳۶۸
عبدالرحیم	۳۶۹
حافظ الٰہی بخش	۳۷۰
سید عبداللہ سیرام پوری	۳۷۱
شیخ عبداللطیف تاجر	۳۷۱
منشی امین الدین احمد	۳۷۲
شیخ علی جان	۳۷۳
صدرالدین قصاب	۳۷۳
بابا بہرام خاں تنولی	۳۷۴
محمود خاں لکھنوی	۳۷۴
مہربان خاں	۳۷۵
حسن خاں بنارسی	۳۷۵
باقی اصحاب	۳۷۵
شادل خاں گنج پوری	۳۷۶
فقیر محمد خاں آفریدی	۳۷۶
استاد یوسف آہن گر	۳۷۷

بتیسواں باب

عنوان	صفحہ
مختلف اصحاب (۴)	۳۷۸
مولانا حیدر علی رام پوری	۳۷۸
مولانا غلام جیلانی رام پوری	۳۷۹
مولوی کرامت علی جون پوری	۳۷۹
مولانا عبدالقیوم بڑھانوی	۳۸۰
مولوی خرم علی بلہوری	۳۸۱
مولوی سخاوت علی جون پوری	۳۸۱
مولوی حبیب اللہ قندھاری	۳۸۲
مولانا عبداللہ علوی	۳۸۲
حکیم مومن خاں مومنؔ	۳۸۳
میاں دین محمد	۳۸۳
میاں جی نظام الدین چشتی	۳۸۴
شیخ محمد تقی	۳۸۴
متفرق اصحاب	۳۸۵
خاتمہ	۳۸۵

ضمیمہ (۱)

عنوان	صفحہ
جہادیہ (فارسی)	۳۸۷

ضمیمہ (۲)

عنوان	صفحہ
سید عبداللہ سیرام پوری	۳۹۴
ترجمے کی نقل	۳۹۶
عرضِ طباعت	۳۹۶
اہتمام طباعت	۳۹۷
کیفیت وطن و اجداد	۳۹۸
فائدہ	۳۹۸
شکر و سپاس	۳۹۹

ضمیمہ (۳)

عنوان	صفحہ
سید جعفر علی نقوی	۴۰۱

ضمیمہ (۴)

عنوان	صفحہ
شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب	۴۰۲
شاہ محمد اسحاق	۴۰۲
شاہ محمد یعقوب	۴۰۸
شاہ ولی اللہ کی پیش گوئی	۴۰۸
ازواج ثلاثہ کی روایات	۴۰۸

ضمیمہ (۵)

عنوان	صفحہ
متفرق واقعات	۴۱۰
مولانا عبدالحیؒ	۴۱۰
شانِ تلقین	۴۱۰
سفر ہجرت	۴۱۱
مولانا محمد یوسف	۴۱۱

ضمیمہ (۶)

عنوان	صفحہ
قصیدہ در قصائص	
حمر نبیل مولانا محمد اسماعیل	۴۱۲

◆ ◆ ◆

سطورِ اولین

بسم اللّٰہ وحدہٗ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہٗ وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ الی یوم القیامۃ۔

مجاہد کبیر حضرت مولانا ومقتدانا سید احمد شہید رحمہ اللہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا وہ آفتابِ نیم روز اور مینارۂ نور ہیں جن کی مثال گذشتہ کئی صدیوں میں نہیں ملتی۔ اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ کی بازیابی اور پرچم اسلام کی بلندی کے لئے آپ کی خدمات روزِ روشن کی طرح عیاں اور مشعلِ راہ ہیں۔

مجھے آپ کی زندگی کے قیمتی لمحات اور مجاہدات پر روشنی ڈالنا مقصد نہیں، کہ یہ کام ضخیم مجلدات کا متقاضی ہے اور الحمد للہ اب تک ہزاروں صفحات اس حکایتِ لذیذ اور روح پرور داستان میں مرقوم ہوکر تاریخ کا روشن باب بن چکے ہیں۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی مرتب کردہ دو ضخیم جلدیں "سیرت سید احمد شہید" گذشتہ تقریباً نصف صدی سے اہل علم وفدا کارانِ اسلامیت سے خراج تحسین حاصل کررہی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب "سید احمد شہید" حضرت مولانا غلام رسول مہر کے اعجاز رقم قلم کا شاہکار ہے۔ یہ دراصل مولانا مہر کے اس "زریں سلسلہ" کی پہلی کڑی ہے جو انھوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ، ان کی تحریک اور ان کے رفقاء کے حالات ومجاہدانہ کارناموں کے بیان میں مرتب کی ہے۔

حضرت مولانا غلام رسول مہر کی تحریر فرمودہ کتابوں (سید احمد شہید اول - دوم، جماعت مجاہدین اور سرگزشت مجاہدین) تقریباً ایک صدی کی تاریخ ہے جو مجاہد کبیر، ان کی تحریک اور ان کے جانباز رفقاء کے حالات ومجاہدات اور خدمات کو منظرِ عام پر لانے میں نمایاں اور منفرد مقام رکھتی ہیں۔ یہ ایسی تاریخ ہے جس میں تاریخ نویس خود اس تاریخ کا ایک حصہ اور مشاہد محسوس

ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مولانا مہرؔ نے ان کتابوں کو صرف داستان برائے داستان اور حکایات و روایات اور کتابوں کی مدد سے مرتب نہیں کیا بلکہ بذاتِ خود ان تمام مواضعات، متعلقہ منازل، مقاماتِ جنگ و جہاد، مشاہد اور رہ گذروں کا مشاہدہ کیا، برسوں ان علاقوں کی دشت نوردی اور پیما سرائی کی جہاں ان مبارک نفوس کے قدم پڑے، جہاں انھوں نے اس بلند مقصد کے لئے لیل و نہار گزارے، جہاں انھوں نے جہدِ آزادی اور سربلندیٔ اسلام کے لئے اپنی ذہنی، روحانی اور جسمانی تمام صلاحیتیں صرف کیں اور حد یہ ہے کہ بیشتر نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی، یعنی جامِ شہادت نوش کرکے اُس حیاتِ جاودانی سے سرفراز ہوئے جو عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ کے پروانۂ خاص کا حقدار بناتی ہے۔

مولانا مہرؔ کا اسلوب و بیان ادبیت و دلکشی اور جاذبیت و محویت سے ایسا پُر ہے جس سے مطالعہ کنندہ نہ صرف اپنے آپ کو ان مقامات میں موجود محسوس کرتا ہے بلکہ اپنے اندر اعلائے کلمۃ اللہ اور سربلندیٔ اسلام کیلئے ایک جذبہ جوش مارتا ہوا پاتا ہے۔ انھوں نے اس تاریخ کو برسہا برس کی محنت سے لکھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سید احمد شہید کے اس مشن اور تحریک میں خود ڈوب کر اور اس میں خود کو محو کر کے لکھا ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے آپ دیکھیں گے کہ جگہ جگہ وہ ان فدایانِ اسلام کی خدماتِ عالیہ اور جذبۂ مقدس کو سلامِ عقیدت پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

یہ کتابیں (سید احمد شہید، جماعت مجاہدین، سرگزشت مجاہدین) پچھلے کافی عرصہ سے ہندوستان میں نایاب ہو چکی تھیں، میری ایک عرصہ سے خواہش تھی یہ سیریز شائع ہو کر اہل علم اور شائقین حضرات کے لئے دستیاب ہونی چاہئے۔ کیونکہ بقول مولانا غلام رسول مہر، اگر اس عظیم تحریک کو تاریخ ہند سے نکال دیا جائے تو پھر اسلامی جدوجہد کے حوالہ سے باقی ہی کیا رہ جاتا ہے؟ ہمیں اپنے اسلاف کرام کے ان مجاہدانہ کارناموں کی سرگزشت کو ہمیشہ اپنے سینوں سے لگا کر رکھنے اور مواقع و حالات کے مطابق ان کی تحریک کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ عزیز محترم مولانا شمشیر احمد قاسمی نے میری خواہش و اصرار پر اس کام کا

بیڑا اٹھایا۔ پرانے ایڈیشنوں میں اغلاط بھی تھیں، ساتھ ہی کتابت میں یکسانیت اور جاذبیت بھی نہ تھی، اس لئے بہتر یہ معلوم ہوا کہ از سر نو کتابت کرا کر اس سیریز کو نئی آب و تاب کے ساتھ ہدیۂ قارئین کیا جائے۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اب اس سیریز کو ایک نیا نام دیا گیا ہے یعنی ''تحریکِ سید احمد شہیدؒ'' جو چار جلدوں پر مشتمل ہوگی، ٹائٹل اور اندر صفحات کے بالائی حصہ پر اس نئے نام کے ساتھ ساتھ پرانے ناموں کو بھی باقی رکھا گیا ہے۔

میں جناب مولانا شمشیر احمد قاسمی کو مبارک باد دیتا ہوں اور ساتھ میں مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی کی تصحیح کی خدمت کو سراہتے ہوئے دعا گو ہوں کہ رب کریم ہمیں بھی ان پاک نفوس کے جذبۂ اسلامیت اور عشقِ الٰہی کا کوئی حبہ اور حصہ نصیب عطا کر کے اپنی راہ رضا پر چلنے توفیق ارزانی کرے اور اس فرشتہ صفت جماعت کی معیت نصیب فرمائے، آمین

الراقم
شمس الحق قاسمی
مکتبۃ الحق (ممبئی)

عرضِ ناشر

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہ الطیبین الطاہرین وصحبہ اجمعین۔

مقامِ مسرت ہے کہ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے حالات وخدمات، ان کی تحریک اور ان کے رفقاء کی سرگزشت پر مشتمل یہ عظیم سیریز کتب (سید احمد شہید ہر دو جلد، جماعتِ مجاہدین، سرگزشتِ مجاہدین) جدید عنوان ”تحریک سید احمد شہید“ کے ساتھ شائع کرنے کی مجھے ایسے موقع پر سعادت حاصل ہو رہی ہے جب کہ ملک میں جدوجہد آزادی ہند کی ڈیڑھ سو سالہ سالگرہ حکومتی سطح پر بڑے جوش وخروش سے منائی جا رہی ہے۔ لیکن اس میں ہمارے اسلافِ کرام کی قربانیوں کو جس طرح نظر انداز کیا جا رہا ہے وہ نہ صرف افسوسناک اور قابلِ مذمت ہے بلکہ ملت کے رہنماؤں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لئے ایک تازیانہ بھی ہے۔ جو زمانہ کے جدید تقاضوں کی تفہیم، ان سے حصولِ مقصد کے امکانات اور مقابل ومخالف طاقتوں کے خلاف صف آرا اور متحد ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔ یا انھیں بتا رہا ہے ؎

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

حقیقت تو یہ ہے ہمیں پیش قدمی کرتے ہوئے خود اپنے اسلافِ کرام کی خدمات اور قربانیوں کو منظرِ عام لانے کیلئے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اجتماعات منعقد کرنے چاہئیں اور اپنے اسٹیج سے ان لوگوں کو اپنے بزرگوں کی مدح سرائی کے لئے مجبور کرنا چاہئے تھا، جن کے تغافل کا ہم آج رونا رو رہے ہیں۔

آزادئ ملک وملت اور سربلندئ اسلام کے لئے سرفروشانہ جدوجہد اور اہالیانِ اسلام کی عظمتِ رفتہ کی بازیابی کی کوشش میں حضرت سید احمد شہید اور ان کے جانباز رفقاء کا جو حصہ ہے، ان کی جو روشن خدمات ہیں، یہی اس سیریز کا موضوع ہے۔

اس سیریز کی چار ضخیم جلدیں جو تقریباً ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل ہیں، ان کی کمپیوٹر

کتابت میں ایک اہم مسئلہ تصحیح کا تھا، چونکہ کمپیوٹر کتابت میں اغلاط رہ جاتی ہیں اور بعض مرتبہ وہ عجیب وغریب شکل اور الفاظ کا جامہ پہن لیتی ہیں۔

اس مشکل کا حل رب کریم نے اس طرح نکالا کہ جناب مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی نے اس اہم اور تاریخی سلسلہ کی کتابت وتصحیح کی ذمہ داری لے کر ایک طرح سے ہمارے لئے اس اہم مرحلہ کو آسان بنادیا۔ مولانا موصوف تصنیف تالیف اور تصحیح وترجمہ میں اپنی ایک شناخت قائم کرچکے ہیں، فرید بک ڈپو دہلی سے ان کی تصحیح کردہ وترتیب دادہ متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ گذشتہ سال حکیم الاسلام عالمی سیمینار کے موقع پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی تالیفات ومضامین کا حسین مرقع سات جلدوں میں ان کا مرتب کردہ شائع ہوکر اہل علم وقدرداں حضرات سے خراج تحسین حاصل کرچکا ہے، ان کتابوں کا اجراء مقتدر علماء کرام کے ہاتھوں مذکورہ سیمینار میں ہوا تھا۔

ایک قابل لحاظ کام یہ کیا گیا ہے کہ سابق ایڈیشنوں میں فہرست نامکمل تھی، صرف ابواب کے صفحات کی نشاندہی کی گئی تھی، موجودہ ایڈیشن میں تفصیلی فہرست مرتب کی گئی ہے، یہ یقیناً بڑی محنت کا کام ہے۔ جس سے ایک ہی نظر میں کتاب کے تمام مندرجات پوری طرح سامنے آجاتے ہیں۔

بہرحال مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی نے اس سلسلہ کتب کی کتابت وتصحیح کی خدمت انجام دے کر ہمارے لئے اس سلسلہ کی اشاعت کو کافی حد تک آسان بنادیا۔

اس کتاب کو مولانا غلام رسول مہر نے جس جانفشانی سے مرتب کیا تصنیف وتالیف کی دنیا میں وہ کسی عجوبہ سے کم نہیں۔ اللہ رب العزت کا شکر واحسان ہے کہ اس نے ہمیں ایسی اہم کتابوں کی سیریز کی اشاعت کی توفیق سے نوازا۔ وما توفیقی الا باللہ

شمشیر احمد قاسمی
ناظم کتاب گھر دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

آناں کہ غم تو برگزیدند ہمہ ❀ در کوئے شہادت آرمیدند ہمہ
درمعرکۂ دوکون فتح از عشق است ❀ با آنکہ سپاہ او شہیدند ہمہ

میں نے سید صاحب اور ان کی جماعت کے متعلق تین کتابیں لکھنے کا فیصلہ کیا تھا: اول سید صاحب کے سوانح حیات، دوم جماعت کی تنظیم کے مقاصد و اصول، سوم سید صاحب کی شہادت کے بعد جماعت مجاہدین کی صد سالہ سرگزشت۔ ان میں سے پہلی کتاب گزشتہ سال دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ چند ہی مہینوں میں دوسری کتاب بھی مدارج ترتیب طے کر کے اشاعت کی منزل میں پہنچ رہی ہے۔ انشاء اللہ اب تیسری کتاب کی تکمیل میں بھی زیادہ وقت صرف نہ ہوگا۔ امید ہے اسی سال وہ بھی مطبع میں پہنچ جائے گی۔ اس طرح وہ گراں قدر فرض پورا ہو جائے گا جو سالہا سال سے میں نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ توفیق ایزدی کی یاوری شامل حال نہ ہو تو انسان کا قصد و ارادہ ہیچ ہے:

جو کچھ کہ ہوا، ہوا کرم سے تیرے ❀ جو کچھ ہوگا، ترے کرم سے ہوگا

پیش نظر کتاب دو حصوں میں منقسم ہے: پہلے حصے میں جماعت کی تنظیم و ترتیب کے متعلق وہ تفصیلات مرتب صورت میں پیش کی گئی ہیں، جو آج تک کہیں جمع نہ ہو سکیں۔ ہزاروں صفحات میں یہ معلومات جا بجا بکھری پڑی تھیں۔ میں نے بار بار کے مطالعے اور غور و تحقیق سے انہیں جمع کیا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان جواہر ریزوں کے چننے میں کتنی

مدت تک رات دن آنکھوں کا تیل ٹپکایا۔ الحمدللہ کہ ایک ایسا خاکہ تیار ہو گیا جسے پیش نظر رکھ لینے سے فکر و کاوش کی نئی وادیاں قطع کرنا نسبتاً سہل ہو جائے گا۔

دوسرے حصے میں سید صاحب کے ان مجاہدوں اور رفیقوں کے سوانح درج ہیں جو ان کی زندگی میں یا انکے ساتھ جاں بحق ہوئے، یا جنہوں نے بعد ازاں مجاہدانہ سرگرمیوں میں کوئی حصہ نہ لیا، یا جنہیں خود سید صاحب نے دعوت وتبلیغ پر متعین کر دیا تھا اور وہ انہیں مشاغل میں زندگی گزار کر مالک حقیقی سے جا ملے۔

ان سوانح کی ترتیب ونگارش کا مقصد یہ تھا کہ سید صاحب کی تربیت اور مردم گری کے کچھ عملی نمونے سامنے آ جائیں تا کہ اندازہ ہو سکے کہ اس پاک نفس بزرگ نے تھوڑی سی مدت میں کیسی جماعت تیار کر لی تھی۔ واضح رہے کہ سید صاحب کا ظہور اس تاریک دور میں ہوا جب اس ملک کے مسلمانوں کا سیاسی، دینی اور اخلاقی زوال آخری منزل پر پہنچا ہوا تھا۔ شوکت وسطوت کے اس مستحکم حصار کی بنیادیں منہدم ہو رہی تھیں، جس کی دیواروں کو سیسہ پلانے میں اسلامی ہند کے مایۂ ناز تاجدار، سالار اور مدبر سات صدیوں تک خون پسینا ایک کرتے رہے تھے۔ سید صاحب نے مادی سروسامان سے یکسر محرومی کے باوجود محض عشق حق کی حرارت سے اس ظلمت زار میں سیکڑوں ایسے چراغ روشن کر دیے جو اسلامیت کے درخشاں ترین دوروں کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ نیز خیال تھا کہ جن جانبازان راہ حق نے احیائے اسلامیت کیلئے اپنا خون بے دریغ بہایا، انکی قربانیاں آنے والی نسلوں کیلئے ایک گراں بہا قومی ودینی میراث کی صورت میں محفوظ ہو جانی چاہئیں۔

ظاہر ہے کہ اس تذکرے میں وہ تمام اصحاب نہ آ سکتے تھے جنہوں نے سید صاحب کے دریائے فیض سے شوق کی پیاس بجھائی اور جنکی تعداد عام روایت کے مطابق لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ میرے علم میں بے شمار نام تھے، لیکن ان کے حالات نہ مل سکے اور محض نام درج کر دینے سے اصل مقصد کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکتا تھا، لہذا میں نے اپنا دائرہ تذکیر وتحریر

صرف ان اصحاب تک محدود رکھا جن کی زندگیاں کسی نہ کسی پہلو سے سید صاحب کی خاص تربیت کا نمونہ پیش کر سکتی تھیں۔

ان اسماء گرامی میں بعض اکابر شامل نہیں کیے گئے، مثلاً مولانا ولایت علی عظیم آبادی، مولانا عنایت علی عظیم آبادی، مولوی نصیر الدین منگلوری، مولوی نصیر الدین دہلوی، حاجی عبدالرحیم ولایتی، شیخ ولی محمد پھلتی یا متعدد دوسرے اصحاب۔ وجہ یہ ہے کہ ان بزرگوں نے وہ کام جاری رکھا جس کی بنیاد سید صاحب کے بابرکت ہاتھوں سے پڑی تھی۔ ان کے مفصل حالات اس سلسلۂ کتب کے آخری حصے کا سرمایہ ہیں، جو آج کل زیر ترتیب ہے۔ اسی حصے میں ارادت مندانِ سید کے وہ کارنامے تفصیلاً بیان ہوں گے جو انہوں نے ہندوستان کے اندر یا باہر اسلامیت کے احیاء، کلمۂ حق کی سربلندی اور ملک کی آزادی کیلئے انجام دیے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ حصہ مرتب ہو گیا تو اندازہ ہو سکے گا کہ سید صاحب کی تحریک کا آخری باب بالاکوٹ کا شہادت زار نہ تھا، بلکہ یہ بدستور قائم واستوار رہی اور اس کے نتائج بڑے ہی دوررس تھے۔

"سید احمد شہید" کو جو پیرایۂ قبول عطا ہوا، اس کیلئے میں بارگاہِ باری تعالیٰ میں سراپا شکر گزار ہوں۔ مقصود حقیقی یہ تھا کہ سید صاحب کی ذاتِ گرامی کا اصل موقف غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کے گرد وغبار سے پاک ہو کر سامنے آ جائے۔ امید ہے کہ موجودہ کتاب اس سلسلے میں مزید توضیح اور انشراحِ خاطر کا وظیفہ انجام دے گی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اسے بھی درجۂ قبول ارزانی کرے اور جو حصہ باقی ہے اسے پورا کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

مہر

مسلم ٹاؤن لاہور　(۱۲/ستمبر ۱۹۵۵ء)

برصغیر ہند میں تحریک احیائے دین اور سرفروشانہ جدوجہد کی مکمل سرگذشت

حصہ اول

جماعت اور اس کی تنظیم

پہلا باب:

سکھ یا انگریز؟

مزید شہادتوں کی ضرورت

سید صاحب نے جو مقصد و نصب العین پیشِ نظر رکھ کر جہاد کیلئے تنظیمات فرمائی تھیں، اس کی تشریح میں نے ''سیرت'' میں کر دی تھی۔ (۱) یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس میں کب اور کیوں کر تحریفات کا سلسلہ شروع ہوا، یہاں تک کہ نصب العین کا حلیہ ہی مسخ ہو کر رہ گیا۔ میں نے ہر گزارش کے ضمن میں سید صاحب کی تحریرات سے شہادتیں پیش کیں۔ ان سے وہی نتیجہ نکل سکتا تھا جو میں نے نکالا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان توضیحات کے باوجود بعض قلوب میں غالباً اب تک شبہات باقی ہیں یا کم از کم یقین و قطعیت کی وہ روح پیدا نہیں ہوئی جو اس بارے میں لازماً پیدا ہونی چاہیے تھی۔ ایک بہت بڑے صاحبِ علم نے تو صاف صاف فرما دیا کہ میرا اخذ کردہ نتیجہ محض قیاسی ہے اور قیاسی و استنباطی نتیجے پر بار بار زور دینے کی مصلحت سمجھ میں نہ آئی۔ ان حالات میں ضرورت محسوس ہوئی کہ اس مسئلے کے متعلق مزید شہادتیں فراہم کی جائیں۔ جن کے بعد کسی شخص کیلئے وسوسے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

جہاد کی بنیاد

میرے نزدیک تو محض جہاد کی بنیاد و اساس ہی پیشِ نظر رکھ لینے کے بعد شبہ کا امکان

---

(۱) ملاحظہ ہو ''سید احمد شہید'' جلد اول ص ۲۴۳ تا ۲۸۱

باقی نہیں رہتا۔ سید صاحب فرماتے ہیں کہ جب اسلامی بلاد غیر مسلموں کے قبضے میں آ جائیں تو عام اہل اسلام پر عموماً اور مشاہیر حکام پر خصوصاً جہاد واجب و مؤکد ہو جاتا ہے۔ (۱) یہ مضمون سید صاحب کے مختلف مکاتیب میں دہرایا گیا ہے۔

اب غور کیا جائے کہ آیا ہندوستان کی وسیع سر زمین میں سے صرف وہی حصہ مسلمانوں کے قبضے سے نکلا تھا جس پر سکھ قابض تھے اور جس کی جنوبی حد دریائے ستلج تھی؟ اس سے بدرجہا وسیع تر اور زرخیز تر خطے دریائے ستلج سے شرقاً اراکان تک، غرباً کاٹھیاواڑ گجرات تک اور جنوباً راس کماری تک مسلمانوں ہی کے قبضے میں تھے اور انہیں سے اغیار نے چھینے تھے، خواہ وہ مرہٹے ہوں یا پرتگیز، فرانسیسی ہوں یا انگریز یا کوئی اور۔

کون کہہ سکتا ہے کہ سید صاحب کو شمالی و غربی ہند کے صرف اس خطے کا غم تھا جس پر رنجیت سنگھ نے تسلط جما لیا تھا اور باقی حصوں سے وہ بالکل بے پروا تھے؟ حالانکہ تاریخی، جغرافیائی اور سیاسی نقطۂ نگاہ سے باقی خطے بدرجہا زیادہ اہم تھے۔ محض اس نکتے پر توجہ فرما لینے سے حقیقتِ حال بخوبی آشکارا ہو سکتی ہے، تاہم میں صرف قیاس و استنباط پر اکتفا نہ کروں گا۔ ایسی شہادتیں بھی موجود ہیں جن میں تصریحاً ہندوستان کی تطہیر کا ذکر ہے۔

سلطانِ ہرات کے نام مکتوب

سید صاحب کے زمانے میں شاہ محمود درانی (بن تیمور شاہ بن احمد شاہ ابدالی) ہرات میں حکمراں تھا۔ کابل و قندھار بارک زئیوں کے قبضے میں جا چکے تھے، سید صاحب نے دوسرے مسلمان حکمرانوں کے علاوہ شاہ محمود کو بھی جہاد کی دعوت دی تھی۔ اس میں فرماتے ہیں:

> ''اقامت جہاد و ازالہ بغی و فساد در ہر زمان و ہر مکان از اہم احکام حضرت رب العباد است، خصوصاً درین جزو زمان کہ وقت شورش اہل کفر و طغیان بحدے رسیدہ کہ تخریب شعائر دین وافسر و حکومت سلاطین از دست

---

(۱) مکاتیب شاہ اسمٰعیل شہید قلمی نسخہ ص ۵۵، مکاتیب سید صاحب ص ۲۳۷۔

> کفرۂ متمردین و بغات بہ وقوع آمدہ، و ایں فتنۂ عظیم تمام بلاد ہند و سند و خراسان را فرا گرفتہ۔ پس دریں صورت تغافل در مقدمۂ استیصال کفرۂ متمردین و تساہل در باب سرزنش باغیان مفسدین از اکبر معاصی و اقبح آثام است۔ بناءً علیہ ایں بندہ درگاہ حضرت اللہ از وطن مالوفہ خود برخاستہ در دیار ہند و سند و خراسان دور و سیر نمودہ و مومنین آں اقطار و مسلمین آں دیار را بہ ایں معنی ترغیب کرد۔(۱)
>
> **ترجمہ**: جہاد قائم کرنا اور بغات و فساد کو مٹانا ہر زمانے اور ہر مقام میں خدا کا نہایت اہم حکم رہا ہے۔ خصوصاً اس زمانے میں جب کافروں اور سرکشوں کی شورش ایسی صورت اختیار کر چکی ہے کہ سرکشوں اور باغیوں کے ہاتھوں دینی شعائر بگاڑے جا رہے ہیں اور شاہانِ اسلام کی حکومتوں میں ابتری پیدا کی جا رہی ہے اور یہ زبردست فتنہ ہند، سندھ اور خراسان کے خطوں پر چھا گیا ہے۔ اس صورت میں سرکش کافروں کی بیخ کنی سے غفلت اور مفسد باغیوں کی گوشمالی سے سہل انگاری بہت بڑا اور بہت قبیح گناہ ہے۔ اس بناء پر خدا کی درگاہ کے اس بندے نے اپنے وطن سے نکل کر ہند و سندھ اور خراسان کا دورہ کیا اور وہاں کے مومنوں اور مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی۔

ظاہر ہے کہ اس پوری تحریر میں پنجاب کا ذکر تک نہیں آیا، اس لئے کہ اہل خراسان کے نزدیک وہ یا تو ہندوستان میں شامل تھا یا سندھ و خراسان میں۔ پھر جب سید صاحب ہند، سندھ اور خراسان میں غیر مسلموں اور باغیوں کی فتنہ انگیزیوں کا ذکر فرما چکے تھے تو یہ بات ذہن میں نہیں آسکتی کہ وہ صرف اس خطے کو فتنوں سے پاک کرنے کیلئے اٹھے تھے جس پر رنجیت سنگھ قابض ہو گیا تھا۔

ہندو راؤ کو تلقین

ہندو راؤ گھورپڑے دولت راؤ سندھیا والئ گوالیار کا برادر نسبتی تھا اور سندھیا کی بیماری

---

(۱) مکاتیب شاہ اسمٰعیل شہید قلمی نسخہ ص: ۴۷، ۴۸۔

کے زمانے میں ریاست کا انتظام اسی کے حوالے ہو گیا تھا۔ یاد ہوگا کہ سید صاحب ہجرت کے سلسلے میں گوالیار پہنچے تھے تو ہندو راؤ نے آپ کا پرجوش استقبال کیا تھا۔ ایک مکتوب میں اسے لکھتے ہیں:

> ''بیگانگان بعید الوطن ملوک زمین و زمن گردیدہ اند و تاجران متاع فروش بہ پایہ سلطنت رسیدہ امارت امرائے کبار و ریاست رؤسائے عالی مقدار برباد کردہ اند و عزت و اعتبار شان بالکل ربودہ۔ چوں اہل ریاست و سیاست درزاویہ خمول نشستہ اند لاچار چندے از اہل فقر و مسکنت کمر ہمت بستہ ایں جماعت ضعفاء محض بنا بر خدمت دین رب العلمین برخاستہ اند۔ ہرگز ہرگز از دنیاداران جاہ طلب نیستند۔ وقتیکہ میدان ہندوستان از بیگانگان و دشمناں خالی گردیدہ و تیر سعی ایشاں بر ہدف مراد رسیدہ آئندہ مناصب ریاست و سیاست بہ طالبین آں مسلم باد۔ (۱)

> **ترجمہ**: وہ غیر جن کا وطن بہت دور ہے بادشاہ بن گئے۔ جو تاجر سامان بیچ رہے تھے انہوں نے سلطنت قائم کر لی۔ بڑے بڑے امیروں کی امارتیں اور رئیسوں کی ریاستیں خاک میں مل گئیں۔ ان کی عزت اور ان کا اعتبار چھن گیا۔ جو لوگ ریاست و سیاست کے مالک تھے، وہ گمنامی کے گوشے میں بیٹھ گئے۔ آخر فقیروں اور مسکینوں میں سے تھوڑے سے آدمیوں نے کمر ہمت باندھی۔ ضعیفوں کا یہ گروہ محض خدا کے دین کی خدمت کیلئے اٹھا ہے۔ وہ لوگ نہ دنیادار ہیں، نہ جاہ طلب۔ جب ہندوستان کا میدان غیروں اور دشمنوں سے خالی ہو جائے گا اور ضعیفوں کی کوشش کا تیر مراد کے نشانے پر جا بیٹھے گا تو آئندہ کے لئے ریاست و سیاست کے عہدے طالبوں کو ہی مبارک رہیں۔

غور فرمایئے کہ دور سے آئے ہوئے غیر کون تھے جو تجارت کرتے کرتے سلطنت کے مالک بن گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ صرف انگریز تھے اور انہیں کے خلاف جنگ کے

---

(۱) مکاتیب شاہ اسمٰعیل شہید قلمی نسخہ ص: ۱۷۰۔

لئے سید صاحب خود اٹھے تھے۔ اسی غرض سے رؤسا، وعوام ہند کو اٹھانا چاہتے تھے۔ بالکل اسی مضمون کا خط غلام حیدر خاں کے نام لکھا جو سید صاحب کا عزیز دوست اور قدیم رفیق کار تھا اور اس وقت گوالیار میں ممتاز فوجی عہدے پر فائز تھا۔ سید صاحب نے اسے تاکید کی تھی کہ یہ مطالب راجا ہندراؤ کے ذہن نشین کر دیے جائیں۔

بدیہی شہادت

آخری قطعی شہادت اس مکتوب میں موجود ہے جو شاہ محمود درانی والیٔ ہرات کے فرزند شہزادہ کامران کے نام بھیجا گیا تھا۔ اس کے آغاز میں وہی مطالب بیان فرمائے ہیں جو شاہ محمود اور دوسرے اکابر کو لکھ چکے تھے۔ مثلاً جہاد ضروری ہے۔ جب ہندوستان اہل کفر وطغیان کے اثرات سے لبریز ہو گیا تو میں نے وطن چھوڑ کر خراسان کا رخ کیا۔ سب کو جہاد کی دعوت دیتا رہا۔ یوسف زئی کے علاقے میں بیٹھا تو آفریدی، خٹک، مہمند، خلیل، اہل ننگرہار، اہل سوات وبنیر، اہل پکھلی، راجہ ہائے کشمیر وغیرہ میرے ساتھ ہو گئے۔ میرا مقصد حکومت نہیں، صرف کلمۂ حق کی سربلندی اور سنت نبوی کا احیاء ہے۔ نیز میں اسلامی علاقوں کو سرکش کافروں کے ہاتھ سے آزاد کرانا چاہتا ہوں۔ جب یہ علاقے مشرکوں اور منافقوں کے تسلط سے پاک ہو جائیں گے تو انہیں مستحقوں کے حوالے کر دوں گا، بشرطیکہ:

> ’’شکر ایں انعام الٰہی بجا آرند و علی الدوام جہاد را بہ ہر حال قائم دارند وگاہے معطل نہ گزارند و در ابواب عدالت و فصل خصومات از قوانین شرع شریف سر موئے تجاوز و تفاوت بہ میان نیارند و از ظلم و فسق بہ کلی اجتناب ورزند۔ (۱)
>
> **ترجمہ**: خدا کے اس انعام کا شکر بجا لائیں۔ ہمیشہ ہر حالت میں جہاد قائم رکھیں۔ کبھی اسے معطل نہ چھوڑیں۔ عدالت اور فیصلۂ مقدمات میں شرع کے قانون سے بال برابر بھی تجاوز نہ کریں۔ ظلم وفسق سے بالکل بچے رہیں۔

آخر میں فرماتے ہیں:

---

(۱) مکاتیب شاہ اسمٰعیل شہید قلمی نسخہ ص: ۳۹، ۴۰۔

بازخود ایں جانب مع مجاہدین صادقین بہ سمت بلاد ہندوستان بنا بر ازالۂ اہل کفر وطغیان متوجہ خواہد گشت کہ مقصد اصلی خود ازاں ست جہاد بر ہندوستان است، نہ توطن در دیار خراسان۔ (۱)

ترجمہ: پھر میں مجاہدین کو لے کر ہندوستان کی طرف متوجہ ہو جاؤں گا تا کہ وہاں سے اہل کفر وطغیان کو ختم کیا جا سکے اور میرا اصل مقصود ہندوستان پر جہاد ہے، یہ نہیں کہ خراسان میں توطن اختیار کر لوں۔ سید صاحب کے جس نصب العین کی توضیح میں نے کی، اس کے متعلق اس سے واضح اور روشن تر شہادت کیا ہو سکتی ہے؟

مومنؔ کی شہادت

ہمارے ہاں کے مشہور شاعر مومنؔ بھی سید صاحب کے مرید تھے۔ ان کے فارسی کلام کے ایک نعتیہ قصیدے میں دو ایک اشعار اس حقیقت کا مزید ثبوت پیش کر رہے ہیں کہ سید صاحب اور ان کے تمام نیاز مندوں کے نزدیک تطہیر ہند کے سلسلے میں مرکزی حیثیت انگریزوں ہی کو حاصل تھی۔ مومنؔ فرماتے ہیں:

ایں عیسویاں بہ لب رسانند جان من و جان آفرینش!
مگزار کہ پائمال گردیم زاں سیم سران آفرینش
تا چند بہ خواب ناز باشی فارغ ز فغان آفرینش
مومنؔ شدہ ہم زبان عرفی از بہر امان آفرینش
”برخیز کہ شور کفر برخاست
اے فتنہ نشان آفرینش“

---

(۱) مکاتیب شاہ اسمٰعیل شہید قلمی ص ۴۰، ۴۱، مکاتیب سید صاحب ص ۲۰۴۔

دوسرا باب:

تنظیم کی بنیاد

امیر خاں کی معیت

میرا خیال ہے کہ سید صاحب اسی زمانے میں جماعت کی تنظیم وتاسیس کے متعلق غور وفکر میں مشغول ہو گئے تھے، جب دہلی میں علم وسلوک کی تحصیل سے فارغ ہو کر وطن پہنچے تھے اور اپنی زندگی خدا کی راہ میں جہاد کیلئے وقف کر دی تھی۔ ابتدا میں یہ سوال ان کے سامنے آیا ہو گا کہ مستقل جماعت کی بنیاد رکھیں یا پہلے سے کسی قائم شدہ جماعت کو تعلیم وتربیت دے کر ان مقاصدِ عظیمہ کیلئے تیار کر دیں، جنہیں وہ ایک سچے مسلمان کی زندگی کے لوازم سمجھتے تھے۔ مستقل جماعت کی تاسیس وقت طلب تھی اور ہندوستان کی فضا اس تیزی سے اسلامی مقاصد کیلئے ناسازگار ہو رہی تھی کہ اصل کام میں تھوڑا سا توقف بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ قائم شدہ جماعت کو احیاءِ اسلامیت اور آزادیٔ وطن کی راہ پر لگا دینے کیلئے نسبتاً کم جدوجہد درکار تھی، لہٰذا انہوں نے نواب امیر خاں کے پاس پہنچنے کا فیصلہ کیا، وہ اس وقت کے ہندوستان میں سب سے بڑی آزاد جنگی قوت کا مالک تھا۔ شجاعت وجوانمردی میں اس کی دھاک دور دور تک بیٹھی ہوئی تھی۔ دین داری اور اسلامی حمیت میں بھی اسے خاص شہرت حاصل تھی اور اس سے سید صاحبؒ کے خاندانی تعلقات بھی تھے۔

سید صاحبؒ اسی ارادے سے نواب کے پاس راجپوتانہ پہنچے اور کم وبیش سات سال اس کے لشکر میں رہے۔ انہوں نے جاتے ہی اہل لشکر کی اصلاح کا سلسلہ جاری کر دیا۔ راویوں کا بیان ہے کہ آپ کی وجہ سے لشکر کی عام حالت میں زبردست تغیر پیدا

ہوگیا۔ فسق و فجور مٹ گیا، کتاب و سنت کی پیروی عام ہوگئی، نواب نے انہیں مشیرانِ خاص میں شامل کرلیا تھا۔ یقین ہے کہ اصل مقاصد کی طرف بھی وہ نواب کی توجہ منعطف کراتے رہتے ہوں گے۔

مستقل جماعت کی بنیاد

جب تک نواب انگریزوں کے اثر سے آزاد رہا، سید صاحبؒ نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ جب انگریزوں سے صلح کی بات چیت شروع ہوگئی تو نواب کے رفیقوں اور مشیروں میں سے سید صاحبؒ اسکے مخالف تھے۔ وہ برابر یہ رائے دیتے رہے کہ انگریزوں سے لڑیں اور خدا کی مدد پر بھروسہ رکھیں۔ افسوس کہ نواب اس رائے پر عمل نہ کرسکا اور معاہدے پر دستخط ہونے سے پیشتر سید صاحبؒ نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ پھر دہلی پہنچ کر مستقل جماعت کی تاسیس کا فیصلہ کیا، جس کیلئے ان کی خداداد صلاحیتیں سات سال میں خاصی نشو ونما پاچکی تھیں۔

اس کام کا آغاز احیائے دین اور تزکیۂ قلوب سے ہوا۔ وقت کے بعض مشہور علماء نے سید صاحبؒ سے بیعت کی۔ مثلاً مولانا محمد یوسف پھلتی، مولانا عبدالحئی بڑھانوی اور شاہ اسمٰعیل۔ اس کی عام صورت وہی تھی جو تصوف کے مختلف خانوادوں میں پہلے سے رائج چلی آتی تھی اور اب تک رائج ہے، لیکن اس میں ایسی غیر معمولی جاذبیت تھی، جس کی کوئی نظیر اس دور میں نہیں ملتی۔ بس اس کے ساتھ ہی ارشاد و ہدایت کا ایک وسیع سلسلہ جاری ہوگیا۔ پھر سید صاحب نے گنگا و جمنا کے دو آبے کا دورہ کیا اور ہزاروں مخلص مسلمان ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے۔ وہ عام پیروں کی طرح ارادت مندوں کو ''توجہ'' بھی دیتے تھے، جس کی کیفیت بیان کرتے ہوئے بعض اصحاب نے لوہاروں کی دھونکنی سے تشبیہ دی۔ بعض نے فرمایا کہ توجہ کے وقت صاف معلوم ہوتا تھا کہ دل سید

صاحب کے قلبِ صافی سے معرفت کے مضامین سن رہا ہے۔(۱)

دورے کے سلسلے میں وہ پھلت پہنچے تو ورزش شروع کر دی۔ بازوؤں اور شانوں پر مالش کراتے تھے اور کچھ وقت تیر اندازی کی مشق میں صرف کرتے تھے۔ حالاں کہ عام پیروں کو اس قسم کے مشاغل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں قبولِ عام کا اندازہ کرتے ہوئے انہوں نے مقاصدِ جہاد کی تبلیغ شروع کر دی تھی۔ یہ جماعت کی تنظیم کا سنگِ بنیاد تھا۔

فنونِ جنگ کی مشق

دوآبے کے دورے سے فارغ ہو کر وطن پہنچے اور سفرِ حج سے پیشتر تقریباً دو سال (۲) انہوں نے رائے بریلی ہی میں گزارے۔ اگرچہ اس اثناء میں مختلف مقامات کے دورے بھی کرتے رہے، اس زمانے میں بیعت بھی لیتے تھے، وعظ بھی فرماتے تھے جو عموماً پابندیٔ کتاب و سنت اور ردِ بدعات پر مشتمل ہوتے تھے۔ مسلمانوں میں صلح بھی کراتے تھے، ان میں اسلامی حرارت بھی پیدا کرتے تھے۔ ان کے ارادت مند عموماً ذکر و فکر اور مراقبوں میں مشغول رہتے تھے۔ یکایک حکم دے دیا کہ اب تمام رفیق زیادہ وقت جنگی فنون کی مشق میں صرف کیا کریں اور فرمایا:

> ان دنوں دوسرا کام اس سے افضل درپیش ہے، اب اس کی طرف ہمارا دل مشغول ہے، یعنی جہاد فی سبیل اللہ۔ اس کے سامنے حال کی کچھ حقیقت نہیں، اس واسطے کہ وہ کام یعنی سلوک اس (جہاد) کے تابع ہے۔ اگر کوئی شخص تمام دن روزے رکھے، تمام رات زہد و ریاضت میں بسر کرے، یہاں تک کہ نوافل پڑھتے پڑھتے پیروں پر ورم آ جائے اور دوسرا شخص جہاد کی نیت سے ایک ساعت دن یا رات کو تفنگ اڑائے تاکہ وہ مقابلۂ کفار میں بندوق لگاتے وقت

---

(۱) "منظورہ" ص: ۱۷۳۔

(۲) کم رمضان ۱۲۳۴ھ — سلخ شوال ۱۲۳۶ھ

آنکھ نہ جھپکے تو وہ عابد اس مجاہد کے مرتبے کو ہرگز نہ پہنچے گا۔

اسی وقت سے سید صاحبؒ کے ارادت مندوں کا زیادہ وقت فنونِ جنگ میں صرف ہونے لگا۔ مثلاً تیر، بندوق، تلوار چلانا، پھری گدکا کھیلنا، ڈنٹر پیلنا وغیرہ۔ خود سید صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پیشتر ارادت مند یا تو گردن ڈالے عالم سکوت میں رہتے تھے یا کمبل اوڑھ کر مسجد کے کونے میں بیٹھ جاتے یا چادر لپیٹ کر حجرے میں گھس جاتے، یا مراقبے کیلئے جنگل میں چلے جاتے۔

تنظیم کی حیثیت

اس سے ظاہر ہے کہ سید صاحب نے اسلامیت کو جماعتی تنظیم کی اصل و اساس بنایا اور تمام ترتیبات اسلامی اصول کے مطابق رکھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اسلامیت کے پیکر بن جائیں اور خدا کی راہ میں جہاد کو اپنا نصب العین بنالیں۔ ان کا مقصد رضائے باری تعالیٰ کے سوا کچھ نہ ہو۔ حکومت و سلطنت، جاہ و جلال اور مال و متاع کی آلائش سے ان کے قلب و روح کا دامن آلودہ نہ ہونے پائے۔

پھر انہوں نے ابتدا ہی سے افرادِ جماعت کو محنت و مشقت اور ہر قسم کے شدائد کی برداشت کا عادی بنایا۔ اس کے بغیر وہ لوگ راہِ جہاد میں قدم رکھنے کے اہل نہ بن سکتے تھے۔ ان کے ارادت مندوں میں وقت کے ممتاز ترین عالم اور بلند پایہ اربابِ ثروت بھی شامل تھے، لیکن تھوڑی ہی مدت میں انہوں نے غذا، لباس اور بود و ماند میں ایسا طریقہ اختیار کرلیا کہ وہ جماعت کے غرباء سے کسی رنگ میں بھی ممتاز نہ رہے۔ سید صاحب سفرِ حج کے سلسلے میں ہگلی پہنچے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے وکیل منشی امین الدین احمد کلکتہ سے استقبال کیلئے آئے ہوئے تھے۔ سید صاحب سے مل چکنے کے بعد انہوں نے شاہ اسمٰعیل سے ملاقات کی۔ شاہ صاحب کا لباس اس درجہ حقیر تھا کہ منشی صاحب کو یقین نہ آیا کہ یہ

شاہ عبدالعزیز محدث کے بھتیجے ہیں۔ جب انہیں بتایا گیا کہ یہی شاہ اسمٰعیل ہیں تو ان کی سادگی اور بے تکلفی دیکھ کر منشی صاحب بے اختیار آبدیدہ ہو گئے۔ میر فیض علی گورکھپوری، میر ذوالفقار علی خاں رئیس اعظم کے فرزند تھے۔ سید صاحب کی معیت میں میر فیض علی کی وضع اس درجہ بدل چکی تھی کہ سید جعفر علی نقوی بغرضِ جہاد امب پہنچے تو میر فیض علی سے گہرے دوستانہ تعلقات کے باوجود انہیں پہچان نہ سکے۔

غور طلب امور

سید صاحب نے یہ طریقے اسی وجہ سے اختیار کیے تھے کہ ان کی تحریک خالص دینی تھی۔ وہ مسلمانوں کو سلطنتیں دلانے کیلئے نہیں، صرف سچے مسلمان بنانے کیلئے اٹھے تھے۔ سلطنتیں اسلامیت کا ایک ضمنی ثمرہ تھیں۔ خوب غور کیا جائے تو عام مصلحتوں کے لحاظ سے بھی کسی داعیٔ جہاد کیلئے ان طریقوں کے سوا چارۂ کار نہ تھا۔ سید صاحب کے پاس نہ مال و دولت کے خزانے تھے، نہ ان کے پاس کوئی چھوٹی یا بڑی سلطنت تھی کہ تنخواہ دار مجاہدین کا خرچ برداشت کر لیتے۔

ان سے پیشتر ہندوستان میں متعدد طالع آزما پیدا ہو چکے تھے، جنہوں نے چھوٹے چھوٹے جیش جمع کر کے لڑائیاں شروع کیں اور آہستہ آہستہ بڑی قوت کے مالک بن گئے، مثلاً نواب امیر خاں۔ سید صاحب بھی ان کا طریقہ اختیار کرتے تو نہ کوئی دینی خدمت انجام دے سکتے، نہ مجاہدین کی ایسی جماعت تیار ہو سکتی جو پیش نظر مقاصد کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کیلئے آمادہ ہوتی۔

بہتر سے بہتر حالات میں ایسی جماعت کے ذریعے سے کوئی ریاست حاصل کرنے کا بندوبست ہو جاتا، لیکن کلمۂ حق کی سربلندی، سنتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا احیاء اور تطہیرِ ہند کے مقاصد کیوں کر پورے ہو سکتے تھے؟ سوال یہ نہیں کہ یہ مقاصد سید صاحب

کی زندگی میں پورے ہوئے یا نہ ہوئے، سوال یہ ہے کہ ان مقاصد کیلئے نتیجہ خیز کام کے انتظام اور اس کے استحکام کی تدبیر کیا تھی؟ وہی تھی، جس کا بندوبست سید صاحب نے کیا۔

انہیں کے زمانے میں قفقاز کے عظیم القدر مجاہد سلطان شامل نے دین ہی پر اپنی تحریک جہاد کی بنیاد رکھی اور سید صاحب کی شہادت سے تقریباً چالیس سال بعد شیخ محمد احمد نے جو "مہدیٔ سوڈان" کے لقب سے مشہور ہیں، دین ہی کی بنا پر وہ تحریک جاری کی جس نے چند سال میں سوڈان کو مصریوں اور انگریزوں کے قبضے سے آزادی دلا دی۔

دعوت و تبلیغ کا انتظام

اس سلسلے میں سید صاحب نے دعوت و تبلیغ کا انتظام اس پیمانے پر کر دیا کہ ان کے سرحد تشریف لیجانے کے بعد بھی ہندوستان کے مختلف حصوں میں تبلیغ برابر جاری رہی۔ انہوں نے یہاں بھی جا بجا داعی مقرر کر دیے تھے، سرحد پہنچ کر بھی مختلف داعی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بھیجے۔ مثلاً مولانا سید محمد علی رام پوری کو حیدر آباد دکن بھیجا۔ پھر حیدر آباد میں مولانا ولایت علی عظیم آبادی کو مقرر کر دیا اور مولانا سید محمد علی کو مدراس جانے کا حکم دے دیا۔ مولانا عنایت علی عظیم آبادی کو بنگال میں داعی مقرر کر دیا۔ مولانا سید اولاد حسن قنوجی، میاں محمد مقیم رام پوری، سید زین العابدین، مولانا کرامت علی جون پوری اور بیسیوں دوسرے اشخاص مختلف علاقوں اور شہروں میں یہ کام انجام دیتے رہے، بلکہ سید صاحب کے ارادت مندوں میں سے ہر شخص یا تو جہاد میں شریک ہو گیا یا اپنے حلقے میں احیائے دین، دعوت جہاد اور فراہمیٔ زر کا کام انجام دینے لگا۔

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان میں ایسی کسی دینی تحریک کا سراغ نہیں ملتا، جس نے دورِ زوال میں مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح اور ان میں حمیت اسلام کے احیاء کے ایسے عظیم الشان کارنامے انجام دیے ہوں، جیسے سید صاحب کی تحریک نے انجام دیے۔

تیسرا باب:

عسکری تنظیمات (۱)

مجاہدین کی جماعتیں

سید صاحب نے مجاہدین کی سرسری جماعت بندی تو غالباً جہاد کیلیے روانگی سے پیشتر ہی کر لی تھی۔ مختلف روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی باقاعدہ جماعت بندی رائے بریلی سے گوالیار پہنچ کر کی۔ تمام مجاہدین کو جن کی تعداد تقریباً ساڑھے پانسو تھی، باقاعدہ پانچ جماعتوں میں تقسیم کیا اور انکے الگ الگ سرعسکر مقرر فرما دیے، نیز حکم دیدیا کہ قیام وسفر میں ہر جماعت اسی تقسیم کے مطابق عمل پیرا رہے۔ اس تقسیم کی کیفیت ذیل میں درج ہے:

(۱) **جماعتِ خاص**: یہ جماعت قیام وسفر میں قلب لشکر سمجھی جاتی تھی۔ اس کے سرعسکر مولانا محمد یوسف پھلتی مقرر ہوئے جو سید صاحب کے داروغۂ خاص تھے۔ خود سید صاحب بھی اسی جماعت کے ہمراہ چلتے اور ٹھہرتے تھے۔ مولانا محمد یوسف کی وفات کے بعد مولوی محمد حسن سرعسکر مقرر ہوئے۔ ان کی شہادت پر یہ عہدہ میاں ضیاء الدین پھلتی کو دے دیا گیا۔

(۲) **مقدمہ الجیش**: یہ جماعت سفر میں سب سے آگے رہتی تھی۔ اس کے سرعسکر شاہ اسمٰعیل مقرر ہوئے۔ لڑائیوں میں مولانا کم تر جماعت کے ساتھ رہتے تھے اور ان کی جگہ سید رستم علی کارگزار مقرر ہو گئے تھے۔

(۳) **میمنہ**: اس جماعت کے سرعسکر امجد خاں رئیس گنتی تھے۔ نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہ صورت جنگ یہ جماعت میمنہ پر لڑنے کیلیے مامور تھی۔ امجد خاں کچھ مدت بعد

بسلسلہ کارِ خاص واپس آ گئے تھے، معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے بعد کون سرعسکر بنے۔

(۴) **میسرہ:** اس جماعت کے سرعسکر سید صاحب کے بھتیجے سید محمد یعقوب تھے۔ انہیں بعض ضروری کاموں کے سلسلے میں ٹونک چھوڑنا پڑا تو شیخ بڈھن ان کی جگہ نیابتاً سرعسکر بن گئے۔ شیخ موصوف اکوڑہ کی جنگ میں شہید ہو گئے۔ سید محمد یعقوب دورانِ جہاد میں سید صاحب کے پاس نہ پہنچ سکے، لہٰذا اس جماعت کی قیادت پر میاں صلاح الدین پھلتی مامور ہوئے۔ پھر یہ منصب مولانا احمد اللہ ناگپوری کو مل گیا۔ جنگ بالاکوٹ تک وہی سرعسکر تھے۔

(۵) **ساقۃ الجیش:** یہ جماعت چھکڑوں اور گاڑیوں کے ہمراہ چلتی تھی۔ سب سے پہلے روانہ ہوتی اور عموماً سب کے بعد منزل پر پہنچتی۔ اس کے سرعسکر اللہ بخش خاں مورانوی تھے، جنہیں سید صاحب نے جنگ اکوڑہ میں مجاہدین کا سالار بنایا تھا اور وہ اسی جنگ میں شہید ہوئے۔ ان کے بعد پیر خاں، شیخ حسن علی، محمد خاں خیر آبادی، ابراہیم خاں خیر آبادی یکے بعد دیگرے اس جماعت کے سرعسکر رہے۔

باقی جماعتیں

ابتدائی تقسیم یہی تھی۔ پھر جماعتوں یا جیشوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جیشوں کی تعداد نو تک پہنچ گئی تھی، ان میں سے تین جماعتیں قندھاریوں کی تھیں اور ایک مرزا احمد بیگ پنجابی کی۔ قندھاری جماعت کے سرعسکر عام ملا لعل محمد تھے۔ پھر یہ تین حصوں میں تقسیم ہو گئی، ایک کے امیر ملا لعل محمد تھے، دوسری کے ملا قطب الدین ننگرہاری اور تیسری کے جعفر خاں قندھاری۔

مرزا احمد بیگ کی جماعت کا قصہ یوں ہے کہ قیامِ خمر کے زمانے میں سید صاحب نے بعض رفیقوں کے مشورے سے تنخواہ دار فوج بھی بھرتی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اخوند

ظہور اللہ نے دو سو آدمی پانچ روپے فی کس کے حساب سے بھرتی کر لیے۔ دو مہینے بعد قرار پایا کہ ابھی تنخواہ دار فوج رکھنے کا وقت نہیں آیا۔ چنانچہ سید صاحب نے اس فوج کے تمام آدمیوں کو مقررہ تنخواہ دے دی، پھر ان کے سامنے فضائل جہاد پر وعظ فرمایا۔ ان میں سے چالیس آدمیوں نے ہندوستانی مجاہدوں کی طرح فی سبیل اللہ جہاد کا فیصلہ کر لیا اور ان کی الگ جماعت بنا دی گئی۔ اس کے عسکر مرزا احمد بیگ پنجابی تھے۔ یہ مختلف مجاہدات میں شریک رہے اور بالاکوٹ میں شہادت پائی۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، ابتدائی سر عسکر شہید یا فوت ہوتے رہے تو انکی جگہ دوسرے سر عسکر مقرر ہو گئے۔ بعض خاص مہمات کیلئے سید صاحب خود سر عسکر مقرر فرما دیتے تھے۔ مثلاً اٹک پر حملے کیلئے مجاہدین کو بھیجا گیا تو ارباب بہرام خاں تہکالی کو سالار اعظم بنایا گیا۔ اکثر معرکوں میں مولانا شاہ اسمٰعیل امیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ امب اور چھتر بائی کے قلعوں کی حفاظت کیلئے علی الترتیب شیخ بلند بخت اور مولانا مصطفیٰ کاندھلوی کو امیر مقرر کیا گیا۔ تسخیر امب کے بعد ضلع ہزارہ میں پیش قدمی کا فیصلہ ہوا تو سید احمد علی کو مجاہدین کا قائد عام بنا دیا گیا۔ وہ جنگ پھولڑہ میں شہید ہوئے۔ اس قسم کی اور بھی مثالیں ملتی ہیں۔ مولانا محمد یوسف کی وفات پر توشہ خانہ کا انتظام شیخ ولی محمد کے حوالے کیا گیا جو مولانا مرحوم کی زندگی میں ان کے معاون و پیش کار تھے۔

بھیلے یا دستے

ہر جماعت متعدد بھیلوں یا دستوں میں منقسم تھی۔ ایک بھیلے میں کم سے کم بیس، زیادہ سے زیادہ پچیس آدمی ہوتے تھے۔ مقررہ دستور کے مطابق پورے بھیلے کا کھانا ایک جگہ پکتا تھا۔ جتنی نفری ہوتی رسد خانے سے ہر بھیلے کو رسد مل جاتی تھی۔ لکڑیاں اور پانی بھیلے کے مختلف آدمی باری باری لایا کرتے تھے۔ جنس سب کو مساوی مقدار میں ملتی تھی۔

چھوٹے یا بڑے، سر عسکر یا سپاہی میں کوئی فرق نہ تھا۔ حتیٰ کہ خود سید صاحب بھی اس مساوات سے مستثنیٰ نہ تھے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانے کیلئے دن مقرر ہو جاتا تھا۔ سید صاحب بھی اپنی جماعت کے ساتھ جاتے اور لکڑیاں کاٹتے۔ کھانے میں انہیں بھی کوئی امتیاز حاصل نہ تھا اور نہ انہوں نے کبھی اسے پسند فرمایا، البتہ مہمان آجاتے تو ان کیلئے نسبتاً اچھا کھانا پکتا اور سید صاحب آداب میزبانی کی پابندی میں انکے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔ بعض اوقات عین کھانے کے وقت مہمان آجاتے تو ہر بھیلے سے تھوڑا تھوڑا کھانا منگوا کر گزارہ کرلیا جاتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ سید صاحب خود دستر خوان پر نہ بیٹھتے اور مہمانوں کو کھلانے کے بعد کسی بھیلے میں بیٹھ کر تھوڑا سا کھا لیتے۔

رسالدار

سید صاحب کی فوج میں چھوٹا سا رسالہ بھی تھا۔ اس کیلئے ابتدا میں کوئی رسالدار مقرر نہ کیا گیا۔ جنگ زیدہ کے بعد سید صاحب نے فرمایا کہ کسی کو رسالدار مقرر کردینا چاہیے۔ سید احمد علی بریلوی نے حمزہ علی خاں لوہاری والے کا نام پیش کیا۔ شاہ اسمٰعیل نے عبدالحمید خاں کو اس عہدے کیلئے موزوں قرار دیا۔ ارباب بہرام خاں نے شاہ صاحب کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ عبدالحمید خاں واقعی فن سپہ گری میں بڑے ہوشیار، تجربہ کار اور بہادر ہیں۔ سید صاحب نے انہیں کے حق میں فیصلہ کیا۔ پھر اپنا عمامہ دست مبارک سے عبدالحمید خاں کے سر پر باندھا، نیز انہیں ایک رومال، سنہری قبضے کی ایک سروہی، ایک تلوار اور ایک گھوڑا عنایت فرمایا۔ برہنہ سر ہو کر ان کیلئے دعاء کی۔ اس کے بعد عبدالحمید خاں لشکر میں رسالدار کے لقب سے مشہور ہوگئے۔ جنگ مایار میں بڑی جوانمردی سے لڑے، مہلک زخم کھائے اور چند روز بعد جاں بحق ہو گئے۔ ان کے بعد حمزہ علی خاں کو رسالدار بنایا گیا۔

رسد کا انتظام

سرحد پہنچنے کے بعد ابتدائی دور میں مجاہدین کو اکثر و بیشتر رسد کی تکلیف رہی۔ بعض اوقات سفر میں کھانا پکانے کا موقع نہ ملتا تھا۔ بعض اوقات ضرورت کے مطابق جنس ہی ہاتھ نہ آتی تھی۔ مثلاً جنگِ شیدو سے پیشتر مجاہدین کو سامانِ معیشت حاصل کرنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ سید صاحب جو روپیہ ساتھ لے گئے تھے، وہ ختم ہو چکا تھا اور انتظام کے مطابق جن رقموں کا انتظار تھا، وہ پہنچی نہ تھیں۔ یا یہ سمجھ لیجئے کہ جو رقمیں ہنڈیوں کی شکل میں آئی تھیں ان کا روپیہ ساہوکاروں سے نہ ملتا تھا اور کسی پر بوجھ ڈالنا یا سوال کرنا سید صاحب کی عادت شریف اور شانِ تربیت کے خلاف تھا۔

اس زمانے میں اکثر فاقے کرنے پڑتے یا مجاہدین ساگ پات کھا کر گزارہ کر لیتے۔ جنگ شیدو کے بعد چنگلئی میں بھی حالتِ عسرت قائم رہی۔ کبھی کبھی روزانہ مٹھی بھر جوار ملنے لگتی۔ تندرست غازی پیس کر روٹی پکا لیتے، بیماروں کیلئے پانی میں ابال کر آش سی بنا دیتے۔ جب جوار بھی نہ ملتی تو باہر نکل جاتے اور جنگل میں جڑی بوٹیاں تلاش کرتے یا ان درختوں کے پتے توڑ لاتے جو کھانے میں بدمزہ نہ ہوتے اور پانی میں جوش دینے سے گل جاتے۔ انہیں میں نمک ڈال کر کھا لیتے۔

جب روپیہ آنے لگا تو جہاں سے رسد مل سکتی، مقررہ آدمی سرکاری اونٹ لے جا کر خرید لاتے اور مجاہدین میں بہ حصہ مساوی تقسیم ہو جاتی۔ سرحد میں عشر کی باقاعدہ تحصیل کا انتظام ہو گیا تو ضرورت کے مطابق غلہ فراہم ہونے لگا۔ موضع مینئی میں پانچ پن چکیاں سید صاحب نے اپنے انتظام میں لے لیں اور سید حامد علی جھنجھانوی کو پچیس تیس مجاہدین کا سردار بنا کر مینئی میں بٹھا دیا گیا۔ وہاں کے خان نے تین متصل مکان خالی کرا دیے، ایک میں غلہ جمع رہتا، دوسرے میں آٹا اور تیسرے میں مجاہدین مقیم تھے۔ پنجتار سے غلہ اونٹوں

اور خچروں پر لاد کر ملئی بھیجا جاتا، وہاں سے آٹا پس کر آجاتا۔ گندم اور مکئی کی مقررہ پسوائی پن چکیوں کے مالکوں کو ادا کی جاتی۔ گندم فی من ایک سیر دس چھٹانک، مکئی فی من اڑھائی سیر۔

اس کے بعد بھی مختلف اوقات میں مجاہدین کو تکلیفیں پیش آتی رہیں۔ جب تک عشر کا انتظام نہ ہوا تھا، مجاہدین یا تو اپنے ہاتھ سے غلہ پیستے یا اجرت دے کر پسوا لیتے۔ آٹے کے ساتھ مجاہدین کو فی کس مٹھی بھر دال دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی گوشت بھی تقسیم ہوتا تھا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کے پاس اعانتی رقمیں مسلسل پہنچنے لگیں تو کسی قدر گھی بھی مجاہدین کیلئے خرید لیا جاتا تھا۔

رسد کی تقسیم

تقسیم رسد کا پیمانہ ایک تام لوٹ تھا جس میں تین پاؤ غلہ یا آٹا سماتا۔ یہ رائے بریلی سے سید صاحب نے اپنے ساتھ لے لیا تھا، یعنی پوری رسد ابتدا میں تین پاؤ یومیہ تھی۔ اگر جنس کم ہوتی تو اسی تناسب سے فی کس مقدار بھی کم کر دی جاتی۔ جب عشر کا غلہ باقاعدہ وصول ہونے لگا تو رسد تین پاؤ کے بجائے ایک سیر فی کس کر دی گئی۔ جتنے مہمان آجاتے، سید صاحب کے آدمی ان کیلئے بھی فی کس رسد اسی حساب سے لے لیتے۔

رسد لانے اور تقسیم کرنے کا انتظام مختلف اصحاب کے ہاتھ میں رہا۔ ابتدا میں مولانا محمد یوسف پھلتی اس خدمت پر مامور تھے۔ نواب وزیر الدولہ نے لکھا ہے کہ ہر جنس ہر شخص کو بالکل مساوی مقدار میں دیتے اور سید صاحب کو بھی رتی بھر زیادہ نہ دیتے۔ بعض اوقات سید صاحب مزاحاً فرماتے کہ مجھے زیادہ کیوں نہ دی، تو عرض کرتے کہ ہر چیز خدمت والا میں پیش کرنے کیلئے حاضر ہوں، لیکن مجھے تقسیم کا حکم دے رکھا ہے اور اس سلسلے میں مساوات کی پابندی پر مجبور ہوں۔ (۱)

---

(۱) وصایا حصہ دوم ص: ۱۹۲۔

میر امانت علی (ساڈھورہ میران، پٹیالہ) کے ذمے بھی یہ کام رہا۔ وہ اتنے محتاط تھے کہ جب کوئی مجاہد آ کر کہتا میرے یہاں آج ایک یا دو مہمان ہیں تو سید صاحب سے اجازت لینے چلے جاتے۔ بلا اجازت زاید رسد نہ دیتے۔ اس طرح تقسیم میں دیر لگتی اور شکایتیں ہو جاتیں۔

پھر شیخ عبدالوہاب لکھنوی تقسیم رسد پر مامور ہوئے۔ وہ کمزور نحیف آدمی تھے۔ مختلف عوارض میں مبتلا ہونے کے باوجود قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ تقسیم رسد کے ساتھ ساتھ قرآن بھی پڑھتے جاتے۔ ہر شخص کو ترتیب آمد کے لحاظ سے جنس دیتے۔ چھوٹے یا بڑے کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ حکیم قمر الدین پھلتی اور مولوی نور احمد نگرامی مورخ اسلام مولوی عبدالوہاب کے معاون تھے۔ کام بڑھ جاتا تو منشی محمد قاسم پانی پتی کے والد ماجد میاں غلام محمد کو بھی امداد کیلئے بلا لیا جاتا۔

لباس

ہر مجاہد کو سال بھر کیلئے کھادی کے تین جوڑے کپڑے اور دو جوڑے جوتے ضرور دیے جاتے تھے۔ کسی کے کپڑے جلد پھٹ جاتے یا گم ہو جاتے تو اسے نئے کپڑے دے دیے جاتے۔ سردیوں کیلئے ہر ایک کو ایک ایک دگلہ یا میرزئی اور ایک ایک دوہر ملتی تھی۔ ہر جمعرات کو کپڑے دھونے کیلئے سراسم صابون کی دو دو ٹکیاں دی جاتیں۔ بیماروں کیلئے دوا کا انتظام بھی بیت المال سے ہوتا تھا۔

سید صاحب نے مجاہدین میں ایسی دینی روح پیدا کر دی تھی کہ وہ زندگی کے ہر کام کو عبادت سمجھ کر انجام دیتے تھے۔ ان میں محبت و اخوت کے مستحکم رشتے موجود تھے، جو ایک خاندان کے مختلف افراد میں بھی شاذ ہی ملیں گے۔ اس لئے عموماً ایسا ہوتا کہ جو مجاہد اپنے کپڑے دھونے کیلئے پہلے اٹھتا، وہ اپنے دو تین ساتھیوں کے کپڑے بھی لے جاتا۔ خود

سید صاحب ترغیب کی غرض سے اپنی زندگی کے مختلف واقعات بیان فرماتے رہتے۔ مثلاً کہتے کہ ہم نواب امیر خاں کے لشکر میں تھے تو کپڑے دھونے کے وقت اپنے پانچ سات ساتھیوں کے میلے کپڑوں کا بھی گٹھا باندھ کر لیجاتے۔ ساتھی ہر چند نہیں نہیں کرتے، ہم ایک نہ سنتے۔

ایک روشن حقیقت

یہاں یہ حقیقت بھی واضح کر دینی چاہیے کہ ہندوستانی مجاہدین نہ کوئی تنخواہ لیتے تھے اور نہ کوئی معاوضہ، اس لئے ان کے لباس اور کھانے کا انتظام بیت المال سے کیا جاتا تھا۔ جنگ زیدہ میں جو مالِ غنیمت ملا، اس کا اندازہ پچیس ہزار روپے کیا گیا تھا۔ سید صاحب نے پانچ ہزار بیت المال میں رکھا اور باقی تقسیم کر دینے کا حکم دے دیا۔ جو مجاہدین نے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ ہم تو بیت المال سے کھاتے ہیں، وہیں سے کپڑا لیتے ہیں، وہیں سے دوسری ضرورتیں پوری کرتے ہیں، ہم حصہ لے کر کیا کریں گے۔ سید صاحب نے فرمایا: جو بھائی بخوشی اپنا حصہ بیت المال کو دیں گے، اس کا ثواب جدا پائیں گے۔ اکثر نے اپنے پورے حصے لوٹا دیے۔ بعض نے صرف وہ چیزیں رکھ لیں جن کی انہیں فوری ضرورت تھی۔ بعض مجاہدین کے گھروں میں تھوڑی رقمیں بھجوائی جاتی تھیں، جن کے متعلقین کیلئے گزارے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ بعض امراء کے نام سید صاحب کے خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ انہیں بےنوا مجاہدین کے اقرباء کی پرورش پر توجہ دلائی گئی۔

چوتھا باب:

عسکری تنظیمات (۲)

زخمیوں کا علاج

لشکرِ اسلام میں جراحی کا صیغہ بھی ابتدا ہی سے قائم تھا اور اس میں وقت کے ماہر جراح کام کرتے تھے۔ مثلاً کریم بخش، رحیم بخش اور ان کے بھائی نور بخش شاملی والے اور عبدالرحیم جن کا وطن معلوم نہیں۔ ان کے نام بعض واقعات کے سلسلے میں آ گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس محکمے میں کارکنوں کی تعداد خاصی بڑی ہو گی۔ یہ لوگ باقاعدہ زخم دھوتے تھے، گولیاں نکالتے تھے۔ جہاں زخموں کو سینے کی ضرورت ہوتی تھی، سیتے تھے اور ان پر مرہم لگا کر پٹیاں باندھ دیتے تھے۔ عام مجاہدین کی طرح یہ لوگ بھی خدمتِ دین کی غرض سے سید صاحب کے ساتھ ہوئے تھے۔

ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ان میں سے بعض جراح عام مجاہدوں کے دوش بدوش لڑتے لڑتے میدانِ جنگ میں شہید ہوئے۔ مثلاً رحیم بخش جراح جنگ پھولڑہ میں اور نور بخش جراح جنگ بالاکوٹ میں۔ کریم بخش جراح نے اہلِ سمہ کی قاتلانہ سازش کے دوران میں بہ مقام سدم شہادت پائی۔ حاجی جانی امیٹھوی بھی لشکرِ اسلام کے بڑے ماہر جراح تھے۔ جان محمد جراح رام پوری اور عبدالرحیم جراح جانسٹھی کے نام بھی مذکور ہیں، جنہوں نے جنگ بالاکوٹ کے بعد اگرائی میں زخمیوں کی مرہم پٹی کی تھی۔

مجاہدین کو پہلی جنگ اکوڑہ میں پیش آئی تھی۔ اس کے حالات میں واضح طور پر مرقوم ہے کہ زخمیوں کو لشکر گاہ میں پہنچا دیا گیا، جن کی مرہم پٹی کا فوری انتظام ضروری تھا۔ زخمیوں

کے رفیقوں میں سے بعض لوگ ان کی تیمارداری کیلئے مقرر ہو جاتے تھے۔ جنگ مایار کے زخمیوں کی تعداد زیادہ تھی، اس لئے زخم سینے اور دوا پکانے اور لگانے میں پوری رات صرف ہوگئی۔ بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ جراحوں کی ضرورت کی چیزیں بھی ہندوستان سے بھیجی جاتی تھیں۔

سامانِ جنگ

سید صاحب نے ہر قسم کا جنگی سامان بھی خریدا اور بہت سے لوگوں نے ہدیۃً بھی ان کی خدمت میں نہایت قیمتی اسلحے پیش کیے۔ مثلاً چھریاں، تلواریں، خنجر، پستول، بندوقیں وغیرہ۔ جو مجاہدین وقتاً فوقتاً قافلوں کی شکل میں ہندوستان سے سرحد پہنچتے رہے، وہ بھی نقد روپیہ اور مختلف ہتھیار ساتھ لے جاتے تھے۔ میاں محمد مقیم رام پوری کے قافلے کی نسبت واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ تمام ساتھی ضروری سامانِ جنگ سے لیس تھے۔

سید صاحب کے توشہ خانے میں ہتھیار جمع رہتے تھے۔ جب ضرورت پڑتی دیدیے جاتے۔ بعض ہتھیار عہدہ داروں کو بطور اعزاز دیے جاتے، مثلاً عبدالحمید خاں کو رسالداری کا عہدہ دیا گیا تو انہیں گھوڑے کے علاوہ ایک سروہی اور ایک تلوار عنایت ہوئی تھی۔

لشکر مجاہدین میں عموماً توڑے دار بندوقیں استعمال ہوتی تھیں، جو ہندوستان میں عام تھیں۔ بعض کے پاس چقماقی بندوقیں تھیں۔ ان کیلئے چقماق کے پتھر سید صاحب منگواتے رہتے تھے۔ ازواج کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ سنہا سے چقماق جتنے بھی مل سکیں خرید لیں اور کم از کم ایک ہزار تو ضرور خرید کر بھجوا دیں۔

قرابینیں بھی استعمال ہوتی تھیں اور مختلف جنگوں کے سلسلے میں ان کا بھی ذکر آیا ہے۔ آخر میں کچھ زنبورکیں بھی ہاتھ آگئی تھیں، جنہیں چھوٹی توپیں سمجھنا چاہیے۔ سید عبدالجبار شاہ صاحب ستھانوی نے مجھے بتایا کہ مجاہدین چمڑے کی دو انگل چوڑی پیٹیوں

سے نہایت عمدہ توپ تیار کر لیتے تھے۔ یہ ہلکی ہوتی تھی، جسے ایک جگہ سے اٹھا کر بہ سہولت دوسری جگہ لے جاتے تھے۔ اس کی تفصیل یوں بتائی کہ کچا چمڑا مسالے اور سریش میں تر کرلیا جاتا۔ پھر اس چمڑے کی پٹیاں بنائی جاتیں اور سیدھی لکڑی پر یہ پٹیاں گوندھنے کے انداز میں پے بہ پے لپیٹ دی جاتیں۔ نل چار انچ موٹا ہو جاتا تو لکڑی نکال کر اندر باہر خاص مسالا لگا دیا جاتا۔ مجھے ایسی کوئی توپ دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ شاہین نام کے آلے کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ یہ ایسا آلہ تھا جو بندوق سے بڑا اور توپ سے چھوٹا ہوتا تھا۔ مجاہدین نے مختلف جنگوں میں اس سے بھی کام لیا۔

سید صاحب کو بڑی توپیں زیدہ اور مایار کی جنگوں میں ملیں۔ زیدہ کی توپیں امب کی طرف جاتے وقت محفوظ مقام پر دفن کرادی تھیں۔ گڑھی چھتر بائی کے محاصرے میں ان کی ضرورت پڑی تو امب میں منگوالیں۔ پھر پنجتار میں رہیں اور ہجرت ثانیہ کے وقت انہیں دوبارہ دفن کرادیا۔

بارود، گولے نل اور گنڈاسے

بارود سازی کا کارخانہ پنجتار میں بنایا گیا تھا۔ اغلب ہے بعض دوسرے مقامات پر بھی عارضی انتظام کرلیا جاتا ہو، لیکن مستقل کارخانہ پنجتار ہی میں رہا۔ مولوی سید جعفر علی نقوی رمضان ۱۲۴۵ھ (فروری ۱۸۳۰ء) میں ہندوستان سے پنجتار پہنچے تھے۔ اس وقت سید صاحب امب میں تھے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں: سرکاری بارود ساز اپنے کام یعنی بارود سازی میں مشغول تھے۔(۱) انہیں دنوں بارود کو آگ لگ گئی۔ دو آدمی شہید ہوئے اور بارود کا میگزین بھی جل گیا۔

سید صاحب کے پاس توپیں آگئیں تو قاسم خیل میں جو پنجتار کے شمال میں واقع

---

(۱) ''منظورہ'' ص۔ ۲۲۳۔

ہے، مولانا احمد اللہ ناگپوری اور مولوی خیر الدین شیر کوٹی نے گولے ڈھالنے کا کارخانہ قائم کر لیا، جس میں ڈیڑھ سیر، تین سیر اور پانچ سیر کے گولے ڈھلتے تھے۔

مجاہدین کی جو جماعتیں پہلی مرتبہ ہزارہ بھیجی گئی تھیں، انہیں دوسرے سامانِ جنگ کے علاوہ بانس کے پانچ سات سونٹے بھی دیدیے گئے تھے۔ یہ ڈیڑھ ڈیڑھ بالشت لمبے تھے اور ان میں بارود بھری ہوئی تھی۔ حملے کے وقت انہیں آگ دے کر دشمن پر پھینکا جاتا۔ چنانچہ ڈمگلہ کی جنگ میں یہ نل استعمال ہوئے۔ سینگوں اور بھینسوں کی آنتوں میں بھی بارود بھر کر استعمال کرتے تھے۔

اسلامی لشکر کا ایک خاص ہتھیار دندانہ دار گنڈاسا تھا، جسے عام لوہار جلد سے جلد کثیر تعداد میں تیار کر لیتے تھے۔ گنڈاسے کو لمبا دستہ لگایا جاتا۔ یہ ان مجاہدین کو دیا جاتا جن کے پاس اور کوئی ہتھیار نہ ہوتا یا جو بندوق اور تلوار سے کام نہ لے سکتے۔ مثلاً شیخ محمد اسحٰق گورکھپوری کا بایاں ہاتھ جنگِ مایار میں بے طرح زخمی ہو چکا تھا اور وہ بندوق نہ چلا سکتے تھے۔ لہٰذا بالاکوٹ میں انہیں گنڈاسا دے دیا گیا۔

فنونِ جنگ کی مشق

مجاہدین سے قواعد اور چاند ماری بھی کرائی جاتی تھی۔ مثلاً قیامِ خہر کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ میر عبد الرحمٰن جھالوی، حافظ امام الدین رام پوری اور بعض دوسرے حضرات مجاہدین سے نشانے کی مشق کرایا کرتے تھے، جنکے پاس توڑے دار بندوقیں تھیں۔ حاجی عبداللہ رام پوری، مولوی امام علی عظیم آبادی، شیخ خدابخش علی غازی پوری، شیخ بلند بخت دیوبندی، شیخ نصر اللہ خورجوی اور اکبر خاں نے چقماقی بندوقوں اور قرابین والوں کی ترتیب کا کام سنبھال لیا۔ اڑھائی مہینے کے بعد سید صاحب نے مجاہدین کی پریڈ دیکھی تو بہت خوش ہوئے اور تحسین فرمائی۔ ساتھ ہی کہا: مشاقی پر نازاں نہ ہونا، فتح صرف خدا کے

فضل پر موقوف ہے۔ قواعد کرانے والے اصحاب روزانہ رات کے وقت سید صاحب کی خدمت میں عرض کیا کرتے تھے کہ آج اس طور سے قواعد کرائی۔ سید صاحب بعض اوقات نہایت عمدہ نکتے بیان فرمایا کرتے تھے۔

مثلاً اس زمانے میں ایک دستور یہ تھا کہ سپاہی چھرّے تھیلی سے نکال کر منہ میں بھر لیتے اور ضرورت کے مطابق تھوڑے تھوڑے بندوق میں ڈالتے جاتے۔ سید صاحب نے فرمایا: اس میں بڑی مضرتیں ہیں۔ مثلاً بندوق گرم ہو جائے تو بارود بھرتے وقت آگ پکڑ سکتی ہے۔ ایسی صورت میں چھرّے منہ سے نالی میں ڈالنا خالی از خطرہ نہیں۔ ایک مضرت یہ ہے کہ چھرّے منہ میں ہوں تو میدانِ جنگ میں تکبیر نہیں کہی جا سکتی۔

پنجتار کے سامنے میدان میں مجاہدین برابر مختلف فنونِ جنگ کی مشق کرتے رہتے تھے اور یہاں گھڑ دوڑ بھی ہوتی تھی۔ نواب وزیرالدولہ نے فنونِ حرب کی مشق کے سلسلے میں مندرجہ ذیل امور کا ذکر کیا: گھڑ دوڑ اور خنجر چلانا، نیزہ بازی، توپ اور بندوق چلانا، جنگ کے قواعد سیکھنا، قلعے فتح کرنا، دشمن کو مارنا، اس غرض سے ہر قسم کے ہتھیار جمع کر رکھے تھے۔(۱)

نواب صاحب فرماتے ہیں کہ مجاہدین:

ہمہ مبارز و جوشن شگاف و پیکاں دوز ہمہ کماں کش و رزم آزما و دشمن سوز
چو باد حملہ برد ہمچو کوہ حملہ پذیر چو رعد بانگ زن و ہمچو برق تیغ افروز (۲)

یعنی سب بڑے بہادر تھے۔ مخالفوں کی زرہیں چیر کر رکھ دیتے تھے اور پیکان توڑ ڈالتے تھے۔ سب کمان چلانے میں مشاق تھے۔ جنگ کے دھنی اور دشمنوں کو ختم کر دینے والے۔ وہ حملہ کرنے میں ہوا کی مانند تیز تھے۔ جب ان پر حملہ ہوتا تھا تو پہاڑ کی طرح جم

---

(۱) "وصایا" حصہ دوم ص: ۵۹۔ (۲) "وصایا" حصہ دوم ص: ۵۹۔

جاتے تھے۔ وہ رعد کی مثل نعرے لگاتے تھے اور ان کی تلواریں بجلی بن کر چمکتی تھیں۔

اکھاڑے

ایک موقع پر پنجتار میں مختلف فنون کیلئے الگ الگ اکھاڑے قائم کیے گئے مثلاً:

۱۔ نیزہ بازی کا اکھاڑا سید صاحب کے زیر اہتمام۔

۲۔ سواری، نیزہ بازی، بندوق اور تلوار کا اکھاڑا عبدالحمید خاں رسالدار کے زیر اہتمام۔

۳۔ بھری گدکا اور رستم خانی کا اکھاڑا شیخ عبدالوہاب اور خدا بخش منجھانوی کے زیر اہتمام۔

۴۔ امردھج کا اکھاڑا میرزا احمدی بیگ شاہ جہان آبادی کے زیر اہتمام۔

۵۔ غفور خانی کا اکھاڑا سید لطف علی اور امام الدین رام پوری کے زیر اہتمام۔

۶۔ پلٹی کا اکھاڑا استاد رجب خاں کے زیر اہتمام۔

یہ اکھاڑے روزانہ عصر سے مغرب تک گرم رہتے تھے۔ سید صاحب خود اس موقع پر موجود رہتے اور ہر اکھاڑے کی مشق کا معائنہ فرماتے۔

لشکر کے نشان

لشکر کے بڑے نشان یا پرچم تین تھے:

۱۔ صبغۃ اللہ: یہ جماعتِ خاص کا نشان تھا اور ابوالحسن نصیر آبادی کے پاس رہتا تھا جو جماعت کے خاص علمدار تھے۔ اس پر پہلے پارے کا آخری رکوع سرخ ریشم سے کاڑھا گیا تھا۔ یہ نشان صرف اس لڑائی میں جاتا تھا جس میں سید صاحب خود شریک ہوتے۔

۲۔ مطیع اللہ: اس پر سورۂ بقرہ کا آخری رکوع سرخ ریشم سے کاڑھا گیا تھا۔ یہ ابراہیم خاں خیر آبادی کے پاس رہتا تھا۔

۳۔ **فتح اللہ:** اس پر سورہ صف کی کچھ آیتیں کڑھی ہوئی تھیں مثلاً: اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ..... الخ یہ نشان پہلے محمد عرب کے پاس رہتا تھا، پھر اسے فرج اللہ شیدی کے حوالے کر دیا گیا۔

ان کے علاوہ بھی مختلف جماعتوں کے چھوٹے نشان ہوں گے۔ خاص نشان یہی تین تھے۔

متفرق امور

مجاہدین کو قلعوں پر بھی حملے کرنے کی نوبت آئی اور ان لشکروں پر بھی شبخون مارنے پڑے، جنہوں نے حفاظت کی غرض سے اردگرد مضبوط خار بندی کا انتظام کر لیا تھا۔ لہٰذا ایسے موقعوں کیلئے سیڑھیاں بھی بنوائی گئی تھیں اور خار بندی سے گذرنے کیلئے چار پائیاں بھی استعمال کر لیتے تھے۔ مثلاً ڈمگلہ کے شبخون میں آخری تدبیر ہی سے کام لیا گیا تھا۔ جب خادے خاں پر حملے کا فیصلہ ہوا تو معلوم تھا کہ ہنڈ کا قلعہ بہت مضبوط ہے، لہٰذا چیڑ کی لکڑی کے قلابے اور سیڑھیاں بنوائی گئیں۔ چھتر بائی کے محاصرے کے وقت بھی مجاہدین کے پاس سیڑھیاں موجود تھیں۔ میدانِ جنگ میں مختلف اصحاب مجاہدین کو پانی پلانے پر مامور ہو جاتے تھے، انہیں ''سقا'' کا لقب دے دیا جاتا۔ چنانچہ مایار کی جنگ میں سب سے پہلے وہی صاحب شہید ہوئے جو ندی سے مشکیزے بھر بھر کر مجاہدین کو پانی پلا رہے تھے۔ شہدائے بالاکوٹ میں روشن سقا ساکن کوٹلی کا بھی ذکر آیا ہے۔

لڑائی یا شبخون کیلئے لمبا سفر درپیش ہوتا تو مجاہدین کو روغنی روٹیاں تیار کر لینے کا حکم دے دیا جاتا۔ چنانچہ اتمان زئی پر پیش قدمی کے سلسلے میں ہر مجاہد کو ایک ایک سیر آٹا، ایک ایک پاؤ گھی اور ایک ایک پاؤ گڑ دے دیا گیا۔ جس راستے میں پانی کمیاب ہوتا وہاں جا بجا پہلے سے پانی کا انتظام کر لیا جاتا۔ جلالہ سے اتمان زئی جانے لگے تو مجاہدین کیلئے پانی کی

بطلوں کا بندوبست کر دیا گیا۔ ایک دستور یہ تھا کہ فوجی اقدامات کو عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کا انتہائی اہتمام کیا جاتا۔ مثلاً شاہ اسمٰعیل ہنڈ پر حملے کیلئے موضع بازار (سدم) سے روانہ ہوئے تھے۔ وہ پہلے گڑھی مان زئی ہوتے ہوئے ترکئی پہنچے۔ وہاں سے نکلے تو پہلے پنجتار کا رخ کیا تاکہ کسی کو خیال نہ ہو، پنجتار کے سوا کہیں جانا منظور ہے۔ دو کوس پر نماز عشاء ادا کی وہاں سے ہنڈ کا رخ کیا۔

شجاعت اور حسن تدبیر

شاہ اسمٰعیل نے ایک موقع پر فرمایا کہ دشمن سے رزم و پیکار کیلئے انسانوں کی قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض صاحب تدبیر ہوتے ہیں بعض شجاع ودلاور، بعض دونوں خصوصیتوں کے جامع ہوتے ہیں یعنی مدبر بھی اور شجاع بھی۔ محض باتدبیر لوگ ہمیں اس مقام پر کام نہیں دے سکتے، اس لئے کہ یہ مقام شجاعت کا ہے نہ کہ تدبیر کا۔

شاہ صاحب کا مقصد یہ تھا کہ ساز وسامان اور رفیقوں کی قلت کے باعث مجاہدین کو شجاعت و مردانگی کی سب سے بڑھ کر ضرورت تھی۔ محض مردانگی ہی کی برکت سے وہ مسلمانوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے تھے اور انھیں بہ تعدادِ کثیر میدانِ جنگ میں لا سکتے تھے۔ لیکن سید صاحب کے مجاہدین میں دونوں قسم کے آدمی شامل تھے۔ شجاعت میں بھی کوئی ان سے برتری کا دعوٰی نہ کر سکتا تھا اور حسن تدبیر کی مثالیں بھی سامنے رکھی جائیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی ماہرِ فنِ حرب ان سے بازی نہ لے جا سکتا تھا۔

دونوں وصفوں کے جامع بہت سے لوگ موجود تھے۔ مثلاً شاہ اسمٰعیل، امام خاں خیرآبادی، مولانا محمد یوسف صاحب پھلتی، شیخ ولی محمد پھلتی، شیخ بلند بخت دیوبندی، مولوی خیر الدین شیرکوٹی، مولوی مصطفٰی کاندھلوی، عبدالحمید خاں رسالدار، ارباب بہرام خاں، قاضی سید محمد حبان وغیرہ۔ ان میں سب سے کونسا فرد تھا، جس کی قیادت ہر فوج کیلئے

انتہائی اعزاز و اکرام کا سرمایہ نہ ہوتی۔

مجاہدین پر شفقت

سید جعفر علی نقوی نے لکھا ہے:

> ''وفور شفقت بر غازیاں چناں بود کہ ہر کس جناب ممدوح را زائد از پدر و مادر بر خود می دانست''(۱)

ترجمہ: سید صاحب مجاہدین پر اتنی زیادہ مہربانی اور شفقت فرماتے تھے کہ ہر شخص آپ کو باپ اور ماں سے زیادہ مہربان و شفیق سمجھتا تھا۔

یہ الفاظ یقیناً ایک روشن حقیقت کا آئینہ ہیں۔ سید صاحب بالطبع بھی بدرجۂ غایت شفیق تھے۔ جن مجاہدین کو وہ وطن اور اہل و عیال سے نکال کر راہِ خدا میں قربانی کیلئے لائے تھے، ان پر شفقت کا صحیح اندازہ کون کر سکتا ہے؟! خصوصاً اس یگانہ بزرگ کی شفقت جو دنیا کے تمام رشتے توڑ کر صرف ایک رشتے کے استحکام کو زندگی کا نصب العین قرار دے چکا تھا اور وہ خدا کی محبت و رضا کا رشتہ تھا۔ اسی رشتے نے وقت کے ممتاز ترین عالموں، بڑے بڑے رئیسوں کے جگر بندوں اور عام مسلمانوں میں وہ روحِ ایمان پیدا کر دی تھی کہ وہ خدا کی راہ میں زیادہ سے زیادہ تکلیفیں اٹھانا عین راحت و شادمانی سمجھتے تھے اور جو شہادت پاتا تھا، اس کے متعلق کہتے تھے کہ وہ مراد کو پہنچ گیا۔

---

(۱) منظورہ، ص ۹۳۔

پانچواں باب:

ادارہ وانتظام کا نقشہ

ضروری گزارش

سید صاحب ۱۸۲۶ء کے اواخر میں سرحد پہنچے تھے اور ۲۰ ردسمبر ۱۸۲۶ء کو پہلی جنگ پیش آئی تھی۔ اس کے بعد کم وبیش تین سال تک کسی بڑے یا چھوٹے علاقے میں حکمرانی کا عملی نقشہ پیش کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ فروری ۱۸۲۹ء میں بیعت شریعت ہوئی اور مختلف مقامی رئیسوں نے بہ طیب خاطر شرعی نظام کا اجرا قبول کیا۔ اس سلسلے میں سید صاحب کو عشر ادا کرنے کا فیصلہ ہوا، لیکن اس میں باقاعدگی قاضی سید محمد حبان نے سرحد کے پورے میدانی علاقے کا دورہ کرکے پیدا کی۔ اس وقت سے وہ نظامِ حکومت اپنی ابتدائی شکل میں نافذ ہوا جو سید صاحب ہر جگہ نافذ کرنا چاہتے تھے اور اس پر عمل کی مدت بہت تھوڑی ہے۔ اس لئے کہ چند ماہ بعد سردارانِ پشاور اور بعض دوسرے خوانین نے سازش کرکے مجاہدین کی بہت بڑی تعداد کو بے خبرانہ شہید کر ڈالا اور سید صاحب سرحد کا میدانی علاقہ چھوڑ کر کسی دوسرے مرکز کی تلاش میں نکل پڑے۔ یوں اس نظام پر آٹھ دس مہینے یا زیادہ سے زیادہ ایک سال کا عملی نقشہ ہمارے سامنے آیا اور جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، وہ بھی بالکل ابتدائی شکل میں۔ اس کے متعلق جتنی تفصیلات مل سکیں وہ یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

عہدہ داروں کا تقرر

سید صاحب کے نظامِ حکومت میں عہدہ دار زیادہ نہ تھے، اس لئے کہ حکومت براہ

راست ان کے ہاتھ میں نہ تھی۔ سرحدی علاقے کے رئیسوں نے عشر دینا منظور کر لیا، اس کی بنا پر سید صاحب نے جا بجا قاضی مقرر کر دیے کہ لوگوں کے منازعات کا فیصلہ شریعت کے مطابق کریں اور بعض علماء کو مختلف علاقوں میں منصبِ افتاء پر مامور کر دیا۔ قاضی سید محمد حبان پہلے سے لشکر اسلام کے قاضی القضاۃ تھے، انہیں پورے علاقے کیلئے قاضی القضاۃ بنا دیا گیا۔ وہ جنگِ مردان میں شہید ہو گئے تو یہ عہدہ مولوی محمد رمضان کو دے دیا۔ مختلف علاقوں کے قاضیوں کی پوری تفصیل معلوم نہیں۔ قیاس یہ ہے کہ وہ مقامی علماء تھے۔ مثلاً صاحب زادہ نواب عبدالقیوم مرحوم کے نانا، ملا سید میر (ملا صاحب کوٹھا) کو کوٹھا کا قاضی بنایا گیا تھا اور ملا صفی اللہ شیوہ کے قاضی تھے۔ صرف پشاور میں مولوی مظہر علی عظیم آبادی کو عہدۂ قضا دینا پڑا، اس لئے کہ سردار سلطان محمد خاں بارک زئی کی خواہش یہی تھی۔

ملا قطب الدین ننگرہاری پورے علاقے کیلئے محتسب مامور ہوئے اور تیس تفنگچی ان کے ساتھ مقرر کر دیے گئے۔ وہ قریہ بہ قریہ اور دہ بہ دہ دورے کرتے رہتے تھے۔ جہاں کوئی امر خلافِ شرع پاتے اس کا انسداد کر دیتے۔ ایک مکتوب مظہر ہے:

> "ملا قطب الدین ساکن ضلع ننگرہار کہ از مدتِ مدید بناء بر اقامت جہاد و رفاقت آنجناب سالہا بسر کردہ و در دیانت و تقویٰ بے نظیر برآمد خدمت احتساب بر تارکین صلوٰۃ سپردہ شد و قریباً سی مردم تفنگچی از قندھاریاں ہمراہ او متعین کردہ شد"(۱)

ترجمہ: ملا قطب الدین ننگرہاری جو طویل مدت سے اقامتِ جہاد کے سلسلے میں سید صاحب کے رفیق ہیں اور دیانت و تقویٰ میں بے نظیر، انہیں تارکین صلوٰۃ پر احتساب کیلئے مقرر کر دیا ہے اور قندھاریوں میں سے تقریباً تیس بندوقچی ان کے ساتھ کر دیے ہیں۔

---

(۱) [illegible] کا مجموعہ ص ۴۱۔

راویوں کا بیان ہے کہ تھوڑی مدت میں پورے علاقے کی کایا پلٹ گئی۔ تمام لوگ شریعت کے پابند ہو گئے۔ چند داریاں ٹوٹ گئیں۔ مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق ہونے لگے۔ ملا قطب الدین کے ساتھیوں میں سے کوئی ایک کسی دوسرے کام کے سلسلے میں بھی کہیں جاتا تو گاؤں کے لوگ دوڑے آتے اور بتاتے کہ یہاں کوئی بے نماز نہیں:

> "ہر صغیر و کبیر از دیہات مذکور برادائے صلوٰۃ مستقیم گردید چنانچہ بالفعل یک متنفس ہم در دیہات مذکور کہ تارک صلوٰۃ باشد باذن اللہ یافتہ نمے شود" (۱)
>
> **ترجمہ**: دیہات کے تمام چھوٹے بڑے ادائے نماز پر قائم ہو گئے اور اب خدا کے فضل سے ایک شخص بھی نہیں مل سکتا جو تارک نماز ہو۔

تحصیل عشر کا انتظام

عشر کی تحصیل کیلئے مختلف مجاہدین جابجا مقرر کر دیے گئے تھے۔ مثلاً:

علاقہ	مامورین
گڑھی امان زئی	حاجی بہادر شاہ خاں اور محمود خاں
شیوہ	سید امیر علی اور حافظ عبد العلی
ٹوپی	مولوی نصیر الدین منگلوری
کھبل	پیر خاں
ترلانڈی	لکھمیر خاں
لونڈ خوڑ	مولوی خیر الدین شیرکوٹی
خدوخیل	فتح خاں پنجتاری

یہ صرف چند نام ہیں، یقین ہے کہ باقی حصوں میں بھی مختلف اصحاب مامور ہوئے ہوں گے۔ ان میں سے مولوی نصیر الدین منگلوری کا علاقہ بہت بڑا تھا۔ یعنی ٹوپی، مینئی،

---

(۱) رائے بریلی والے خطوط کا مجموعہ ص: ۲۱۔

گندف، باجا، بام خیل، پابنی، کھلابٹ، مرغز، دونوں منارے، کدا، زیدہ، پنج پیر، شاہ منصور، کنڈوہ، ہنڈ۔ یہ لوگ عشر کا حساب کتاب رکھتے تھے۔ ان کی امداد کیلئے ضرورت کے مطابق دو دو چار چار دس دس مجاہدین مقرر تھے۔ عشر کا غلہ یا جنس کی فروخت سے حاصل کیا ہوا روپیہ وقتاً فوقتاً پنجتار بھیج دیا جاتا تھا۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ غلہ پسوانے کیلئے منیٔ کی پانچ پن چکیاں سید صاحب نے اپنے انتظام میں لے لی تھیں۔ میر حامد علی جھنجھانوی کو پچیس تیس مجاہدین کے ساتھ انتظام کی غرض سے وہاں بٹھا دیا تھا۔ پنجتار سے غلہ بھیجا جاتا اور منیٔ سے آٹا پس کر آجاتا۔ ان مجاہدین کے علاوہ شیخ بلند بخت دیوبندی امب میں قلعہ دار تھے اور حافظ مصطفیٰ کاندھلوی چھتربائی میں۔ رسالدار سواروں اور شاہینوں کے ساتھ مستقل طور پر شیوہ میں مقیم تھا اور وقتاً فوقتاً تھوڑے سے سواروں کے ساتھ علاقے کا دورہ کرتا رہتا تھا۔

سید صاحب نے اسے مشورہ دینے کیلئے ایک مجلس شوریٰ بھی بنادی تھی، جو مندرجہ ذیل اصحاب پر مشتمل تھی: شیخ عبدالحکیم پھلتی، شیخ ناصرالدین پھلتی، حافظ عبدالرحمٰن پھلتی، شیخ عبدالرحمٰن رائے بریلوی، نورداد خاں لوہانی پورہ، عبدالحکیم خاں لوہاری، ملا عزت قندھاری، ملا نور قندھاری، ملا قطب الدین قندھاری، ملا لعل محمد قندھاری، عبدالغفار قندھاری۔

تاکیدی احکام

سید صاحب نے تاکیدی حکم دے رکھا تھا کہ:

''اگر سوار یا پیادہ برائے تحصیل برخوانین دیہات ردد، خوانین را باید کہ برادر خود تصور یدہ دعوتش کنند واو فرمائش چیزے نماید۔ اگر فرمائشے برخوانین نمود، در بارگاہ ما معاتب خواہد باشد'' (۱)

---

(۱) ''منظورہ'' ص: ۸۹۲۔

ترجمہ: اگر کوئی سوار یا پیادہ تحصیل عشر کیلئے خوانین کے پاس جائے تو انہیں چاہیے کہ اسے اپنا بھائی سمجھتے ہوئے کھانا کھلا دیں، خود اسے کسی چیز کی فرمائش نہ کرنی چاہیے۔ اگر اس نے فرمائش کی تو یہ امر ہماری ناراضی کا باعث ہوگا۔

اس ہدایت پر بڑے اہتمام سے عمل ہوا۔ رسالدار عبدالحمید خاں کا دستور یہ تھا کہ دورے پر نکلتے تو ہر آبادی سے نصف میل پر ٹھہر جاتے اور بعض اکابر کو باہر ہی بلا کر حالات پوچھ لیتے۔ سواروں کو بستی میں جانے یا کوئی چیز مانگنے کی سخت ممانعت تھی۔ ایک مرتبہ شیخ **لکھمیر** نے موضع ڈاگئی میں کسی سے چھاچھ مانگ لی۔ عبدالحمید خاں سخت ناراض ہوئے۔ گاؤں والوں نے کہا کہ یہ معمولی سی بات ہے، لیکن رسالدار نے شیخ سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارے ساتھ رہنا منظور ہے تو ضابطوں کی پابندی کیجئے ورنہ امیرالمومنین کے پاس چلے جائیے۔

ایک مرتبہ دو سواروں نے کسی سے شکر مانگی، اس نے جواب دیا کہ شکر تو نہیں گڑ موجود ہے۔ سوار غصے میں آگئے۔ رسالدار کو اس واقعے کا علم ہوا تو دونوں سواروں کے بیس بیس تازیانے لگوائے۔

مجلس شوریٰ

سید صاحب کا دستور ابتدا سے یہ رہا ہے کہ ہر معاملے کے متعلق اپنے خاص رفیقوں سے مشورہ کر لیتے تھے۔ ذاتی معاملات کے متعلق صرف اقربا یا بعض خاص رفیقوں سے مشورہ کرتے تھے۔ دینی مسائل علماء سے پوچھتے تھے۔ جہاد اور نظم ونسق کے متعلق جو اصحاب مختلف اوقات میں مجلس شوریٰ کے رکن رہے ان کے نام ذیل میں درج ہیں:

مولانا عبدالحئی، مولانا شاہ اسمٰعیل، سید احمد علی، سید حمید الدین، سید عبدالرحمٰن (تینوں سید صاحب کے بھانجے تھے) سید محمد یعقوب (سید صاحب کے بھتیجے) مولوی

وحید الدین، مولانا محمد یوسف پھلتی، خواجہ محمد (حسن پوری)، ارباب بہرام خاں، مولوی محمد حسن، شیخ بلند بخت، مولوی خیر الدین شیر کوٹی، امام خاں خیر آبادی، سید محمد علی رام پوری، مولوی ولایت علی عظیم آبادی، قاضی سید محمد حبان، سید اکبر شاہ ستھانوی، فتح خاں پنجتاری، ملا لعل محمد قندھاری، ملا قطب الدین ننگرہاری۔

ہر اہم معاملے کے متعلق ان میں سے موجود اصحاب کو بلایا جاتا اور اسے پوچھنے کے بعد قطعی فیصلہ کیا جاتا۔ توشہ خانے اور سلاح خانے کا انتظام پہلے مولانا محمد یوسف پھلتی کے حوالے تھا۔ اس انتظام کے سلسلے میں مولانا موصوف ہی سے مشورہ کرتے تھے۔ جب وہ فوت ہوگئے اور شیخ ولی محمد ان کی جگہ مامور ہوئے تو مال واسباب اور ہتھیاروں کے متعلق ان کی رائے لیتے تھے۔

امان نامے اور عطیات

مجموعۂ مکاتیب میں بعض ایسی تحریریں بھی موجود ہیں جنھیں امان ناموں سے موسوم کیا گیا ہے، یا بعض لوگوں نے ملکیتوں کی بازیافت کے متعلق درخواستیں پیش کیں تو فرمایا کہ جب وہ علاقے ہمارے قبضے میں آئیں گے اور ملکیتوں کا ثبوت مل جائے گا تو یہ واپس کردی جائیں گی۔ اس قسم کی تمام تحریرات میں مختلف شرطیں مذکور ہیں، مثلاً:

۱۔ بشرط اتباعِ احکامِ شریعت۔

۲۔ بشرط ادائے عشر۔

۳۔ بشرط اتباعِ شرع و رفاقتِ مجاہدین۔

۴۔ بشرط اتباعِ شریعت و خدمتِ دین۔

بعض علماء کو قضاء و افتاء کے منصب پر مامور کرتے ہوئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خدمت سونپی گئی۔ بعض روسا و خوانین کو جاگیروں کی بحالی کے متعلق تحریرات

دی گئیں۔ ان تحریروں میں بھی اتباعِ شریعت کی شرط موجود ہے۔(۱)

اتباعِ شریعت

سید صاحب کو اس بات کا خاص خیال تھا کہ تمام مسلمان ہر معاملے میں شرعی احکام کے پابند ہو جائیں۔ بیعتِ شریعت کے وقت خوانین نے خود اقرار نامے پیش کر دیے تھے کہ وہ شرعی احکام سے سرمو انحراف نہ کریں گے۔ ان میں فتح خاں پنجتاری بھی شامل تھا، جس کا وطن سید صاحب کا مرکزِ جہاد تھا۔ اسے بار بار فرماتے:

> "رسومِ ریاست وسیاست وسائر رسومِ غیر مشروعہ کہ بر بنائے تحصیل مال وجاہ بہ بست آیدہ، آں ہمہ را یک قلم ترک نمائید"(۲)

> **ترجمہ**: تم نے ریاست، سیاست اور دوسرے امور میں جو غیر شرعی طریقے مال اور اقتدار کی غرض سے جاری کر رکھے ہیں، ان سب کو یک قلم چھوڑ دو۔

عام لوگوں کی طرح ہماری رفاقت اختیار کرو اور شرعی احکام کے مقابلے میں دوستوں اور عزیزوں کی پاسداری سے کاملاً دست بردار ہو جاؤ۔

اعلانِ عام

ایک اعلان تمام مخلص مسلمانوں اور لشکر مجاہدین کے نام ہے، جس کے اہم مطالب کا خلاصہ ذیل میں درج ہے:

۱۔ لوگوں میں جھگڑا پیدا ہو تو اس کا فیصلہ خود نہ کریں بلکہ قاضی سے کرائیں۔ کسی بھائی کو اس معاملے میں دخل دینا مناسب نہیں۔

۲۔ ہر شخص کیلئے لازم ہے کہ جو کچھ کہنا ہو، قاضی کے سامنے کہے۔ اگر وہ ایسا نہ

---

(۱) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو "مجموعہ مکاتیب شاہ اسمٰعیل" قلمی نسخہ ص: ۲۰ تا ۲۴ب۔

(۲) "منظورہ"

کرے گا تو تعدی کا اندیشہ رہے گا اور تعدی خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک حد درجہ ناپسندیدہ ہے:

> "اگر کسے از لشکریان ایں جانب کاروبار بدوں معرفت قاضی پیش خواہد آورد و دراں چیزے جور و تعدی خواہد شد، قاضیاں اورا سزائے خواہند داد۔ اگر قاضیاں چیزے قصور خواہند کرد۔ اینجا تنبیہ واقع خواہد شد و ہر کسے را کہ اجرائے حکم منظور باشد، بہ معرفت قاضی نماید"(۱)
>
> **ترجمہ**: اگر ہمارا کوئی لشکر قاضی کے بغیر کوئی حکم جاری کرے گا اور اس میں ظلم و تعدی کا پہلو ہوگا تو قاضی اسے سزا دیں گے، اگر قاضیوں سے کوئی قصور سرزد ہوگا تو ہماری طرف سے تنبیہ کی جائے گی۔ جس شخص کو کوئی حکم جاری کرانا منظور ہو، وہ قاضی کی معرفت کرائے۔

"سید احمد شہید" میں ہم بتا چکے ہیں کہ سید صاحب نے جنگِ مایار کے بعد پشاور پر پیش قدمی کی تھی تو راستے میں ہر مقام پر عام لوگ درانیوں کی شکایتیں لے کر آتے اور کہتے کہ وہ ہم سے پیداوار کا نصف حصہ لیتے ہیں اور تحصیل و انتظام کا پورا خرچ ہم پر ڈالتے ہیں۔ اس طرح پیداوار میں سے بہ مشکل ایک تہائی حصہ عام کسانوں، کاشتکاروں اور زمینداروں کو ملتا تھا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ہمیں پیداوار کا صرف ایک تہائی حصہ دیتے جانا، اسی میں ہم اپنا خرچ چلائیں گے۔ بہرحال سید صاحب صرف یہ چاہتے تھے کہ عدالت، فیصلۂ مقدمات اور انتظامات میں شرعی اصول و مقاصد کے مطابق عمل ہو اور ظلم و فسق کا ملا مٹ جائے۔

اس سرسری انتظامی نقشے کو پیش نظر رکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سید صاحب کا مجوزہ نظامِ حکومت عوام کیلئے کس درجہ باعثِ رحمت تھا اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، یہ بالکل ابتدائی نقشہ ہے۔ اگر انہیں کسی علاقے میں مستقل حکومت قائم کرنے کا

---

(۱) "مجموعہ مکاتیب شاہ اسمٰعیل قلمی نسخہ" ص: ۲۶۲ تا ۲۶۳۔

موقع مل جاتا تو وہ ہمارے لئے نہایت عمدہ نمونہ بن جاتا۔

جرائم کے لئے سزائیں

جو تفصیلات ہمارے سامنے آئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر زور نماز کی پابندی پر دیا جاتا تھا، اس لئے کہ لوگ اس اہم ترین فرض کی بجا آوری میں تساہل کرتے تھے۔ جو مرد نماز ادا نہ کرتے تھے، امان خاں گنج پوری قاضی کے احکام کے مطابق انہیں تازیانے لگاتے تھے۔ عورتوں کو خود سید صاحب زنانے میں لے جا کر سزا دیتے تھے۔ قیام امب کے زمانے میں صرف دو عورتوں کو سزا ملی: ایک تارک صلوٰۃ تھی، دوسری نے شوہر کے ہوتے ہوئے اپنے آپ کو بیوہ ظاہر کیا۔ دریا پر ننگے نہانے والوں کو پہلے جرمانے کی سزا دی جاتی تھی، پھر ان کیلئے تازیانے کی سزا ہوگئی۔ جانوروں کی چرائی میں فصلوں کے نقصان کی شکایتیں موصول ہوئیں تو شروع میں ہر جانور کیلئے جرمانہ مقرر ہوا۔ بعد میں حکم دے دیا گیا کہ ہر فصل کے نقصان کا اندازہ کر کے مالک کو پورا تاوان دلایا جائے۔ اصلاح معاشرت کے سلسلے میں مختلف برائیوں کا انسداد کیا گیا۔ مثلاً لڑکیوں کی شادی کیلئے بھاری رقمیں لینا، دیر تک لڑکیوں کو بٹھائے رکھنا اور شادیاں نہ کرنا یا پیسے وصول کرنے کی غرض سے رخصتی کو التوا میں ڈالنا، گروہ بندیوں کا انسداد، انتقام گیری کے سلسلے میں خونریزی کو دائمی بنا دینے کا سد باب۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں ترک نماز پر خان دہ سے دو روپے جرمانہ لیا جاتا تھا، ملک سے ایک روپیہ، عام لوگوں سے آٹھ آنے۔ غیر شرعی رسموں کے سلسلے میں موتیٰ پر نوحہ و سینہ کوبی کو بھی روکا گیا۔

چھٹا باب:

دفتری ترتیبات

محکمۂ تحریر

سید صاحب کے انتظامی معاملات اگرچہ ابتدائی مراحل سے آگے نہ بڑھنے پائے، تاہم انہوں نے شروع ہی سے ایک محکمۂ تحریر قائم کر لیا تھا، جسے اصطلاح میں "منشی خانہ" کہتے تھے۔ منشی محمدی انصاری اور بردوانی اس محکمے کے رئیس یا سر منشی تھے۔ سید صاحب انہیں انصاری بھائی کہہ کر پکارتے تھے۔ انہیں نگارش میں ایسا کمال حاصل تھا کہ کسی موقع پر اندھیرے میں بھی کچھ لکھنا پڑتا تو بے تکلف لکھتے۔ نہ کوئی حرف خطا ہوتا، نہ الفاظ آپس میں ملتے اور نہ سطریں ٹیڑھی ہوتیں۔

متعدد اصحاب منشی خانہ سے وابستہ تھے، جن میں سے بعض کو قلمدان ملے ہوئے تھے، یعنی وہ باقاعدہ منشی سمجھے جاتے تھے۔ بعض کے پاس قلمدان نہ تھے، اگرچہ وہ عام طور پر منشیوں ہی میں شمار ہوتے تھے۔ اس محکمے کے کارکنوں میں منشی محمدی انصاری کے علاوہ مندرجہ ذیل اصحاب کا ذکر آیا ہے:

حافظ صابر، حافظ عبداللہ، منشی خواجہ محمد، مولوی محمد قاسم پانی پتی، منشی فضل الرحمن بردوانی، (یہ منشی محمدی انصاری کے ماموں تھے) میر فیض علی گورکھپوری، سید جعفر علی نقوی صاحب منظورۃ السعداء، حافظ عبدالعلی پھلتی، مولوی ریاست علی موہانی۔

سید جعفر علی نقوی نے لکھا ہے کہ آخری دو صاحبوں کے پاس قلمدان نہ تھے اور ان کیلئے منشی خانہ میں بیٹھنا بھی لازم نہ تھا۔

اطلاعات کا اہتمام

جب لشکر کا کوئی حصہ کاروبارِ جہاد کیلئے باہر بھیجا جاتا تھا تو اس کے ساتھ بھی ایک یا دو منشی ضرور جاتے تھے تاکہ تمام حالات کے متعلق روزانہ اطلاعات مرکز میں پہنچتی رہیں، اور سالارِ لشکر کو مختلف خوانین یا سرداروں کے نام خط بھیجنے پڑیں تو کوئی دقت پیش نہ آئے۔ مثال کے طور پر سید احمد علی رائے بریلوی کو پھولڑہ بھیجا گیا تو وہ سید جعفر علی نقوی کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ انکی رائے یہ تھی کہ میر فیض علی گورکھپوری مدت سے "منشی خانہ" میں مامور ہیں اور لشکر اسلام کے رسومِ خطاب نیز طریق مکاتبت سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کا مرکز میں رہنا بہتر ہوگا۔ سید صاحب نے میر فیض علی سے فرمایا کہ یہ آپ کا بھائی (سید جعفر علی نقوی) بڑی لمبی منزل طے کر کے آیا ہے اور ابھی ماندگی دور نہیں ہوئی، لہٰذا آپ ہی چلے جائیں۔ انہوں نے عرض کیا بسر و چشم۔ چنانچہ وہ گئے اور جنگ پھولڑہ میں شہادت پائی۔

بعض اوقات مکاتیب یا اعلامات کی متعدد نقلیں کرانا ضروری ہو جاتا تھا، ایسے مواقع پر مزید آدمیوں کو امداد کی غرض سے منشی خانہ میں بلوا لیا جاتا تھا، مثلاً حکیم قمر الدین پھلتی، نور احمد نگرامی، عبدالوہاب قاسم غلہ، غلام محمد پانی پتی (والد منشی محمد قاسم)۔

طریق مکاتبت

جب شاہ اسمٰعیل مرکز میں ہوتے تو تمام مکاتیب وہی لکھواتے۔ سید صاحب مضمون بتا دیتے اور شاہ صاحب اسے عبارت کا لباس پہنا دیتے۔ وہ مضمون بولتے جاتے اور منشیوں میں سے کوئی ایک لکھتا جاتا۔ سید جعفر علی نقوی نے لکھا ہے کہ خود شاہ صاحب کو کتابت پر ویسی قدرت حاصل نہ تھی جیسی کہ ہونی چاہیے تھی۔ (۱)

---

(۱) منظورہ ص: ۵۰۷۔ اس کتاب کی تمام اطلاعات زیادہ تر "منظورہ" ہی سے ماخوذ ہیں۔ کتابت کے متعلق منظورہ کے الفاظ یہ ہیں: قدرت بر کتابت چناں کہ باید نداشتند" مطلب یہ ہے کہ شاہ صاحب نے کتابت کی مشق نہ کی اور وہ مشاق آدمیوں کی طرح نہ لکھ سکتے تھے۔

ہر تحریر پر میر منشی صاحب ایک خاص نشان بنا دیتے جو انہیں کو معلوم تھا۔ اس کے بغیر کسی تحریر پر مہر نہ لگائی جا سکتی تھی۔ منشی محمدی انصاری ہر تحریر کو بہ غور پڑھ لیتے۔ مہر ہو جانے کے بعد اسے جہاں بھیجنا ہوتا بھیج دیا جاتا۔ توضیحات کے اہتمام کا یہ حال تھا کہ جو مکتوب براہ راست سید صاحب کے فرمان سے لکھا جاتا، اس کے ایک گوشے میں "حضور" لکھ دیا جاتا۔ جو شاہ اسمٰعیل کی وساطت سے موصول ہوتا اس کے کسی گوشے میں "مولانا" تحریر کر دیا جاتا۔ یعنی اس کا مضمون براہ راست نہیں بلکہ بوساطت مولانا شاہ اسمٰعیل موصول ہوا۔

روزنامچہ

منشی انصاری نے ہر مہینے کے تمام حالات روزانہ بالالتزام لکھوانے کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ مہینہ ختم ہوتا تو روزنامچہ محفوظ کاغذات کے صندوق میں رکھ دیا جاتا اور نئے مہینے کیلئے نئے روزنامچے کی جدولیں تیار کرائی جاتیں۔ تاریخ وار حالات میں سب کچھ شامل ہوتا مثلاً لڑائیوں کی کیفیت، مذاکرات کا مرقع، کہاں کہاں آدمی بھیجے گئے، کون کون لوگ ملنے کیلئے آئے، ان سے کس موضوع پر باتیں ہوئیں، کتنی رقم باہر سے آئی اور کتنی خرچ ہوئی وغیرہ۔ اس طرح وہ ماہانہ حالات کا پورا نقشہ تیار کر کے رکھتے جاتے تھے۔ روزنامچے میں یہ بھی لکھا جاتا تھا کہ کس کس کو خط بھیجے گئے اور کس کس کی طرف سے خط آئے۔

کاغذات کا صندوق

منشی صاحب نے ایک بڑا صندوق لے لیا تھا، جس میں تمام ضروری کاغذات کے الگ الگ بستے بندھے ہوئے رکھے جاتے تھے۔ اس میں کچھ کتابیں بھی تھیں، مثلاً شاہ ولی اللہ کی کتاب "تفہیمات الٰہیہ"، حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ، ان کے علاوہ جمعہ اور عیدین کے بہت سے خطبوں کی نقلیں تھیں۔ یہ خطبے شاہ اسمٰعیل وقتاً فوقتاً دیتے رہتے تھے۔ سید جعفر علی نقوی نے لکھا ہے کہ ان کی تعداد ایک سو کے قریب تھی۔

یہ نہایت قیمتی اور گراں بہا صندوق بالاکوٹ کی جنگ میں بھی ساتھ تھا۔ سید صاحب، شاہ اسمٰعیل، منشی محمدی انصاری اور دوسرے اکابر کی شہادت کے بعد یہ بھی یا تو جل گیا یا لوٹ میں اس کے کاغذات ضائع ہو گئے۔

دفتر کا نام "منشی خانہ" تھا۔ غازی خاں، شہامت خاں وغیرہ اس کی محافظت پر مامور تھے۔ منشی محمدی انصاری کو جس بستے کی ضرورت ہوتی، محافظوں سے کہہ کر صندوق میں سے نکلوا لیتے۔ (۱)

نشانِ تاکید

سید صاحب نے مجاہدین کیلئے تاکید کی غرض سے ایک نشان مقرر کر رکھا تھا۔ جب کسی کو کوئی تحریری حکم دیتے تو دستِ مبارک سے اس پر "کلمۃ اللہ کافی" لکھ دیتے۔ لشکر اسلام میں اسے انتہائی تاکیدی حکم سمجھا جاتا۔ مثلاً سید صاحب کی سیرت میں یہ واقعہ درج ہو چکا ہے کہ شاہ اسمٰعیل پہلی مرتبہ بالاکوٹ گئے تھے تو انہوں نے سکھوں کے لشکر پر شبخون مارنے کا پختہ فیصلہ کر لیا تھا۔ عین آخری وقت پر سید صاحب کی طرف سے طلبی کا فرمان پہنچ گیا اور اس پر "کلمۃ اللہ کافی" درج تھا۔ شاہ صاحب نے شبخون ملتوی کر دیا اور سفر کی تیاری کر لی۔ بعض مشیروں نے شاہ صاحب سے کہا کہ حضرت کو مفصل حالات لکھ بھیجئے اور شبخون ملتوی نہ کیجئے۔ شاہ صاحب نے جواب دیا کہ فرمان تاکیدی ہے اور میرے لئے عذر کی گنجائش نہیں رہی۔

مختلف مہریں

اس سلسلے میں مختلف اصحاب کی مہروں کا بھی ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان کی طرف سے جو خطوط لکھے جاتے تھے، وہ عموماً منشی صاحبان ہی لکھتے اور وہی مہریں ثبت

---

(۱) یہ تمام تفصیلات "منظورہ" سے ماخوذ ہیں۔

کرتے تھے:

شخصیت	مہر
سید صاحب	**اسمہ احمد** (یہ مہر شاہ اسمٰعیل کے پاس رہتی)
شاہ اسمٰعیل	**واذکر فی الکتاب اسمٰعیل**
مولانا عبدالحیٔ	اوپر: **ھوالحی لا الٰہ الا اللّٰہ** نیچے: **اِنِ الْحکمُ الا لِلّٰہ**
شیخ ولی محمد	**ھوالولی الحمید**
شیخ بلند بخت	بفضل خدا گشت بختم بلند
مولانا احمد اللہ ناگپوری	**احمد اللّٰہ واستعین**

بعض اصحاب نے مہروں پر مختص نام کندہ کرا رکھے تھے۔ ارباب بہرام خاں کی مہر گم ہوگئی تھی اور انہوں نے نئی مہر نہ بنوائی۔ وہ کہا کرتے تھے "مہر ما شہید شد"۔

منشیوں کا اخلاص اور سادگی

درویشی، سادگی اور بے تکلفی میں منشی عام مجاہدین ہی کا نمونہ تھے اور ان میں امتیاز کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ میدانِ جنگ میں وہ عام سپاہیوں کی طرح کام کرتے تھے۔ قلمدان چھری کی طرح کمر میں لٹکا لیتے۔ جب لکھنے کی ضرورت ہوتی بے توقف لکھنے لگتے۔

سردار پائندہ خاں تنولی کا منشی محمد غوث سردار کو چھوڑ کر سید صاحب کے پاس آ گیا تھا، وہ منشی خانہ کے سامان کی سادگی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سید جعفر علی نقوی کے پاس پرانا قلمدان اور ایک بڑی قینچی تھی۔ منشی محمد غوث نے کہا کہ میں آپ کو نیا چاقو اور نیا قلمدان لادوں گا۔ سید جعفر علی نقوی نے فرمایا:

"مرا حاجت بہ قلم تراش شما نیست، خدمت دین نمائید۔ یہ ہمیں امر

از شما راضی خواہم شد۔ مرا مثل عمدہ ہائے سرکار ہائے دنیا نہ باید شناخت۔ ایں جا جاروب کش و منشی یکساں است۔ اخلاص کامل می باید۔ چوں کار بدیں قلمدان و مقراض کہنہ ہم ممکن است و بہ شراکت از قلم تراش دیگراں درستی قلم ہم می شود، حاجت ہیچ چیزے نمی افتد"۔ (۱)

ترجمہ: مجھے آپ کے چاقو کی ضرورت نہیں۔ دین کی خدمت بجالائیں۔ یہی امر میرے لئے خوشنودی کا باعث ہوگا۔ مجھے دنیا دار حکومتوں کے کارکنوں کی طرح نہ سمجھئے۔ ہمارے ہاں جھاڑو دینے والے شخص اور منشی کی شخصیت ایک ہے۔ یہاں اخلاص کامل درکار ہے۔ جب اس پرانے قلمدان اور پرانی قینچی سے کام چل سکتا ہے اور دوسروں کا چاقو لے کر قلم بھی بنایا جاسکتا ہے تو مجھے کسی چیز کی کیا ضرورت ہے؟

غور طلب حقیقت

سید جعفر علی نقوی کا جواب محض ایک تاریخی واقعے کے طور پر نہ پڑھیے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سید صاحب نے اپنے مخلصین میں کس قسم کی روحِ فکر و عمل پیدا کردی تھی۔ وہ لوگ اپنی زندگیاں راہِ خدا میں وقف کرچکے تھے۔ اگر نئے قلمدانوں یا نئی قینچیوں اور چاقوؤں کی خواہش کرتے تو یہ ایسی خواہش نہ تھی کہ سید صاحب کیلئے محدود وسائل کے باوجود اسے پورا کردینا غیر ممکن ہوتا، لیکن وہ لوگ صرف ایک ہی غرض لے کر آئے تھے کہ جس طور بھی ممکن ہو مقاصد دین پورے کریں۔ سید صاحب کی تربیت اور مردم گری کا کمال یہ ہے کہ مجاہدین نے یہ سادگی یا سامان کی فرومائیگی یا مجبوری کی حالت میں قبول نہ کی تھی، بلکہ وہ اس پر ہر لحاظ سے قانع اور خوش تھے اور اسے عند اللہ ثواب میں زیادتی کا باعث سمجھتے تھے۔

---

(۱) "منظورۃ" ص: ۷۴۷۔

یہ اخلاص ہندوستان میں سید صاحب کی جماعت کے سوا اور کس جماعت کو نصیب ہوا؟ یہ مسلمانوں کیلئے ایک نمونہ تھا کہ جہاد فی سبیل اللہ محض سامانوں کی فراوانی اور شان و شوکت پر نہیں بلکہ ایمان کی پختگی اور استقامت پر موقوف ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جب لڑائیاں پیش آئیں تھیں تو دشمنوں کے مقابلے میں ان کے پاس کونسا سامان تھا؟ لیکن تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ جن دشمنوں کا شکوہ و دبدبہ دیکھ کر نگاہیں خیرہ ہو جاتیں تھیں، وہ ایمان و استقامت کے مقابلے میں غبار راہ بن کر اڑ گئے۔

سید صاحب ہندوستان میں اخلاص کا وہی منظر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے نمونہ پیش کر دیا جس کی درخشانی زمانے کی گردش سے ماند نہیں پڑ سکتی۔ باقی رہا یہ امر کہ حسب مراد فوری نتیجے کیوں پیدا نہ ہوئے تو قدرت کی مصلحتوں کا بھید کسی پر آشکارا نہیں ہو سکتا۔ ادائے فرائض کا راستہ سوداگری اور تجارت نہیں کہ سرمایہ لگایا اور نفع کے امیدوار بن گئے، فرمانبردار بندوں کو بہر حال احکامِ الٰہی کا پابند رہنا چاہیے۔ رضا جوئی کا تقاضا یہی ہے۔ نتیجے سے انہیں بالکل بے پروائی اختیار کر لینی چاہیے۔ ان کے ساز وجود کا ترانہ یہی ہوتا ہے۔

بہ دُرد و صاف ترا حکم نیست دم در کش ❁ کہ آنچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

راہِ حق کے علمداروں کی زندگیوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں رنج و مشقت، قید و بند، دار و رسن اور قتل و شہادت کے سوا کیا مل سکتا ہے؟ گویا ہر لمحہ ان کیلئے ثبات و استقامت کی ایک نئی امتحان گاہ ہوتا ہے۔ شاید خواجہ حافظؒ نے اسی حقیقت کے پیش نظر کہا تھا:

در طریق عشق بازی امن و آسایش خطاست
ریش باد آں دل کہ با درد تو جوید مرہمے

ساتواں باب:

خط و کتابت

مجموعۂ مکاتیب

سید صاحب نے تقریباً ساڑھے چار سال سرحد میں گزارے اور اس تھوڑی سی مدت کے لیل و نہار کا بیشتر حصہ جہاد کی دعوت، لشکر کی تنظیم، ایک دوسرے کے دشمن خوانین کی مصالحت اور لڑائیوں کی کشاکش میں گزرا۔ ان حالات میں انہیں خط و کتابت کیلئے بہت کم وقت مل سکتا تھا، تاہم ان کے مکاتیب کا مجموعہ ہمارے سامنے ہے، اسے دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے کہ وہ کیونکر یہ سب کچھ لکھواتے اور جا بجا بھجواتے رہے۔ جن مسلمان سلاطین، امراء، رؤسا، خوانین، علماء اور اکابر تک ان کی آواز بذریعہ تحریر پہنچ سکتی تھی، انہوں نے پہنچانے میں توقف نہ کیا۔ ان کے مکاتیب و اعلامات کا خاصا بڑا ذخیرہ موجود ہے اور معلوم ہے کہ بہت سے مکاتیب ضائع ہو گئے۔ اگر وہ بھی موجود ہوتے تو ذخیرہ کم از کم دوگنا ہوتا اور یہ صرف چار پانچ سال کا مجموعہ ہوتا جن کا ایک ایک لمحہ نہایت اہم مشاغل میں بسر ہوا۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے تحریری دعوت کا فرض بھی کس اعلیٰ پیمانے پر انجام دیا۔ لطف یہ کہ ان کے اکثر مکاتیب آیات و احادیث سے مزین ہیں اور جو کچھ ان کی طرف سے لکھا گیا وہ دینی تعلیمات کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

مرموز خط و کتابت

آج کل ڈپلومیٹک مقاصد کیلئے تمام حکومتوں نے خاص کوڈ (مرموز الفاظ) بنا رکھے

ہیں۔ سید صاحب نے آج سے سوا سو سال پیشتر سری خط و کتابت کیلئے کوڈ بھی تیار کرا لیا تھا، اور اس خط و کتابت کو خاص آدمیوں کے سوا کوئی نہ سمجھ سکتا تھا۔ یہ اس حقیقت کی شہادت ہے کہ ان کی تحریک کس طرح ہر پہلو سے مکمل اور منظم تھی اور فکر و عمل کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو ان کی دقیقہ رس نگاہوں سے اوجھل رہا۔

ایک مثال

مرموز خط و کتابت کی ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے: ہنڈ کا رئیس خادے خاں قتل ہو چکا تھا۔ اس کے اہل و عیال کو شاہ اسمٰعیل رہا کر دینا خلاف مصلحت سمجھتے تھے۔ زیدہ کا رئیس مقرب خاں جو خادے خاں کا قریبی رشتہ دار تھا، نیز خادے خاں کے بھائی سید صاحب سے درخواستیں کر رہے تھے کہ مقتول کے اہل و عیال کو چھوڑ دیا جائے۔ سید صاحب ہنڈ سے دور بیٹھے تھے اور جو حالات شاہ صاحب کے سامنے تھے وہ سید صاحب کے سامنے نہ تھے، لہٰذا انہیں خادے خاں کے اہل و عیال کو چھوڑ دینے میں کوئی خرابی نظر نہ آتی تھی اور انہوں نے شاہ صاحب کو لکھ بھیجا کہ انہیں چھوڑ دیا جائے۔ آخر شاہ صاحب نے ایک مرموز خط سید صاحب کو لکھا، جس میں تمام مصلحتیں کھول کر بیان کر دیں۔ اس میں یہ بھی عرض کر دیا کہ ان حالات میں اہل و عیال کی رہائی خلاف مصلحت ہے اور یہ خط بے تکلف مقرب خاں کے حوالے کر دیا۔ اس نے اپنے منشی سے پڑھوایا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا اور سمجھ لیا کہ یہ خود اس کی شکایتوں پر مشتمل ہے، چنانچہ اس نے نہ یہ خط سید صاحب کے پاس پہنچایا، نہ سرداری پر قائم رہا بلکہ اس ڈر کے مارے پہاڑوں میں چلا گیا۔

شاہ اسحٰق اور شاہ یعقوب کے نام خطوط

سید صاحب نے فراہمی زر کے جو مرکز جا بجا بنائے تھے، ان میں سب سے بڑا مرکز دہلی میں تھا جس کے انتظام کے ذمہ دار شاہ محمد اسحٰق اور شاہ یعقوب تھے۔ یہ عموماً ہنڈیوں

کے ذریعے سے روپے سید صاحب کے پاس بھیجتے تھے، بعض اوقات خاص قاصد سرحد سے دہلی آ کر روپیہ لے جاتے تھے۔ ان سے زیادہ تر خط و کتابت روپے کے متعلق ہوتی تھی۔ طبعاً اندیشہ تھا کہ ممکن ہے یہ خطوط اجنبیوں کے ہاتھ لگ جائیں، اسلئے سید صاحب نے ان کے متعلق خاص احتیاطی تدبیریں اختیار کیں۔ مثلاً:

۱۔ یہ خطوط عموماً عربی میں لکھے جاتے تھے۔ میرے علم میں جتنے خط آئے، ان میں سے صرف دو فارسی میں تھے۔

۲۔ ایک یا دو خطوں کے سوا کسی میں نہ سید صاحب نے اپنا نام صراحتاً لکھا اور نہ مکتوب الیہما کے ناموں کی صراحت کی۔

۳۔ روپے کی رسید عموماً ایسے انداز میں بھیجی جاتی تھی کہ مکتوب الیہما کے سوا کوئی اسے سمجھ نہ سکتا تھا۔

۴۔ ایک خط کے آخر میں ایسے مرموز الفاظ درج ہیں جن کا مطلب کوشش کے باوجود سمجھ میں نہ آیا۔

اب ان کی مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

کاتب اور مکتوب الیہما کے اسماء

سید صاحب اپنے متعلق مختلف خطوں کے آغاز میں لکھتے ہیں:

۱۔ من عبد اللّٰه المنتهض لاعلاء کلمة اللّٰه.

۲۔ من عبداللّٰه المنتهض لاعلاء کلمة اللّٰه الناصح لکافة المسلمین.

۳۔ من عبداللّٰه المنتهض لاعلاء کلمة اللّٰه لنصرة الدین الملقب بامیر المومنین.

مکتوب الیہما کا ذکر ملاحظہ فرمائے:

۱۔ ناصران بکلمة الله، ناصحان لدين الله، اما اکبرهما فلاشك انه نقی الاعراق، صفی الاخلاق، وصی الآفاق واما اصغرهما فلاريب فی انه ذوالخلق المرغوب، مطهرادناس العيوب.

۲۔ شيخين جليلين، للدّراية عينين وللرواية اذنين وللسماحة يدين وللشهادة عضدين وللعبادة قدمين وللهداية علمين. اما اکبرهما فلاريب فی انه شجرة ثابتة الاصول والاعراق، ناضرة الغصون والاوراق واما اصغرهما فلاشك فی انه ثمرة طعمها مرغوب وريحها محبوب.

۳۔ الی کريم الاخلاق، طيب الاعراق، فاتح الاغلاق والی اخيه المحبوب ذی الخلق المرغوب.

ظاہر ہے کہ دونوں بھائیوں کیلئے جو الفاظ ہیں وہ اخلاق اور یعقوب کے ہم قافیہ ہیں۔ اس کی اور بھی مثالیں ملتی ہیں۔

قاصدوں کی کیفیت

کہیں قاصدوں کے نام صراحتاً درج کر دیے ہیں، اکثر ان کے متعلق بھی رمز و کنایہ کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ مثلاً دو قاصدوں کے متعلق لکھتے ہیں:

۱۔ احدهما صغير اسما وکبير جسما وثانيهما فی القامة قصير المسمی به حرز الله القدير.

۲۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ جو قاصد بھیجے جا رہے ہیں وہ تمام مجاہدوں کے نزدیک معتبر ہیں۔

احدهما يسمی بما هو ضدالادبار والثانی شيخ منسوب الی سيد الابرار.

ان کے سوا مختلف مکاتیب میں مندرجہ ذیل قاصدوں کا ذکر آیا ہے: احمد علی، اخلاص

نشان، چاند خاں، حاجی بہادر شاہ خاص، ابراہیم جو غزنی سے ہجرت کر کے لشکر اسلام میں پہنچا تھا، جہان خاں، چھنا، پیر محمد۔

رقموں کی رسید

رقموں کی رسید کے متعلق بھی عموماً مرموز پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ چودہ سو کی رسید دینی تھی تو لکھا کہ رقم پہنچی جو اصحاب بیعت الرضوان کی تعداد کے مطابق تھی۔

۲۔ سات سو روپے کی رسید کے متعلق لکھتے ہیں: مرتبہ ثالثہ میں اقلیموں کی تعداد کے مطابق۔

۳۔ چار سو کی رسید کے متعلق فرماتے ہیں: مرتبہ ثالثہ میں خلفائے راشدین کی تعداد کے مطابق۔

۴۔ چھ سو کے متعلق ارشاد ہوتا ہے: مرتبہ ثالثہ میں تعداد جہات کے مطابق۔

۵۔ آٹھ سو کے متعلق لکھتے ہیں: مرتبہ ثالثہ میں ابواب جنان کی تعداد کے مطابق۔

۶۔ دو ہزار پانسو کی رسید یوں دیتے ہیں: اثنین من المرتبۃ الرابعۃ وخمس من الثلاثۃ۔

کہیں سات سو کیلئے کواکب سیارہ کی تعبیر اختیار کی گئی اور کہیں ایام ہفتہ کی۔

مرموز الفاظ

ایک خط کے آخر میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:

والسلام علیکم وعلیٰ من لدیکم۔ اجث، خجد، ذرزس، حصضط، ضعغو، قکلم، نوہی۔

کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے اور کسی ایسے بزرگ سے ملاقات کا شرف بھی حاصل نہ ہوا، جو ان مرموزات کی کلید سے آگاہ ہوتے۔

رقوم کے متعلق ہدایات

عام طور پر ہنڈیاں قریۂ منارہ کے دو ہندو ساہو کاروں موتی اور سنتو کے نام آتی تھیں۔ جو ایک سو میں سے بارہ روپے منّی کاٹتے تھے یعنی ایک سو کے اٹھاسی روپے دیتے تھے۔ سید صاحب نے متعدد خطوں میں تاکید فرمائی کی ہنڈیاں چھوٹی رقموں کی بھیجی جائیں۔ غالباً اس لئے کہ بڑی رقموں کی ہنڈیوں کا روپیہ حاصل کرنے میں دیر لگتی تھی۔

مختلف خطوط میں تاکید کی گئی ہے کہ کچھ رقم الگ کر لی جائے اور وہ ان مجاہدین کے پسماندہ کو دیدی جائے جنکے گزارے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ بعض اوقات اپنے دولت مند دوستوں کو لکھ بھیجتے تھے کہ اتنی رقم فلاں فلاں مجاہدین کے متعلقین کو پہنچادی جائے۔ عموماً یہ رقمیں بیس پچیس یا پچاس سے متجاوز نہ ہوتی تھیں۔ حاجی زین العابدین کو ایک مرتبہ ایک سو روپے دے دینے کی ہدایت کی گئی تاکہ وہ مختلف اصحاب میں بانٹ دیں۔ شاہ اسمٰعیل کی ہمشیر اور ان کے صاحبزادے کو ایک ایک سو روپیہ دیا گیا۔

مجاہدین کا عمل

مجاہدین بھی تمام مواقع پر انتہائی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ امب سے سید صاحب کے پاس پیغام بھیجنا منظور تھا۔ اندیشہ تھا کہ یہ پیغام کسی کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ چنانچہ ایک معتمد علیہ تولی تلاش کیا اور جو پیغام بھیجنا تھا لکھ کر اس کے جوتے کے تلے میں سلوا دیا۔

جب اہل سمہ کی غداری کے باعث بہت سے مجاہدین قتل ہو چکے تھے تو مولوی خیر الدین شیر کوٹی لوند خوڑ میں مقیم تھے، انہیں حفاظت کی غرض سے اپنا مقام چھوڑنا پڑا۔ پنجتار نہ پہنچ سکتے تھے، اس لئے کہ راستہ خطرناک تھا، لہٰذا پڑان غار کا قصد کر لیا جو لوند خوڑ

کے شمال مغرب میں ایک محفوظ مقام تھا۔ سید صاحب کے پاس یہ خبر پہنچانے کی کوئی صورت نہ بنی۔ راستے میں مولوی صاحب کو ایک شخص مل گیا، اس کی کتاب کے حاشیے میں ایک جگہ یہ عبارت لکھ دی:

> ''تا ایں جا از فضل و کرم خدا آمدہ ایم و بہ پڑان غازی رویم آں جناب دعا فرمائید کہ باز زیر قدم آں جناب حاضر شویم''۔

ترجمہ: خدا کے فضل و کرم سے ہم اس مقام تک آ گئے اور پڑان غار جا رہے ہیں۔ دعا فرمائیں کہ پھر آپ کے قدموں میں پہنچنا نصیب ہو۔

آٹھواں باب:

دعوت و تبلیغ

تحریک کی بنیاد

سید صاحب کی تحریک خالص دینی اصول پر قائم ہوئی تھی اور اس کی ترقی و توسیع کا انحصار دعوت و تبلیغ پر تھا۔ سید صاحب نے ابتدا ہی سے اس کیلئے بھی خاص انتظام فرما دیے تھے۔ پہلے وہ خود اپنے خاص رفیقوں کو لیکر دورے کرتے رہے، پھر مولانا عبدالحیٔ اور شاہ اسمٰعیل دعوت و تبلیغ ہی کیلئے وقف ہو گئے۔ سر سید احمد خاں شاہ اسمٰعیل کے حالات میں لکھتے ہیں:

> ''بموجب ارشاد سید اصفیا یعنی پیر طریق ہدیٰ (سید صاحب) کے اس طرح سے تقریر وعظ کی بنا ڈالی کہ مسائل جہاد فی سبیل اللہ بیشتر بیان ہوتے اور یہاں تک آپ کے صیقل تقریر سے مسلمانوں کا آئینۂ باطن مصفا اور مجلا ہو گیا اور اس طرح سے راہِ حق میں سرگرم ہوئے کہ بے اختیار دل چاہنے لگا، سر ان کا راہِ خدا میں فدا ہو اور جان ان کی اعلائے لوائے محمدی میں صرف ہو۔(۱)

مولانا عبدالحیٔ کے متعلق سر سید فرماتے ہیں کہ انہوں نے بھی وعظ شروع کر دیا تھا:

> ''لوگوں کو نہایت ہدایت حاصل ہوئی اور بہ اتفاق مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کے ترغیب جہاد فی سبیل اللہ میں سرگرم رہے۔(۲)

---

(۱) یہ حالات آثار الصنادید کی طبع اول میں شائع ہوئے تھے۔ انجمن ترقی اردو نے انہیں اپنے سہ ماہی رسالہ ''تاریخ و سیاسیات'' میں بالاقساط چھاپ دیا۔ اقتباس کیلئے ملاحظہ ہو'' تاریخ سیاسیات'' بابت نومبر ۱۹۵۲ء ص:۸۔

(۲) ایضاً ایضاً ص:۷٦۔

ضروری انتظامات

سید صاحب نے راہِ ہجرت میں قدم رکھنے سے پیشتر جگہ جگہ ایسے اصحاب مقرر کر دیے تھے جو دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کریں اور انہیں جہاد کی ترغیب دیتے رہیں۔ بعض اصحاب کا وظیفہ قرار دیا گیا کہ مسلمان جہاد کے سلسلے میں جو مالی امداد دیں وہ ان کے پاس جمع ہوتی رہے۔ پھر یا تو یہ رقمیں سید صاحب کے قاصدوں کو دے دی جاتی تھیں، جو وقتاً فوقتاً ہندوستان آتے رہتے تھے اور مختلف حصوں کا دورہ کر کے رقمیں لے لیتے تھے، یا ہر مقام سے جمع شدہ رقمیں دہلی پہنچا دی جاتی تھیں، جو فراہمیٔ زر کا سب سے بڑا مرکز تھا اور وہاں سے ہنڈیوں کی شکل میں سید صاحب کے پاس بھیج دی جاتی تھیں۔

بہر حال اس تحریک کا فروغ دعوت و تبلیغ ہی پر موقوف تھا، جسے سید صاحب نے مختلف اوقات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تعبیر فرمایا۔ دعوت و تبلیغ ہی کے ذریعے سے مسلمانوں میں حقیقی دینی ذوق پیدا کیا جا سکتا تھا۔ اسی طریقے سے کام لے کر مجاہدین کی جماعتیں تیار کی جا سکتی تھیں، اور یہی طریقہ وسائل جہاد کیلئے فراہمیٔ زر کا ضامن ہو سکتا تھا۔

خاص داعیوں کا تقرر

جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں، سید صاحب دہلی، ٹونک، یوپی اور بہار کے علاقوں میں دعوت و تبلیغ کا پورا انتظام جہاد کیلئے روانہ ہونے سے پیشتر کر چکے تھے، لیکن بعض حصے ایسے بھی تھے جہاں یا تو کوئی انتظام ہی نہ کیا جا سکا تھا یا جو انتظام تھا وہ ضرورت کے مطابق نہ تھا، مثلاً بمبئی، حیدر آباد، مدراس اور بنگال، لہٰذا سرحد پہنچ کر اور حالات کا جائزہ لے کر سید صاحب نے ان حصوں میں مختلف اصحاب کو داعی مقرر کیا جو تقریر و بیان

کے لحاظ سے مجاہدین میں ممتاز تھے۔ مثلاً مولوی سید محمد علی رام پوری، مولوی ولایت علی عظیم آبادی، مولوی عنایت علی عظیم آبادی، مولوی محمد قاسم ساکن بمبئی، سید اولاد حسن قنوجی، حافظ قطب الدین، ممکن ہے اور اصحاب بھی اس سلسلے میں مقرر ہوئے ہوں، مجھے صرف انہیں اصحاب کا علم ہے۔ مفصل حالات تو ان کے سوانح میں بیان ہوں گے، لیکن موضوع کی تکمیل کیلئے ان کے ارسال اور داعیانہ کاروبار کی سرسری کیفیت بیان کر دینا ضروری ہے۔

مولوی سید محمد علی رام پوری

مولوی سید محمد علی رام پوری کے متعلق وقائع کا بیان ہے کہ انہیں سید صاحب نے حیدر آباد (دکن) جانے کا حکم دیا:

> انہوں نے عذر کیا کہ مجھ کو نہ اس قدر علم ہے کہ کسی عالم سے مباحثہ یا مناظرہ کروں اور نہ سلیقہ ہے کہ لوگوں کے انبوہ میں وعظ و درس کہوں۔

سید صاحب نے فرمایا کہ جس بات کا آپ عذر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ عذر دور کر دے۔ پھر آپ نے اپنی ٹوپی، کرتا اور پاجامہ انہیں پہنایا اور پانچ آدمی ان کے ہمراہ کیے جن میں سے تین کے نام یہ ہیں: نعیم خاں رام پوری، عنایت اللہ خاں اور عبداللہ اور حکم دیا کہ پیر کوٹ میں بیوی صاحبہ سے ملتے ہوئے کراچی سے کشتی پر سوار ہوں اور بمبئی میں اتر کر حیدر آباد جائیں۔ (۱)

مولوی صاحب موصوف کچھ مدت حیدر آباد میں رہے پھر مولوی ولایت علی عظیم آبادی حیدر آباد میں مقرر ہو گئے اور مولوی سید محمد علی کو مدراس جانے کا حکم مل گیا۔ وہ محرم ۱۲۴۵ھ (جولائی ۱۸۲۹ء) میں مدراس پہنچے اور چند ہی مہینوں میں مسلمانانِ مدراس میں زبردست دینی انقلاب پیدا کر دیا، جس کی پوری کیفیت ''تنبیہ الضالین'' سے معنون

---

(۱) وقائع ص ۵۰۶۔

ہو سکتی ہے۔ (۱)

مولوی ولایت علی عظیم آبادی

مولوی ولایت علی عظیم آبادی کے متعلق راویوں کا بیان ہے کہ سید صاحب کے تعلق میں ان کی حیثیت وہی تھی، جیسے مردہ غسال کے ہاتھ میں ہو:

> ”کوئی کارِ دشوار حضرت ان کو فرماتے، حیلہ یا عذر و انکار جانتے ہی نہ تھے، نہ اپنی رائے کو کسی امر میں دخل دیتے، بلکہ اکثر اوقات فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے امرِ دین میں سید صاحب کو طبیبِ حاذق کیا ہے۔ ہمارے نفع و ضرر کو وہی خوب سمجھتے ہیں۔ جس کو جو مناسب جانتے ہیں، وہ کار فرماتے ہیں۔“

مولوی سید محمد علی کی طرح انہیں بھی اپنی ٹوپی، کرتا، پاجامہ پہنا کر سینے اور پشت پر ہاتھ پھیرا اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے۔ وصیت فرمائی کہ کلمۂ حق کے بیان میں کسی کا خوف اور ملاحظہ خاطر میں نہ لانا۔ سید کرامت اللہ، مولوی عبدالقادر اور مولوی عبدالواحد کو ان کے ہمراہ کر دیا۔ یہ تینوں مولوی صاحب کے ہم وطن تھے۔ (۲)

ان کے کام کی مفصل کیفیت بھی الگ بیان ہوگی۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ دعوت و تبلیغ سے انہوں نے ہزاروں مسلمانوں کو راہِ حق پر لگا دیا اور بہت سے آدمی ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے جن میں سکندر جاہ والیِ مملکت آصفیہ کے فرزند مبارز الدولہ گوہر علی خاں بھی شامل تھے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد مولوی صاحب دورہ کرتے ہوئے عظیم آباد پہنچے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ قریہ بہ قریہ وعظ فرماتے۔

مولوی عنایت علی عظیم آبادی

وقائع کا بیان ہے کہ سید صاحب نے مولوی صاحب ممدوح کو بلا کر فرمایا:

---

(۱) تنبیہ الضالین عن طریق سید المرسلین، قلمی نسخہ۔

(۲) وقائع ص: ۵۰۸-۹۔

> ''آپ کو واسطے ترغیب جہاد کے بنگال بھیجتے ہیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ حاضر ہوں مگر دل چاہتا ہے کہ یہاں کا بھی کوئی واقعہ دیکھ لیتا۔ آپ نے فرمایا کہ وہاں آپ کے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ کا کام بہت نکلے گا اور آپ کا وہاں رہنا واسطے کوشش کارِ خدا کے گویا ہمارے ساتھ یہاں رہنا ہے۔''(۱)

انہیں بھی عمامہ اور کرتا عنایت فرمایا اور انہیں کے رفیقوں میں سے چھ آدمی ہمراہ کر دیے۔ مولوی صاحب موصوف نے بنگال میں جو کارنامے انجام دیے وہ تفصیل سے ان کے حالات میں بیان ہوں گے۔ یہاں اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ مشرقی بنگال میں آج جو دینی روح نظر آ رہی ہے وہ مولوی صاحب موصوف ہی کی سرگرم کوششوں کا نتیجہ ہے۔

باقی اصحاب

باقی اصحاب میں سے مولوی محمد قاسم ساکن بمبئی کو وعظ و نصیحت اور دعوت و جہاد کے لیے روانہ کیا۔ (۲) حافظ قطب الدین کو ہندوستان بھیجا۔ (۳) سید اولاد حسن قنوجی کو بھی ارشاد و ہدایت ہی کی غرض سے واپس بھیج دیا تھا۔ چنانچہ ان کی زندگی کے تمام باقی اوقات اسی کام میں صرف ہوئے۔ اپنے بھانجے سید حمید الدین اور ان کے بھتیجے سید ابوالقاسم (بن سید احمد علی خواہر زادہ سید صاحب) کو بھی دعوت و تبلیغ و ارشاد ہی کیلئے میدانِ جنگ سے واپس کیا گیا تھا۔

نتائج

دعوت و تبلیغ کے انتظامات کا یہ سرسری مرقع ہے، جس کے حالات میں نے سیرت کے مختلف مآخذ سے اخذ کیے۔ سید صاحب نے ہندوستان کے طول و عرض میں احیائے

---

(۱) وقائع ص: ۵۰۹۔ (۲) وقائع ص: ۵۰۷۔ (۳) وقائع ص: ۵۰۹۔

دین و اسلامیت کا جو عظیم الشان کارنامہ تھوڑی سی مدت میں انجام دیا تھا وہ دعوت و تبلیغ ہی کی برکات کا ایک کرشمہ تھا، لہٰذا یقین ہے کہ یہ نظام بہت منظم اور وسیع ہوگا۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد بھی مدتِ دراز تک لوگ جہاد کی نیت سے سرحد پہنچتے رہے۔ کم از کم ۱۸۶۴ء تک اس سلسلے میں کوئی فرق نہ آیا اور یہ اس نظام کی پختگی کا طبعی نتیجہ تھا جو سید صاحب نے اپنی زندگی میں قائم کر دیا تھا۔ ۱۸۶۴ء میں جماعت کے اکابر گرفتار کر لیے گئے اور ان پر مقدمے چلے۔ پھر مقدموں کا قصہ کئی سال جاری رہا۔ اس کے بعد تحریک کی پہلی سرگرمی تو باقی نہ رہی تاہم مجاہدین اکا دکا برابر سرحد پہنچتے رہے اور یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب انگریز ہندوستان سے رخصت ہو گئے۔

نواں باب:

مالی انتظامات

ابتدائی دور

سید صاحب نے راہِ ہجرت میں قدم رکھنے کے وقت تہ خانے سے جمع شدہ رقم نکلوائی تو دس ہزار روپے نکلے۔ آپ نے پانچ ہزار ازواج کے حوالے کر دیے جو آپ کے بعد ہجرت کرنے والی تھیں، صرف پانچ ہزار اپنے لئے رکھے۔ یہ روپے چھوٹی تھیلیوں میں ڈال کر انہیں مختلف مجاہدین کی کمروں میں باندھ دیا۔ گویا ہندوستان کی تطہیر کیلئے اٹھے تھے تو صرف پانچ ہزار روپے اور تقریباً ساڑھے پانسو مجاہد ہمراہ تھے۔ یہ سروسامان ایسا نہ تھا کہ کسی بھی شخص کے نزدیک قابل توجہ قرار پاتا، لیکن سروسامان کی فرومائیگی اربابِ عزیمت کی عناں گیر کبھی نہ ہوئی۔ وہ ہمیشہ فرض کی پکار پر سر بکف میدانِ عمل میں پہنچتے رہے۔ پھر جو کچھ انہیں پیش آیا ہمیشہ شکر و صبر سے قبول کیا۔

ازواج کو پانچ ہزار اس غرض سے دیے تھے کہ انہیں نہایت کٹھن سفر درپیش تھا اور کچھ معلوم نہ تھا کہ منزلِ مقصود کون سی ہے اور اس پر پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا۔ یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ عالمِ غربت میں زندگی کے دن کیوں کر بسر ہوں گے۔ اغلب ہے کہ سید صاحب کے نیازمندوں نے بیبیوں کی خدمت میں بھی کچھ رقمیں بہ طور نذر پیش کی ہوں، تاہم اس مقدس خاندان کی شانِ ایثار و قربانی کے سلسلے میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ جب بیبیوں کو سندھ پہنچ کر لشکر اسلام کی عسرت کا علم ہوا تو انہوں نے دس ہزار روپے کی رقم ہنڈیوں کی شکل میں حاجی بہادر شاہ خاں کے ہاتھ سید صاحب کے پاس بھیج دی:

ویں سلسلہ از طلائے ناب است ✿ ایں خانہ تمام آفتاب است

متفرق تحائف

سید صاحب کے نیاز مند قصد ہجرت کے ساتھ ہی مختلف قسم کے تحائف پیش کرنے لگے۔ مثلاً گھوڑے، تلواریں، بندوقیں، کپڑے، خیمے، برتن، قلمی قرآن اور نقد روپے۔ یقین ہے کہ گوالیار و ٹونک کے والیوں اور اکابر نے بھی خاصی بڑی رقمیں پیش کی ہوں گی۔ لیکن راستہ بہت کٹھن اور طویل تھا، پانچ چھ سو آدمی تھے، لہٰذا خرچ بھی خاصا ہوتا ہوگا۔ ایک ہزار روپے، ایک بندوق اور تمنچوں کی ایک جوڑی امیرانِ سندھ نے پیش کیا۔ اس کے بعد دورانِ سفر میں صرف امرائے کابل سے کچھ رقمیں ملی ہوں گی، بس یہی سروسامان تھا، جس کی بنا پر سید صاحب نے ۲۰ دسمبر ۱۸۲۶ء کو جہاد کا آغاز کیا۔

سرحد کے حالات

سرحد میں پہنچنے کے بعد وقتاً فوقتاً دعوتیں تو ہوتی رہیں لیکن نظر بظاہر نقد روپیہ کہیں سے نہ ملا۔ جنگ شیدو سے پیشتر اور بعد مجاہدین پر بڑی عسرت کا زمانہ گذرا، یہاں تک کہ ایک موقع پر زیادہ سے زیادہ مٹھی بھر جوار روزانہ ہر مجاہد کو ملتی تھی اور بعض اوقات وہ درختوں کے پتے ابال کر کھاتے رہے۔

جب ہندوستان سے مجاہدین پہنچنے لگے تو کچھ روپے اور سامان سید صاحب کے پاس جمع ہوا۔ اس دور میں ایک مصیبت یہ تھی کہ سید صاحب جو انتظام فرما کر سرحد گئے تھے، اس کے مطابق ہنڈیاں پشاور کے ساہوکاروں کے نام پہنچنے لگیں۔ پشاور کے سرداروں نے ان ہنڈیوں کا روپیہ رکوا دیا۔ آخر بڑی پریشانیاں اٹھانے کے بعد منارہ کے ساہوکاروں سے ربط پیدا کیا گیا جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، وہاں کے دو ساہوکاروں کے نام روایتوں میں آئے ہیں: ایک موتی، دوسرا سنتو۔ یہ سو روپے کی ہنڈی پر بارہ روپے منتی لیتے تھے، یعنی سید صاحب کو سو روپے کے صرف اٹھاسی روپے ملتے تھے۔ ان مشکلات کو

صبر سے برداشت کر لینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ قیامِ خمر کے زمانے میں ایک مرتبہ تنگی اس حد پر پہنچ گئی کہ مجاہدین نے سید صاحب کی اجازت سے اجرت پر گنے چھیلنے کا کام شروع کر دیا۔ اجرت کے علاوہ ہر شخص کو آٹھ آٹھ دس دس گنے بھی مل جاتے تھے۔

دورِ کشائش

جب منارہ میں ہنڈیوں کا انتظام ہو گیا تو روپیہ پہنچنے لگا۔ چنانچہ سید صاحب نے امام زئی پر پیش قدمی کی تھی تو ان کے پاس تیس پینتیس ہزار روپے نقد جمع تھے۔ ان میں سے پانچ ہزار کی رقم ساتھ لے لی گئی۔ باقی روپیہ ٹوپی میں محفوظ مقام پر دفن کر دیا گیا۔ امان زئی سے واپسی پر یہ روپیہ نکالا گیا۔

خمر سے مراجعت پر نظام شرعی کے اجراء کیلئے دو مرتبہ پنجتار میں عظیم الشان اجتماع ہوا اور دونوں مرتبہ کم و بیش اڑھائی ہزار آدمیوں کیلئے کھانے کا انتظام کرنا پڑا۔ یہ خرچ سید صاحب کے بیت المال ہی سے ہوا۔

کشائش کا مستقل انتظام اس وقت سے ہوا جب قاضی سید محمد حبان نے عشر کا انتظام کر دیا۔ لیکن یہ سلسلہ صرف چند مہینے قائم رہا۔ پھر مجاہدین کے خلاف سازشِ قتل کے بعد سید صاحب پشاور کے میدانی علاقے سے کشمیر کی جانب چلے گئے اور راستے میں بالاکوٹ کی جنگ پیش آئی۔

خطوط کی شہادت

مختلف خطوں میں متفرق ہنڈیوں کی رسیدیں درج ہیں۔ مثلاً:

صفحہ	ہنڈی
۱۶۷ کا مکتوب	دو ہزار پانسو
۱۸۷ کا مکتوب	دو ہزار چار سو

۳۱۲ کا مکتوب	سات سو
۳۳۳ کا مکتوب	ساڑھے چار ہزار
۳۳۶ کا مکتوب	چار ہزار ایک سو پچاس
۳۳۷ کا مکتوب	سات ہزار نو سو پچاس (۱)

یہ اعداد صرف چند مکاتیب سے ماخوذ ہیں۔ یقین ہے کہ ایسے اور مکاتیب بھی ہوں گے جو میرے علم میں نہ آسکے، یا ضائع ہو گئے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ رقمیں ایسی نہیں، جنہیں سکھوں اور انگریزوں جیسی جنگی قوتوں کے خلاف جہاد کے سلسلے میں قابل ذکر سمجھا جائے۔ بایں ہمہ سید صاحب نے انہیں وسائل کی بنا پر وہ کارنامے انجام دیے جو ہمیشہ جریدۂ عالم کے صفحات کی زینت بنے رہیں گے۔

میاں دین محمد کا بیان

میاں دین محمد سید صاحب کے خاص خادم اور معتمد علیہ قاصد تھے اور وقتاً فوقتاً اس غرض سے ہندوستان آتے رہتے تھے کہ سید صاحب کے نیاز مندوں اور مقرر کیے ہوئے مرکزوں سے روپیہ جمع کر کے سرحد لے جائیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ واقعہ بالاکوٹ کے وقت میں شاہ اسحٰق کے پاس دہلی میں تھا اور اس وقت میرے پاس چوبیس ہزار روپے تھے۔ ان میں سے اڑھائی ہزار ہنڈی کی شکل میں سید صاحب کے اہل و عیال کیلئے سندھ بھیج دیے۔ (۲)

حیات النساء بیگم کا واقعہ

حیات النساء بیگم بنارس کی ایک مسلمان خاتون تھیں، جس نے آگسٹس بروک نامی ایک انگریز سے شادی کر لی تھی۔ پھر وہ انگریز سے علیحدہ ہو کر سید صاحب کے حلقۂ

---

(۱) صفحات کے حوالے اس مجموعہ مکاتیب کے ہیں جسے میں مکاتیب شاہ اسمٰعیل کے نام سے تعبیر کرتا ہوں۔

(۲) وقائع ص: ۵۲۶۔

ارادت میں داخل ہو گئی۔ اس نے ہزاروں روپے نقد، ہزاروں کا مال اور مکان سید صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ نے یہ نذر قبول نہ کی اور فرمایا کہ مال خبیث ہے۔ پھر حکیم سلامت علی خاں، مولوی غلام یحییٰ، میرزا کریم اللہ بیگ اور مولوی عبدالقادر نے مل کر دس ہزار روپے جمع کیے اور دو سو روپے ماہانہ کرانے پر ایک مکان لے کر حیات النساء بیگم کی طرف سے تجارت شروع کر دی۔ اس میں بہت نفع ہوا۔ اس نفع میں سے پانچ ہزار کی رقم میاں دین محمد کی خدمت میں پیش کی گئی۔ انہوں نے بھی قبول نہ کیا اور کہا کہ بے اجازت نہیں لے سکتا۔

شاہ اسحٰق اور شاہ یعقوب کے موسومہ ایک مکتوب میں بھی حیات النساء بیگم کا ذکر ہے۔(۱) میاں دین محمد نے سفر سے واپس جا کر سید صاحب سے اس امر کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ اچھا کیا، لیکن یہ روپیہ لے لینے میں کچھ حرج نہ تھا۔

پانچ ہزار کی تقسیم

میاں دین محمد پھر ہندوستان آئے تو پانچ ہزار روپے لے لیے۔ ان میں سے اڑھائی ہزار سید صاحب کے حکم کے مطابق مختلف اصحاب میں تقسیم کر دیے۔ کچھ مدت بعد حیات النساء کا انتقال ہو گیا، ساتھ ہی تجارت کا کاروبار بگڑ گیا۔ میاں دین محمد نے باقی رقم بھی مختلف مجاہدوں کے اہل و عیال اور متعلقین میں بانٹ دی۔ بیت المال میں سے ان مجاہدین کی بھی امداد کی جاتی تھی جن کے پاس سرحد تک سفر کیلئے کوئی سرمایہ نہ ہوتا تھا اور ضرورت مند مجاہدین کے اہل و عیال کی امداد کے حالات تو پیش کیے ہی جا چکے ہیں۔ یہاں یہ حقیقت بھی واضح کر دینی چاہیے کہ ان مجاہدین نے خود کبھی کوئی رقم نہ مانگی، سید صاحب اپنی معلومات کی بنا پر جو کچھ کسی کو دینا مناسب سمجھتے تھے دے دیتے تھے۔

---

(۱) "مجموعہ مکاتیب شاہ اسمٰعیل" قلمی نسخہ ص ۱۲۷۔

ضروری گزارش

فراہمی زر و مال کی اس سرگزشت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سید صاحب نے کتنی تھوڑی رقم سے تمام تنظیمات کیں۔ یہ روپے زیادہ تر عام مسلمانوں سے ملے تھے۔ عوام کا طریقہ یہ تھا کہ ہر گھر میں ایک گھڑا رکھا رہتا، کھانا پکانے کے وقت مٹھی بھر چاول یا کوئی دوسری جنس اس میں ڈال دی جاتی۔ ہفتے کے بعد یہ جنس جمع کر کے فروخت کر دی جاتی۔ مخابرت کے جو وسائل آج کل موجود ہیں، یہ اس زمانے میں موجود نہ تھے، لیکن دیکھئے کس طرح مالی انتظامات اس درجہ کمال پر پہنچا دیے تھے کہ ایک حبہ بھی کہیں ضائع نہ ہوتا تھا۔

ہمارے زمانے کے جماعتی نظاموں میں عوام کا جمع کیا ہوا روپیہ کم تر ہی محفوظ رہا یا صحیح مقاصد پر صرف ہوا، لیکن سید صاحب کے نظام میں چھوٹی چھوٹی رقمیں مختلف دیہات و قریات سے بالکل محفوظ بڑے مرکزوں میں پہنچتی تھیں۔ وہاں سے منزل بہ منزل سرحد پہنچائی جاتی تھیں۔ یہ نظام ۱۸۶۴ء تک اعلیٰ پیمانے پر جاری رہا اور ہمارے زمانے میں بھی اس دینی نظام کا مالی حصہ ہر خلل سے پاک تھا۔ سوا سو سال کی مدت میں معمولی سی خیانت کی بھی کوئی شکایت پیش نہ ہوئی۔ ایک مقام سے دوسرے مقام پر رقمیں پہنچانے والے لوگ سارا کام فی سبیل اللہ انجام دیتے تھے اور پائی تک اجرت نہ لیتے تھے۔ خالص دینی نظام ہی اس امتحان میں پورا اتر سکتا تھا اور سید صاحب نے اس نظام کی دینی بنیادیں ہر لحاظ سے پختہ و استوار کر دی تھیں۔

دسواں باب:

جماعت کی اسلامی اور اخلاقی شان

(۱)

کہوں کیا لوائے امامت کا اوج ۞ کہ ہیں غوث و ابدال سب اہل فوج

اسلامیت کا لبِ لباب

جماعت کی اسلامی اور اخلاقی شان اسی سے ظاہر ہے کہ جب اہل سمہ نے خفیہ سازش کر کے بہت سے مجاہدین کو جابجا شہید کر دیا تو سید صاحب نے فرمایا تھا کہ ان شہداء میں سے ہر ایک اپنے وطن کی انسانیت کا ”خلاصہ“ اور اسلامیت کا ”لب لباب“ تھا۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان کے آسمان نے ایسا کوئی لشکر نہ دیکھا جو علم وفضل، زہد وتقویٰ، حب وحمیتِ اسلام، شجاعت وجوانمردی، ایثار وفداکاری اور بے غرضی وبے نفسی میں سید صاحب کے لشکر کا نمونہ ہوتا۔ اس لشکر میں قرآن کے حافظ، مفسر، محدث، فقیہ، صوفیائے کرام ہر مذاق ومشرب کے اصحاب شریک تھے۔ جنہیں اپنے حلقوں میں عزت کے بلند مراتب حاصل تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے بچپن ہی سے امارت وریاست کی آغوش میں تربیت پائی، لہٰذا جسمانی تکلیف کا تصور بھی دماغ میں قائم نہ کر سکتے تھے، لیکن سید صاحب کی دعوت وتربیت نے ان میں ایسا جذبۂ صادقہ وراسخہ پیدا کر دیا کہ وطن، اہل وعیال، اعزہ واقارب اور وسائل راحت و

عزت کو ترک کر کے انتہائی تکلیفوں کی زندگی بخوشی گوارا کر لی۔

ان کی رگوں میں دوڑنے والے خون کی سب سے بڑی بے قراری یہ تھی کہ راہِ حق میں بہہ کر احیاءِ اسلامیت کا موجب بنے۔ کمال یہ ہے کہ سید صاحب کے ساتھ تعلق پیدا ہونے سے پیشتر یہ تمام اصحاب بالکل ویسی ہی زندگیاں بسر کرتے تھے، جو ہندوستان کے مسلمانوں کو عموماً میسر تھیں۔ لیکن سید صاحب کی دعوتِ حق اور ان کی حقانی تربیت نے ان لوگوں کی کایا ہی پلٹ دی، اور وہ راہِ خدا کے ایسے مجاہد بن گئے کہ اسلامی ہند کی تاریخ میں ان کی مثالیں شاید ہی مل سکیں۔ سید صاحب کی تربیت اور مردم گری کے یگانہ کمال کی اس سے بڑی شہادت کیا ہو سکتی ہے؟

للّٰہیت کی شان

سید صاحب خود ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> "ما مردم بنابر امتثال احکام رب العلمین و احیاء سنت سید المرسلین ترک اہل و عیال خود گزیدیم و مہاجرت اخوان و اوطان ورزیدیم و جمیع ماسوی اللہ را پس پشت انداختیم و اطاعت و انقیاد و احکام رب العباد قبلہ ہمت ساختیم و علائق راسخہ کہ با فرزند و عیال و مال و منال و اوطان و اخوان می باشد از سویدائے قلب برکندیم و انواع رنج و تکالیف بر خود پسندیدیم و تعطیل و اہمال رائج گونہ در مقدمہ اقامت ایں رکن رکین و نصرت دین سید المرسلین بدوں توقع منفعتے از منافع دنیا روا نہ دیدیم و نیز پاسداری محبان قدیمی و اخوان صمیمی دریں مادہ کشیدیم۔ از ملاحظہ منافع و مضار جان خود دریں باب دست برداریم و از پاسداری ماسوی اللہ دریں راہ بیزار۔"(۱)

ترجمہ: ہم لوگوں نے رب العلمین کے احکام کی پیروی اور

---

(۱) "مجموعہ مکاتیب شاہ اسمٰعیل" قلمی نسخہ ص ۱۱۹۔

> سید المرسلین کی سنت کے احیاء کی خاطر اہل وعیال کو چھوڑا۔ بھائی بندوں اور وطنوں سے ہجرت اختیار کی۔ ہم نے خدا کے سوا ہر شئے کو پس پشت ڈالا اور خدا کے احکام کی اطاعت وفرمانبرداری کو اپنا نصب العین بنایا۔ انسان کو بال بچوں، اہل وعیال، مال ومنال، وطنوں اور بھائی بندوں سے جو مضبوط رشتے ہوتے ہیں، وہ سب دل کی گہرائیوں سے نکال کر باہر پھینک دیے۔ طرح طرح کے رنج اور تکلیفیں اپنے لیے پسند کی ہیں۔ رکن اعظم کے قیام اور سردار انبیاء کے دین کی تائید میں کسی قسم کی سستی اور کوتاہی گوارا نہ کی۔ دنیوی فائدوں میں سے کسی فائدے کی امید ہم روا نہیں رکھتے۔ قدیم دوستوں اور مخلص بھائیوں کی پاس داری چھوڑ دی۔ اپنی جان کے نفع ونقصان سے بھی دست بردار ہو گئے اور اس راہ میں خدا کے سوا ہر شئے کی پاسداری سے ہم بیزار ہیں۔

یہ سب کچھ زبان سے کہہ لینا چنداں مشکل نہیں، لیکن جس بزرگ نے یہ سب کچھ فرمایا وہ اپنے اصل نصب العین کیلئے ایک ایک دنیوی رشتے کو بے پروائی سے توڑ چکا تھا اور ماسوی اللہ سے کامل بے تعلقی کی کٹھن منزل طے کر کے اس مقام پر پہنچا ہوا تھا، جہاں سے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی یہ کیفیت بیان کی۔

سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع

ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں کہ میرے پاس امراء وسلاطین کی طرح درہم ودینار کے خزانے نہیں، میرا خزانہ توکل علی اللہ ہے۔ ہر روز ربانی خزانے سے میرے لیے خرچ پہنچ جاتا ہے:

> ”طریقہ من طریقہ جد خود سید المرسلین است، یک روز نان خشک سیری خورم وشکر خدا بجای آرم ویک روز گرسنہ می مانم وصبری کنم۔ لشکر من ہمیں چندے از مہاجرین صادقین است کہ بنا بر مجرد خدمت دین رب العالمین کمر بستہ واز طرف خود جان خود را بہ کشتن دادہ، حق جل وعلا ایشاں را بہ منصب

شہادت سرفراز کند یا بہ نصرت و فتح موفق گرداند۔ بالجملہ حال ظاہرۂ ما حال فقراء و مہاجرین است کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم و اصحاب ایشاں را در اوائل زمان ہجرت در پیش بود۔‘‘(۱)

ترجمہ: میرا طریقہ وہی ہے جو میرے نانا سردار انبیاء نے اختیار فرمایا۔ ایک روز سوکھی روٹی پیٹ بھر کر کھا لیتا ہوں اور خدا کا شکر بجالاتا ہوں ایک روز بھوکا رہتا ہوں اور صبر کرتا ہوں، میرا لشکر انہیں چند مخلص مہاجرین پر مشتمل ہے جنہوں نے محض رب العلمین کے دین کی خدمت کیلئے کمر باندھی اور اپنی طرف سے جانیں راہ خدا میں قربانی کیلئے پیش کردیں۔ دعاء ہے کہ خدا انہیں منصب شہادت سے سرفرازی بخشے یا فتح و نصرت کی توفیق عطا فرمائے۔ غرض ہمارا ظاہری حال ان فقیروں اور صابروں کا سا ہے جس سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ہجرت کے ابتدائی زمانے میں سابقہ پڑا تھا۔

راہِ رضا

سید صاحب اور انکے رفیقوں کے پیش نظر اعلائے کلمۃ اللہ اور رضائے باری تعالیٰ کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کے نزدیک بیعت کا مقصود یہی تھا کہ خدا کی رضا حاصل ہو۔ فرماتے ہیں:

’’مقصود از بیعت بردست مشائخ طریقت ہمیں است کہ راہِ رضا مندی حضرت حق بدست آید و راہِ رضا مندی حضرت حق منحصر در اتباع شریعت غرا است۔ ہر کہ سوائے شریعت مصطفویہ طریق تحصیل رضا مندی حق انگارد، پس بے شک آں شخص کاذب و گمراہ است و دعوائے او باطل و نامسموع، و اساسِ شریعت مصطفوی دو امر است اول ترک اشراک و ثانی بدعات۔‘‘(۲)

ترجمہ: مشائخ طریقت کے ہاتھ پر بیعت کا مقصود صرف یہ ہے کہ

---

(۱) ’’مجموعہ مکاتیب شاہ اسمٰعیل‘‘ قلمی نسخہ ص:۱۸۲۔ (۲) ’’مجموعہ مکاتیب شاہ اسمٰعیل‘‘ قلمی نسخہ ص:۸۱۔

> خدا کی رضا حاصل ہو اور خدا کی رضا روشن شریعت کی پیروی پر موقوف ہے۔ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے سوا رضائے حق حاصل کرنے کا قائل ہے، وہ جھوٹا اور گمراہ ہے، اس کا دعویٰ باطل ہے اور سننے جانے کے لائق نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی بنیاد دو باتیں ہیں: ایک ترکِ اشراک، دوسری ترکِ بدعات۔

پھر دونوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ترکِ اشراک یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کو مشکلوں اور بلاؤں کا دور کرنے والا نہ سمجھا جائے۔ نبی، ولی، صالح لوگ اور فرشتے خدا کی بارگاہ کے مقبول ہیں، خدا کی رضا حاصل کرنے میں ان کی پیروی کرنی چاہیے۔ اس راہ میں انہیں اپنے پیشوا ماننا چاہیے۔ انہیں زمانی حوادث پر قادر ماننا یا عالم السر جاننا ہرگز مناسب نہیں۔

ترکِ بدعات یہ ہے کہ تمام عبادات، معاملات نیز معاشی اور معادی امور میں انبیاء کے خاتم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے پر مضبوطی اور اولوالعزمی سے قدم جمالیے جائیں۔ دوسرے لوگوں نے جو نئی رسمیں پیدا کر لی ہیں، ان سے دور رہنا چاہیے۔

سید صاحب نے جماعت کی تاسیس و تنظیم انہیں اصول پر کی تھی اور اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ جماعت ہر منزل اور ہر مرحلے میں انہیں اصول کا عملی مرقع بنی رہی۔

اخلاص فی العمل

نواب وزیر الدولہ نے لکھا ہے: سید صاحب جماعت مجاہدین کو ہمیشہ تاکید فرماتے رہتے تھے کہ کبھی نفس و شیطان کے تقاضے کی بنا پر میدانِ کارزار میں قدم نہ رکھنا:

> "بہ رحمت حضرت جہاں پناہ جل ذکرہ آں سپاہ تقویٰ دست گاہ را اخلاص فی العمل بہ آں مرتبہ شدہ بود کہ اگر بجائے للّٰہی یک یک سپاہی از آں لشکر

> ظفر اعتباہی بہ قلم آید دفترے باید غیر متناہی کہ رقمش بہ انجام رسد۔"(۱)

> **ترجمہ**: خدا کی رحمت سے اس تقویٰ شعار سپاہ کا اخلاص اس مرتبے پر پہنچا ہوا تھا کہ اگر ایک ایک سپاہی کی للّٰہیت کے محاسن تحریر کیے جائیں تو انہیں پورا کرنے کیلئے لامتناہی دفتر چاہیے۔

جنگ اتمان زئی سے پیشتر تمام مجاہدین کو ہدایت کردی گئی تھی کہ جو لڑے اور مقابلہ کرے اس سے لڑو، جو امان طلب کرے اسے امان دے دو۔

سید صاحب کے نزدیک بندگی کا معیار یہی تھا کہ ہر شئے خدا کی رضا کیلئے قربان کردی جائے۔ وہ فرماتے ہیں:

> "بندہ کہ در مقابلہ اعدائے مولائے خود غیرت وحمیت نمی دارد، فی الحقیقت بندہ نیست ومحبّ کہ جان ومال وعزت وآبروئے خود را در تحصیل رضائے محبوب خود نگاہ دارد فی الحقیقت محب نے۔"(۲)

> **ترجمہ**: جس بندے کے دل میں اپنے آقا کے دشمنوں کے خلاف غیرت وحمیت کی حرارت پیدا نہ ہو، وہ بندہ نہیں۔ اور محبت کا جو دعویدار محبوب کی خوشنودی کیلئے جان ومال اور عزت وآبرو قربان کردینے میں دریغ کرے اس کا دعوائے محبت بے اصل ہے۔

ایک اہم اصل

جماعت کی تربیت میں سید صاحب کے پیش نظر ایک اہم اصل تھی، جس کا ذکر سید جعفر علی نقوی نے یوں کیا ہے:

> "مسلمان را می باید کہ در مقام خواہش نفسانی ومشتہیات آں مثل طعام لذیذ وشیرینی وانواع فواکہ دیگر برادران مسلمین را بر نفس تقدیم دہد وخود از آنہا

---

(۱) "وصایا" حصہ دوم ص:۵۹۔ (۲) "مجموعہ مکاتیب شاہ اسمٰعیل" قلمی نسخہ ص:۱۰۹۔

موخر شود، و روا ندارد کہ زیادہ از ایشاں بہ حظوظ نفسانی محظوظ گردد، بلکہ دریں امر کمی بہ جانب خویش پسند نماید و در مقام رنج و تکلیف نفس خود را بر دیگراں مقدم سازد و آمدن بلا و تکلیف بر آنہا نہ پسندد۔"(۱)

ترجمہ: مسلمان کو چاہیے کہ لذیذ کھانوں، میٹھی چیزوں یا قسم قسم کے میووں وغیرہ کے سلسلے میں جن کی خواہش ہر شخص کو ہوتی ہے، دوسرے مسلمان بھائیوں کو اپنے آپ پر مقدم رکھے اور خود پیچھے رہے، اس کیلئے مناسب نہیں کہ حظوظِ نفسانی میں دوسروں سے زیادہ حصہ لیجائے۔ بلکہ ایسے معاملات میں اپنے لئے کمی پسند کرنی چاہیے۔ جب رنج و تکلیف کا موقع پیش آجائے تو اپنے آپ کو دوسروں سے آگے رکھے اور ان پر بلا و تکلیف کا آنا پسند نہ کرے۔

تسلیم و توکل

سید صاحب نے اس تعلیم و تربیت کا عملی نمونہ پیش کر دیا۔ جب وہ سرحد پہنچے تھے تو اہل سرحد میں سے اکثر رؤسا نے ان کی دعوت قبول کر لی تھی۔ مثلاً غلزئی، ننگر ہاری، شنواری، آفریدی، مہمند، خلیل، خٹک، مندڑ، تنولی، ان کے علاوہ کشمیر کے رئیسوں اور سوات، بنیر، باجوڑ اور پکھلی کے باشندوں نے امداد کے پختہ وعدے کر لیے تھے۔ سید صاحب اس کامیابی کو محض اللہ کا فضل قرار دیتے تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"ہزار شکر بجامی آرم و بر حال خود تعجب می نمایم کہ ایں ذرۂ بے مقدار و عاجز خاکسار را بہ ایں نعمت عظمیٰ و عطیہ کبریٰ موفق گردانید یعنی جان و مال ایں ضعیف و ناتواں بے سر و ساماں را بہ موقف قبول خود رسانید، عجب تر آنکہ در تمامی ایں کاروبار دہمگی ایں نشیب و فراز دل اخلاص منزل بہ اعتماد توکل مشحون دارم و بہ رضا و تسلیم مقرون۔ سینہ صفا گنجینہ از آرزوے انقیاد احکام رب العباد مالامال است و از نشیب و فراز زمانہ مبرا۔"(۲)

---

(۱) "منظورہ" ص:۱۰۵۶۔　　(۲) "مجموعہ مکاتیب شاہ اسمٰعیل: قلمی نسخہ ص:۱۹۲-۱۹۳۔

ترجمہ: ہر روز خدا کا شکر بجا لاتا ہوں۔ اپنے حال پر تعجب ہوتا ہے کہ مجھ بے حقیقت ذرے اور مجھ خاکسار عاجز کو اس بڑی نعمت اور اس عظیم عطیئے سے سرفرازی بخشی گئی۔ یعنی مجھ ضعیف، کمزور اور بے سروسامان کے جان ومال کو اللہ تعالیٰ نے درجۂ قبول بخشا۔ اس سے بھی عجیب تر امر یہ ہے کہ اس کاروبار اور اونچ نیچ میں میرا دل توکل سے لبریز ہے اور تسلیم ورضا سے ہم کنار۔ میرا سینہ احکامِ الٰہی کی پیروی کے جذبے سے مالا مال ہے اور زمانے کے نشیب وفراز سے بالکل پاک۔

ان اقتباسات سے جماعت کی عمومی حیثیت کا صحیح اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ آئندہ باب میں تعلیم وتربیت کے باقی انوار ملاحظہ فرمالیجئے۔

سید صاحب کا نمونہ

تسلیم وتوکل اور اللہ کی رضا میں ماسوی اللہ سے روگردانی کا جو ایمان افروز نقشہ خود سید صاحب نے پیش کیا تھا، اس کی مثالیں تاریخ میں حد درجہ کمیاب ہیں۔ مثلاً راہِ ہجرت میں قدم رکھتے ہی وہ ازواج واولاد سے الگ ہو گئے۔ پھر اس دنیا میں ان سے ملاقات مقدر نہ تھی۔ اس کے بعد ان کے چند قریبی رشتہ دار ساتھ رہے۔ مثلاً سید احمد علی، ان کے صاحبزادے سید موسیٰ، سید ابو محمد، سید ابوالحسن۔ یہ سب ان کی زندگی میں یا ان کے ساتھ شہید ہوئے۔ ان کی دونوں بیویاں اور بعض اقربا سندھ میں رہے۔ بیویوں نے وطن بدیں غرض چھوڑا تھا کہ سید صاحب کے پاس پہنچ جائیں، لیکن پیرکوٹ کے بعد نہ آگے جانے کی کوئی صورت پیدا ہوئی اور نہ لوٹ سکتی تھیں۔ کچھ اقربا اسی نیت سے گھر بار چھوڑ کر نکلے اور ٹونک سے آگے نہ بڑھ سکے، باقی وطن ہی میں رہے۔ بعد ومفارقت کی سرگزشت بیان کر لینا سہل ہے لیکن انسان کیلئے اپنے اوپر وارد کرنا سہل نہیں۔ عشق حق میں انتہائی استقامت کے بغیر یہ منزل طے نہیں ہو سکتی۔

پھر مخابرت کا مسئلہ بہت دشوار اور مصیبت خیز تھا اور ایک دوسرے کے متعلق پریشانی

کی خبریں سن کو دلوں پر جو گذرتی ہوگی اس کا صحیح اندازہ کون کر سکتا ہے؟ ایک مرتبہ ایک معتمد علیہ قاصد نے بیویوں کو ایسی خبریں سنا دیں جن کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ وہ رنج و غم میں مبتلا ہو جائیں۔ سید صاحب کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو لکھا کہ ہم باطمینان اپنے کام میں مشغول ہیں، تشویش یا قلق کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر آپ کو صرف اس بات پر قلق ہوا کہ:

> ”گزران ما مساکین از ہجوم اعدائے کفار و منافقین در کمال ضیق است و باب جہاد ہنوز مفتوح نہ شدہ و ہیچ راہ مقصود کشادہ نہ گردیدہ و محض بے سروسامان درمیان کوہستان گردش می کنیم، پس این معنی را موجب رنجش خود ہا ہرگز نہ باید گردانید چہ کہ بہ اطاعت اللہ بحمد اللہ ہمیشہ خوش و بے غم بودہ ایم و گاہے تکلیف این راہ را تکلیف نہ شمردہ ایم۔“

ترجمہ: ہم مسکینوں کیلئے کافروں اور منافقوں کے ہجوم کے باعث عرصۂ حیات تنگ ہے۔ جہاد کا دروازہ ابھی کھلا نہیں اور مقصود کا راستہ صاف نہیں ہوا بلکہ بے سروسامانی کی حالت میں کوہستان کے درمیان چکر لگا رہے ہیں، تو اس پر قطعاً رنج نہ ہونا چاہیے۔ الحمد للہ کہ ہم اللہ کی فرماں برداری میں ہمیشہ خوش اور بے غم رہے ہیں اور اس راہ کی تکلیفوں کو کبھی تکلیفیں نہیں سمجھا۔

پھر فرماتے ہیں کہ ماسوی اللہ کے رشتوں میں آپ کے ساتھ جو رشتہ ہے وہ سب سے بڑھ کر عزیز ہے اور یہ رشتہ بھی صرف اس لئے عزیز ہے کہ خدا کی رضا کے تقاضوں میں شامل ہے۔

اطاعتِ رب العالمین کی لذت

ایک مکتوب میں بیویوں کو تحریر فرماتے ہیں کہ اگرچہ آپ کو سب کچھ معلوم ہے اور لکھنے کی حاجت نہیں لیکن محض تذکیر و نصیحت کے خیال سے لکھتا ہوں:

”آنچہ در اطاعت رب العالمین آرام و لذت است در چیز دیگر متصور

> سے نہ ہمیں راہ راست موجب سرخروئی دارین و بہبود نشأ تین و در چیز دیگر تکمیل
> ایں سعادت و اتمام ایں دولت نصیب نہ شود۔"
>
> **ترجمہ**: رب العالمین کی فرماں برداری میں جو آرام اور لذت ہے وہ کسی دوسری چیز میں متصور نہیں۔ یہی سیدھا راستہ دونوں جہاں کی سرخروئی اور بہتری کا باعث ہے۔ کسی دوسری چیز میں اس سعادت کی تکمیل اور اس دولت کا اتمام نصیب نہیں ہوسکتا۔

مہاجرات میں سید صاحب کی خوشدامن (سیدہ زہرہ کی والدہ ماجدہ اور سیدہ سائرہ کی نانی) بھی تھیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ وطن لوٹ جانے کا خیال ظاہر کیا۔ سید صاحب کو یہ بات معلوم ہوئی تو لکھا کہ پریشان نہ ہوں، اس راستے پر قدم نہ رکھیں جو خلاف ہے۔ تمام متعلقین کو تسلی دیں اور حق سبحانہ کی مخالفت وبال کا باعث ہوتی ہے:

> "بر ضمیر منیر آشکارا ست کہ ایں بندہ ضعیف را آنچہ علاقہ با خورد ان و بزرگان مے باشد محض للہ فی اللہ می باشد۔ پس اگر احدے از خورد ان و بزرگان مخالفت خدا لازم گیرد علاقہ او از دل اخلاص منزلم ہم بدر مے رود۔ لازم کہ بذریعہ استغفار ایں وسوسہ را از خاطر شریف بدر فرمودہ بہ تسلی و بہ تشفی دیگراں پرداز ند و اثبات قدم را بر خود صاحب و لازم سازند۔"
>
> **ترجمہ**: آپ پر روشن ہے کہ بڑے چھوٹے سے میرا جو تعلق ہے وہ صرف خدا کیلئے ہے۔ اگر ان میں سے کوئی خدا کے خلاف راستہ اختیار کرے گا تو میرے دل سے بھی اس کی محبت نکل جائے گی۔ ضروری ہے کہ آپ استغفار سے کام لیں اور یہ وسوسہ اپنے دل سے نکالیں۔ دوسروں کیلئے تسلی اور تشفی کا باعث ہوں اور اس راستے میں ثابت قدمی اپنے اوپر واجب و لازم بنالیں۔

یہی نمونہ تھا جس نے جماعت کے تمام افراد کو استقامت کی چٹانیں بنایا، ان کے دل عشقِ حق سے معمور ہوئے اور انہوں نے دین کی راہ میں قربانی کے وہ مرقعے پیش کیے جن کی مثالیں ہندوستان کی تاریخ میں حد درجہ کمیاب ہیں۔

گیارھواں باب:

جماعت کی اسلامی اور اخلاقی شان

(۲)

جماعت اور اس کا سرو سامان

سید صاحب نے راہِ ہجرت میں قدم رکھا تو ان کے رفیق پانچ چھ سو سے زیادہ نہ تھے۔ ان میں سے اکثر کے پاس بندوقیں اور تلواریں تو تھیں، توپ کوئی نہ تھی۔ اتنی چھوٹی جماعت اتنے تھوڑے سامان کے ساتھ تطہیرِ ہند کیلئے نکلی تھی۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ سپاہ اور سازو سامان کی کثرت کے بل پر جنگی قوت کا اندازہ کرنے کے عادی تھے، وہ سید صاحب کی فوج سے قطعاً متاثر نہ ہو سکتے تھے۔ یقین ہے کہ راستے کے اکثر رئیسوں نے اسی بنا پر سید صاحب کے اقدام کو کسی اہمیت کا مستحق نہ سمجھا۔ قندھار سے مزید مجاہدین مل گئے، ان سب کی تعداد زیادہ سے زیادہ ایک ہزار ہوگی۔ اسی سے جنگ کا آغاز ہوا۔ جب ہندوستان سے متعدد قافلے پہنچ گئے تو اندازہ یہ ہے کہ کل مجاہدین دو اڑھائی ہزار ہو گئے ہوں گے، اس سے تعداد کبھی نہ بڑھی البتہ جنگوں میں مقامی لوگ شریک ہوتے رہے، جو حملے کے وقت تعداد بڑھانے کے موجب بن جاتے تھے۔ لیکن استقامت کے موقع پر عموماً ساتھ چھوڑ جاتے تھے۔

فتوحات

تاہم یہ امر خاص توجہ کا مستحق ہے کہ اس مختصری فوج سے سید صاحب نے سرحد میں

سکھوں کیلئے حد درجہ نازک صورت پیدا کردی اور وہ بعض شرائط پر اٹک پار کا پورا علاقہ سید صاحب کو دے دینے کیلئے تیار ہوگئے۔ سید صاحب نے یہ پیش کش بے توقف ٹھکرا دی، اس لیے کہ ان کا نصب العین سلطنت یا ریاست نہ تھا بلکہ وہ ہندوستان کو غیروں کے تسلط سے پاک کر کے شرعی نظام جاری کرنا چاہتے تھے۔ جن لڑائیوں میں انہیں شاندار فتوحات حاصل ہوئیں، ان میں مجاہدین کی تعداد دشمنوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ مثلاً اکوڑہ کی جنگ میں سکھوں کی فوج پانچ ہزار اور دس ہزار کے درمیان تھی اور اس کے پاس پورا جنگی سامان موجود تھا۔ اس لشکر پر چھاپے کیلئے جو مجاہدین بھیجے گئے، ان میں سے صرف ایک سو چھتیس ہندوستانی تھے اور اسی قندھاری۔ کچھ کم سات سو مقامی لوگ تھے۔ جنگ کا سب سے بڑا بوجھ صرف مجاہدین نے اٹھایا اور شاندار فتح حاصل کی۔

زیدہ کی لڑائی میں یار محمد خاں کا لشکر آٹھ دس ہزار سے کم نہ تھا، تاہم صرف سات سو مجاہدین نے اسے شکست فاش دی۔ مجاہدین میں سے صرف دو شہید ہوئے اور چار زخمی۔
مایار کی لڑائی میں درانیوں کے چار ہزار پیادوں اور آٹھ ہزار سواروں سے مقابلہ تھا، مجاہدین صرف ساڑھے تین ہزار تھے اور میدان انہیں کے ہاتھ رہا۔

یہ واقعات یقیناً ایسے ہیں جن سے سید صاحب کی شانِ تربیت اور کمالِ مردم گری روزِ روشن کی طرح آشکارا ہے۔

کمالِ عجز وانکسار

پھر قابل توجہ امر یہ ہے کہ ان میں سے کسی بھی کارنامے پر مجاہدین کے دل میں غرور پیدا نہ ہوا۔ جنگ مایار کے بعد ہر شخص کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قوت وقدرت سے ہمیں زورآوروں پر فتح عطا کی جو ملک وخزائن کے مالک تھے، اور اطمینانِ قلب کا یہ حال تھا کہ زد وخورد جنگ میں وہ اس طرح شریک ہوتے، جیسے لوگ کسی

کے ہاں دعوتِ طعام کیلئے جاتے ہیں۔

سید صاحب نے ایک موقع پر تحریر فرمایا تھا:

> "الحمد للہ والمنۃ کہ مومنین صادقین را نہ در ہنگام فتح نخوت وغرورے بہم می رسد ونہ دروقت شکست تقاعد وفتورے۔"(۱)

> **ترجمہ**: اللہ تعالیٰ کا شکر اور احسان ہے کہ مخلص مومنوں کے دل میں نہ فتح کے وقت تکبر وغرور پیدا ہوتا ہے، نہ شکست کے وقت ان میں انتشار اور افسردگی آتی ہے۔

میدانِ جہاد میں انہیں گوناگوں مشکلات سے بھی سابقہ پڑا اور بعض اوقات شدید ضربیں بھی لگیں، تاہم نہ انہوں نے ہمت ہاری، نہ اپنی بے سروسامانی کے پیشِ نظر اصل کام سے کنارہ کشی اختیار کی۔ وہ جہاد کو ایک نہایت اہم اسلامی فرض سمجھتے تھے اور اس کی بجاآوری میں تادمِ آخر اسی طرح سرگرم و مستعد رہے جس طرح مخلص مسلمان نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسے فرائض ادا کرنے کے لئے مستعد رہتے ہیں۔

طریقِ زندگی

وہ سرحد پہنچے تھے تو معیشت کی تنگی بڑی پریشان کن تھی۔ ان میں سے شاید ہی کوئی ہو جو اپنے وطن میں راحت وآسائش کی زندگی بسر نہ کر چکا تھا۔ بعض بڑے بڑے رئیسوں کے لختِ جگر تھے۔ مثلاً میر فیض علی ابن میر ذوالفقار علی خاں رئیس گورکھپور، شیخ امجد علی ابن شیخ فرزند علی رئیس غازی پور، لیکن کوئی تکلیف ان کے عزم میں تزلزل پیدا نہ کر سکی۔ عام طریقہ یہ تھا کہ رات کے کھانے سے فراغت کے بعد نماز ادا کرتے۔ پہرے دار پہروں پر کھڑے ہو جاتے۔ باقی مجاہدین سید صاحب کے ارشادات سے مستفیض ہونے کے اشتیاق میں آپ کے پلنگ کے اردگرد بیٹھ جاتے۔ وہیں زمین پر سو رہتے۔ مولوی فتح علی

---

(۱) "مجموعہ مکاتیب شاہ اسمٰعیل"، قلمی نسخہ ص: ۵۵

فرماتے ہیں:

> ”حضرت کے پلنگ کے اردگرد اکثر لوگ آپ کی باتیں سننے کو رہا کرتے تھے، اور اس کثرت سے رہا کرتے تھے کہ کسی کا سر کسی کا پیر، کسی کا پیٹ اور کسی کی پیٹھ، جس نے جہاں کہیں جگہ پائی بے تکلف سو رہا۔(۱)

”منظورہ“ سے بھی اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے:

> ”از غایت بے تکلفی بستر جداگانہ و وضعیکہ اہل دنیا را باشد، نہ بود، بلکہ پائے یکے بہ سوئے سر دیگرے و پہلوئے کسے خلاف احدے گردید“۔

ترجمہ : بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ کسی کا الگ بستر نہ تھا اور اہل دنیا کے طور طریقوں سے وہ بالکل پاک تھے۔ ایک کا پاؤں دوسرے کے سر کی طرف اور کسی کا پہلو کسی کے خلاف ہوتا۔

نیکی میں سبقت

ہر شخص کی آرزو تھی کہ نیکی کے کاموں میں سب سے آگے رہے۔ اس کی بیسیوں مثالیں جابجا پیش کی جا چکی ہیں۔ امب کا ایک واقعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ مقام اس زمانے میں فتح ہوا تھا جب گندم کی فصل پکنے کے قریب تھی۔ سید صاحب نے اعلان فرما دیا تھا کہ اہل امب میں سے جو شخص چاہے، باطمینان واپس آکر اپنی فصل سنبھال لے۔ جو لوگ واپس نہ آئے، ان کی فصلوں کی دیکھ بھال مجاہدین کرنے لگے۔ فصل کٹ کر غلہ جمع ہو گیا۔ ابھی اٹھا کر قلعے میں نہ پہنچایا گیا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ سید صاحب نے مجاہدین کو غلہ اٹھانے کا حکم دیا۔ منشی بھی اس کام میں شریک ہو گئے۔ میر فیض علی گورکھپوری نے بھاری بوجھ اٹھا لیا اور انھیں بڑی تکلیف ہوئی۔ یہ حالت دیکھ کر سید صاحب نے منشیوں کو یہ خدمت معاف فرما دی۔ میر فیض علی پھر بھی اس کام میں لگے

---

(۱) ”وقائع“ ص: ۳۴۹۔

رہے۔ سید جعفر علی نے کہا کہ اب کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں؟ فرمایا:

> ہرچند فرضیت از ما ساقط شد، اما استحبابا برائے بجا آوری ایں کار می روم۔
>
> **ترجمہ**: اگرچہ یہ کام فرض نہ رہا، لیکن ایک پسندیدہ امر کی بجا آوری کے خیال سے جا رہا ہوں۔

"سیرت سید احمد شہید" میں یہ واقعہ تفصیلاً بیان ہو چکا ہے کہ ایک مرتبہ رات کے وقت شیخ بلند بخت شیخ محمد اسحٰق گورکھپوری کی تلاش میں آئے۔ سید جعفر علی نے کہا کہ وہ سرکاری گھی خریدنے کے سلسلے میں دن بھر پھرتے رہے، اب سو رہے ہیں، کہتے تھے کہ طبیعت اچھی نہیں مجھے جگایا نہ جائے۔ اگر کوئی ضروری کام ہو تو مجھے فرمائیے۔

شیخ بلند بخت نے فرمایا کہ پائندہ خاں کی زنبورکیں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں، انہیں لانا ہے۔ چنانچہ سید جعفر علی اسی وقت روانہ ہو گئے۔ ساری رات سفر میں گزاری، اگلے دن چاشت کے وقت تک تمام زنبورکیں لے آئے۔ سفر اتنا کٹھن تھا کہ سید جعفر کو بخار آ گیا۔ شیخ محمد اسحٰق گورکھپوری بار بار ان سے جھگڑتے تھے کہ جب حکم میرے نام آیا تھا تو آپ نے کیوں یہ تکلیف اٹھائی؟

عبدالمجید خاں آفریدی ساکن جہان آباد (رائے بریلی) کا واقعہ بھی "سیرت" میں بیان ہو چکا ہے۔ جنگ اکوڑہ کے موقع پر انہیں بخار آتا تھا اور خاصے کمزور ہو گئے تھے، اس وجہ سے سید صاحب نے انہیں جنگ کیلئے منتخب نہ فرمایا۔ وہ بیتابانہ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پرداز ہوئے:

> "حضرت! میں کچھ ایسا بیمار تو نہیں کہ چلنے کی طاقت نہ ہو اور پہلا محاربہ ہے، جس میں جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد رکھی جائے گی۔ میرا نام ضرور شامل فرما لیجیے، تاکہ سبقت کی فضیلت سے محروم نہ رہ جاؤں۔"

سید صاحب نے ان کا ذوق و شوق دیکھ کر خواہش پوری کر دی اور دعا کی۔ خان موصوف نے کمزوری کے باوجود چودہ آدمی اپنے ہاتھ سے قتل کیے۔ پھر ان کی تلوار ٹوٹ

گئی۔ مولوی امیرالدین ولایتی نے اپنی ایک تلوار انہیں دیدی۔ اس سے بھی کئی آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ آخر خود بھی خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوئے۔

شہادت یا منزل مراد

اقبالؒ نے لکھا ہے:

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن ❁ نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

اس شعر کی عملی تصویریں صرف جماعت مجاہدین میں ملتی ہیں۔ جو بھائی شہادت پاتا تھا، اس کے متعلق سب یہی کہتے تھے کہ وہ جو مراد لے کر خدا کی راہ میں وطن سے نکلا تھا، پوری ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رضامندی کی راہ میں صرف کر دے اور ہم سب سے راضی ہو۔

اہل ستہ کی غداری کے موقع پر مولوی خدا بخش رام پوری مینگی میں تھے۔ ایک ملا کی سعی و کوشش سے وہ اور چند دوسرے مجاہد محفوظ رہے۔ ایک روز وہ مینگی کے ملا سید محمد سے باتیں کر رہے تھے، مجاہدین کی مظلومیت کا ذکر چھڑ گیا تو ملا صاحب بے اختیار اشک بار ہوگئے۔ مولوی خدا بخش نے کہا:

> "ما برائے ہمیں شہادت از مقام دور دست آمدہ ایم۔ کسانیکہ شہید شدند بہ مراد خود رسیدند و کسانیکہ باقی اند ہمیں ارادہ دارند۔ اللہ تعالیٰ امام ما را سلامت دارد۔ ان شاء اللہ سامان جہاد باز مجتمع خواہد گردید۔"(۱)

ترجمہ: ہم شوقِ شہادت ہی لے کر دور دراز سے یہاں آئے تھے۔ جو لوگ شہید ہوئے وہ مراد کو پہنچ گئے، جو باقی ہیں ان کا ارادہ بھی یہی ہے کہ راہِ حق میں جانیں دے دیں۔ اللہ ہمارے امام کو سلامت رکھے۔ انشاء اللہ ان کی برکت سے پھر جہاد کا سامان جمع ہو جائے گا۔

---

(۱) "منظورہ" ص ۹۹۴۔

موت سے بے پروائی

کیا خوب فرمایا شیخ بلند بخت دیوبندی نے کہ ڈر خوف مرگ سے پیدا ہوتا ہے ہم اپنی جانیں خدا کی راہ میں قربان کر چکے ہیں، پس ہمیں کیا ڈر ہے؟

سید صاحب کی تربیت نے مجاہدین کے دل سے خوف مرگ زائل کر دیا تھا۔ تربیت کا یہ سب سے بڑا کارنامہ تھا، جس پر خاص توجہ مبذول ہونی چاہیے۔ کوئی قوم زندگی کی منزل میں ترقی نہیں کر سکتی جب تک خوف مرگ سے کاملاً پاک نہ ہو جائے۔ تاریخ ایسے لوگوں کے بھی تذکروں سے لبریز ہے جنہوں نے دنیوی عزت و دولت اور حکومت و فرماں روائی کیلئے موت سے بے پروائی اختیار کی۔ اسلام نے توحید کے استحکام، خدا اور یومِ آخرت پر کمال ایمان کے نسخہ شافی سے خوف مرگ کی بیماری کا علاج کیا۔ سید صاحب نے اتباع سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں یہی نسخہ استعمال کیا۔ جو جماعت خوف مرگ سے آزاد ہو جائے، اسے دنیا کی کوئی طاقت ہراساں نہیں کر سکتی۔ اقبال نے ایک نعت کے آغاز میں یہی دعا کی تھی کہ مسلمانوں کو خوفِ مرگ سے نجات مل جائے:

اے تو مارا بے چارگاں را ساز و برگ ❀ وارہاں ایں قوم را از ترسِ مرگ

بارہواں باب:

جماعت کی اسلامی اور اخلاقی شان

(۳)

اخوت و مساوات

سیرت سید احمد شہید کے علاوہ گزشتہ ابواب میں بیسیوں ایسے واقعات پیش کیے جا چکے ہیں جن سے جماعت کے اوصاف و محاسن بخوبی آشکارا ہو رہے ہیں۔ یہاں پھر منتخب واقعات اجمالاً پیش کیے جاتے ہیں تاکہ محاسن کی سرسری تصویر یکجا سامنے آ جائے۔

جماعت کی ایک بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ ہر فرد اخوت و مساوات کا ایک نادر پیکر تھا۔ اس میں علماء و رؤسا بھی شریک تھے، لیکن کسی جماعتی کاروبار میں کبھی اعلیٰ و ادنیٰ کا سوال پیدا نہ ہوا۔ ہر شخص ہر کام میں سب سے آگے رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ کھانے پینے، رہنے سہنے یا پہننے اوڑھنے میں سب برابر تھے۔ خود سید صاحب بھی کسی معاملہ میں اپنے آپ کو جماعت سے الگ نہ رکھتے تھے۔ یہاں صرف چند واقعات بہ طور نمونہ درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ قاضی مدنی بنگالی کے سائیس ''لاہوری'' کو عنایت اللہ نے ایک معمولی معاملے پر دو گھونسے رسید کر دیے۔ عنایت اللہ جماعت خاص کا آدمی تھا اور سید صاحب کے قدیم رفیقوں میں شمار ہوتا تھا۔ آپ نے خود یہ معاملہ قاضی القضاۃ کے حوالے کر دیا۔ عنایت اللہ نے عدالت میں اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔

قاضی صاحب نے لاہوری کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ فیصلے کے بعد لاہوری نے عنایت اللہ کو سینے سے لگا لیا اور کہا کہ میں خدا کی رضا کے لئے اپنے بھائی کو معاف کرتا ہوں۔

۲۔ مولوی عبدالوہاب لکھنوی قاسم غلہ کمزور و نحیف آدمی تھے۔ تقسیم رسد کے لئے انہوں نے دستور مقرر کر لیا تھا کہ ہر شخص کو باری باری رسد دیتے۔ مولوی امام علی عظیم آبادی نو وارد تھے اور دستور تقسیم کا انہیں علم نہ تھا۔ انہوں نے جلد رسد لینے کے جوش میں مولوی صاحب کو دھکا دے دیا۔ یہ حالت دیکھ کر بعض مجاہدین غصے میں آ گئے اور امام علی کو مارنے کے لئے تیار ہو گئے۔ مولوی صاحب نے انہیں روک دیا اور کہا: امام علی میرا بھائی ہے، دھکا دیا تو مجھے دیا، آپ لوگ کیوں جوش میں آ گئے؟ یہ بات سید صاحب کے پاس پہنچی۔ آپ نے مولوی عبدالوہاب سے پوچھا۔ انہوں نے عرض کیا کہ امام علی نیک بخت آدمی ہیں۔ وہ رسد لینے آئے تھے، باری ان کی نہ تھی، انہوں نے جلدی کی اور مجھے دھکا لگ گیا۔ امام علی نے خود سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی زیادتی کا اقرار کر لیا اور عرض کیا کہ میرا قصور معاف کرا دیجئے۔

۳۔ اہل سمہ کی غداری کے وقت حافظ عبدالعلی اور مولوی محمد رمضان بھی شیوہ میں تھے۔ سید امیر علی بیت المال کا روپیہ لے کر پنجتار چلے گئے۔ انہیں حافظ عبدالعلی نے گاؤں کے باہر پہنچا دیا لیکن خود یہ کہہ کر لوٹ گئے کہ میں اس نازک وقت میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ مولوی محمد رمضان کو شیوہ کے رئیس اپنے ہاں لے جانا چاہتے تھے لیکن انہوں نے بھی رفیقوں سے علیحدگی گوارا نہ کی اور ان کے ساتھ شہید ہوئے۔

۴۔ میکلئی میں جن مجاہدین کو قاتلانہ حملے کا ہدف بننا پڑا، ان میں بنیر کا ایک نوجوان حبیب خاں بھی شامل تھا۔ بلوائی بار بار اسے آوازیں دیتے تھے کہ تم ہمارے ہم قوم ہو ہندوستانیوں سے الگ ہو کر ہمارے پاس چلے آؤ۔ اس

نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا کہ مجاہدین کے ساتھ شہید ہو جانا میرے نزدیک ہزار درجے بہتر ہے اور تمہارے ساتھ جینا منظور نہیں۔

مسلمانوں سے جنگ

سید صاحب کی تحریک کے سلسلے میں ایک مسئلہ توجہ کا مستحق ہے اور وہ یہ کہ انہیں سرحدی سرداروں اور خوانین سے لڑائیاں پیش آئیں۔ ''سید احمد شہید'' میں ان لڑائیوں کے اسباب تفصیلاً بیان ہو چکے ہیں۔ سید صاحب کسی مسلمان سے لڑنے کے روادار نہ تھے، لیکن بعض مسلمان رئیس خود سید صاحب کے خلاف اغیار کے جاسوس یا معاون بن گئے اور ان کی وجہ سے قدم قدم پر تنظیمات جہاد میں رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں۔ مثلاً پشاور کے درانی سردار، خادے خاں رئیس ہنڈ، پایندہ خاں تنولی والیٔ امب۔ سید صاحب نے ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> ''ہم لوگ اتنی مدت سے اس ملک میں واسطے جہاد فی سبیل اللہ کے آئے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کی ریاست سمجھ کر یہاں اترے ہیں۔ فقط اس نیت سے کہ سب مسلمان بھائیوں کے اتفاق سے دین اسلام کا کام درست ہو، لیکن یہاں کے مسلمان بھائیوں کی نااتفاقی کا یہ حال ہے کہ اگر ہم کوئی صورت کفار کو زیر کرنے کی نکالتے ہیں تو انہیں مسلمانوں سے ایک نہ ایک ان کا حامی بن کر بیچ میں حارج ہوتا ہے''۔

اس کے بعد یار محمد خاں اور خادے خاں کی مخالفانہ کارروائیوں کو تفصیلاً بیان کیا۔ جنگ مایار کے بعد پشاور پر پیش قدمی شروع ہوئی تو اس وقت بھی مختلف اہل سرحد سے فرمایا:

> ''ما برائے تائید دین اسلام آمدہ ایم و شراکت مسلمانان دریں امر خواہیم۔ سردار شما (سلطان محمد خاں) از کج فہمی خود شراکت، گزاشتہ با کفار ہمکوں سار گردید۔''

ترجمہ : ہم اسلام کی حمایت کیلئے یہاں آئے اور مسلمانوں کو اس کام میں شریک کر لینے کے خواہاں تھے۔ آپ کے سردار سمجھ کی کجی سے ہمارا ساتھ چھوڑ کر کافروں کے ساتھ مل گیا۔

ان حالات میں سید صاحب کیلئے دو ہی صورتیں تھیں: یا ان فتنوں کا انسداد کرتے یا کاروبارِ جہاد سے دست کش ہو جاتے۔ انہوں نے پہلا راستہ اختیار کیا اور یہی ان کے لیے زیبا تھا۔ ان مسلمان رئیسوں کے سامنے ذاتی امیال واغراض کے سوا کوئی دینی، قومی یا ملکی مقصد نہ تھا۔

عزیمت

جماعت مجاہدین کی پوری زندگی عزیمت کی دستاویز ہے۔ گھر بار، اہل وعیال، اعزہ واقربا سے علیحدگی، راحت وآسائش کا ترک، غربت میں گوناگوں تکلیفوں کا اختیار، یہ چیزیں عزیمت ہی کا کرشمہ تھیں۔ وہ ہر لحظہ اپنی جانیں ہتھیلیوں پر لیے پھرتے تھے۔ یہ بھی نہیں کہ موجودہ زمانے کے عام جماعتی کارکنوں کی طرح انہیں شہرت وناموری کی امید ہو، یا سمجھ رہے ہوں کہ فتح وکامرانی کی حالت میں بڑے بڑے عہدے پائیں گے، ان کے پیشِ نظر خدمتِ دین کے سوا کچھ نہ تھا اور جو کچھ کر رہے تھے صرف خدا کیلئے کر رہے تھے۔ عزیمت کا مفہوم اور کیا ہوتا ہے؟ انہوں نے ہر میدانِ عمل میں اخلاص وعزیمت کے حیرت انگیز نمونے پیش کیے، جن کی مثالیں اسلامی ہند کی تاریخ میں شاذ ہی مل سکیں گی۔ یہاں صرف چند واقعات بہ طور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ امب اور چھتر بائی فتح ہو چکے تھے۔ سید صاحب پنجتار تشریف لے گئے تھے۔ تھوڑے سے مجاہدین ان دونوں قلعوں کی حفاظت پر مامور تھے۔ اس حالت میں معلوم ہوا کہ سردار پائندہ خاں تنولی بھاری لشکر جمع کر کے دونوں قلعوں پر حملے کرنا چاہتا ہے۔ دریا پار کے مختلف قلعوں سے سکھ فوج کی گولیاں

بھی آتی رہتی تھیں۔ چھتر بائی کے لئے خطرہ بہت زیادہ تھا۔ شیخ ولی محمد روزانہ صبح کو سوا سو مجاہدین کے ساتھ امب سے چھتر بائی جاتے، دن وہاں گزارتے اور رات کی تاریکی میں واپس آتے۔ گویا خاصی لمبی مدت تک آمد و رفت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔

۲۔ اہل سمہ کی غداری کے باعث بہت سے مجاہدین مظلومانہ شہید ہو چکے تھے۔ سید صاحب نے پنجتار سے کشمیر کی طرف جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ امب اور چھتر بائی کے قلعے بدستور مجاہدین کے قبضے میں تھے۔ شیخ بلند بخت امب کی جماعت مجاہدین کے سردار تھے اور حافظ مصطفیٰ کاندھلوی کو چھتر بائی میں قلعہ داری کا منصب حاصل تھا۔ دونوں سرداروں یا جماعتوں کیلئے نہ سید صاحب کے حکم کے بغیر قلعہ چھوڑنا ممکن تھا، نہ انہیں کمک پہنچ سکتی تھی۔ بلکہ خاص انتظامات کے بغیر وہ کہیں جا بھی نہ سکتے تھے۔ اس اثناء میں ان کے پاس سکھوں کا پیغام پہنچا کہ ہم آپ کو بڑے سے بڑا عہدہ دینے کیلئے تیار ہیں۔ ہمارے پاس چلے آؤ۔ دونوں سرداروں کا جواب ایک تھا۔ ہم یہاں شیخ بلند بخت کا جواب نقل کرتے ہیں۔ فرمایا:

"اپنے سردار کو کہو، ہم امیر المومنین کے تابع فرمان ہیں۔ حضرت کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ اپنے وطنوں سے اس لیے آئے ہیں کہ کافروں سے جنگ کریں۔ نہ ملک چاہتے ہیں نہ مال۔ ہمیں نوکری سے کیا غرض؟ ہماری موت اور زندگی امیر المومنین کے ساتھ ہے۔ قادر ذوالجلال کے سوا ہم کسی سے نہیں ڈرتے۔ اگر رنجیت سنگھ بھی اپنا لشکر لے کر آئے تو نہ ڈریں گے۔ ڈر خوف مرگ سے پیدا ہوتا ہے، ہم اپنی جانیں خدا کے راستے میں قربان کر چکے ہیں، پس ہمیں کیا ڈر؟ ہماری طرف سے کہہ دینا کہ پھر ہمیں ایسا پیغام نہ بھیجا جائے۔"(۱)

---

(۱) "منظورہ" ص:۱۰۲۸-۱۰۲۹۔

۳۔ جب سید صاحب کو یقین ہو گیا کہ سکھ بالاکوٹ پر حملے کا پختہ ارادہ کر چکے ہیں تو آپ نے پچوں سے بالاکوٹ جانے کی تیاری کر لی۔ لیکن درہ بھوگڑ منگ کی حفاظت کا انتظام ضروری تھا، اس لیے کہ اندیشہ تھا، شاید سکھ اس پر حملہ کر دیں۔ آپ نے روانگی سے پیشتر میاں ضیاء الدین پھلتی اور خضر خاں قندھاری کو ایک جیش دے کر بھوگڑ منگ میں اقامت کا حکم دیا۔ خضر خاں نے بڑے عجز سے عذر پیش کرتے ہوئے کہا: جنگ درپیش ہے، اس حالت میں حضرت کی رفاقت نہ چھوڑوں گا۔ اس جانباز مجاہد کو بڑے اصرار سے روکا گیا کہ بھوگڑ منگ کی حفاظت بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ جنگ میں رفاقت۔

تحمل شدائد

مجاہدین کی پوری زندگی تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرنے میں گزری۔ ان کے لیے دوران ہجرت و جہاد میں آسائش کے چند لمحے بھی نہ آئے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وقت پر کھانا نہ ملتا، یا ملتا تو ضرورت سے بہت کم ہوتا، لیکن ان کی زبان پر کبھی شکایت کا ایک حرف بھی نہ آیا۔ مثال کے طور پر مایار کی لڑائی کے دن انہیں صبح سے شام تک کھانے کا موقع نہ ملا۔ رات کو تورو پہنچے تو اتنے تھک چکے تھے کہ کھانا کھانے کا ہوش ہی نہ رہا۔ سید جعفر علی نقوی منشی خانہ کے معزز رکن تھے۔ جنگ مایار کے بعد جن اصحاب کو شاہ اسمٰعیل کے ساتھ مردان جانے کا حکم ملا، ان میں سید جعفر علی بھی تھے۔ وہ فرماتے ہیں: میں نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ رات کو کچھ نہ کھایا تھا، دن کے وقت ایک خشک ٹکڑا ملا، وہی کھا کر پانی پی لیا۔ اجازت ہو تو جلدی جلدی دو نوالے کھا لوں؟ انہوں نے فرمایا کہ روٹی ساتھ لے لو، اور تورو سے باہر نکل کر کھانا۔ سید جعفر نے اسی پر عمل کیا۔

مردان سے پشاور پر پیش قدمی شروع ہوئی۔ اس سفر میں بھی ایک موقع پر رسد نہ مل سکی۔ تھوڑا سا غلہ ہاتھ آیا، وہ قندھاریوں میں تقسیم کر دیا، جو لشکر سے آگے بڑھ کر دریائے

کنارے مورچے بنائے بیٹھے تھے۔ باقی مجاہدین نے صرف گائے کے گوشت کی ایک ایک بوٹی پر اکتفا کیا۔ سید صاحب بھی مجاہدین کی طرح فاقے سے رہے۔

بعض اوقات تکلیفیں بہت بڑھ جاتی رہیں۔ مثلاً ابتدائی دور میں مجاہدین زیادہ تر ساگ پات پر گزارہ کرتے رہے۔ چنگلئی میں رسد کی تنگی کے علاوہ اکثر مجاہدین بیمار ہوگئے۔ مولوی فتح علی کہتے ہیں کہ سیکڑوں مجاہدین میں سے صرف چھ سات تندرست رہے ہوں گے اور ان کی حالت یہ تھی کہ دن رات کا ایک ایک لمحہ بیماروں کی تیمارداری اور دوادارو میں صرف ہونے لگا۔ سید رستم علی چلگانوی اکوڑہ میں زخمی ہوکر دو اڑھائی مہینے صاحب فراش رہے۔ چنگلئی پہنچے پر ان کی صحت پوری طرح بحال نہ ہوئی تھی، تاہم تنہا چالیس بیماروں کی تیمارداری کا بار اٹھالیا اور حتی المقدور کسی کو بھی تکلیف نہ ہونے دی۔

ہاتھ سے کام

مجاہدین کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ کسی کو بھی ہاتھ سے کام کرنے میں تامل نہ تھا۔ سید صاحب اپنے واقعات سناتے رہتے تھے کہ ہم نواب امیر خاں کے لشکر میں تھے اور کپڑے دھونے کیلئے جاتے تو اپنے آٹھ دس ساتھیوں کے کپڑے بھی دھولاتے۔ ایک مرتبہ مردان میں ٹھہرے تو مسجد کے پاس کی جگہ ہاتھی بندھنے کے باعث گندی ہوگئی تھی۔ سید صاحب نے خود کدال لیا، شاہ اسمٰعیل نے ٹوکری سنبھال لی اور تھوڑی دیر میں ساری جگہ صاف کردی۔

پنجتار میں جو جگہ نماز کیلئے مخصوص کرلی تھی، اس کے اردگرد ایک احاطہ تھا۔ نہ چھت، نہ فرش، نماز پڑھتے وقت مجاہدین کے کنکر چبھتے تھے۔ ایک روز سید صاحب مجاہدین کو لے کر جنگل میں نکل گئے اور اتنی گھاس کاٹ لائے کہ فرش پر ایک فٹ موٹی تہ بچھادی گئی۔ اسی طرح چند روز بعد چھپر بنا کر چھت کا انتظام کرلیا۔ مجاہدین ہی نے مسجد میں توسیع کرلی، انہیں نے اپنے لیے نئے مکان بنالیے۔ ''منظورہ'' میں مرقوم ہے:

> "حضرت کی تعلیم کے مطابق کسی کو کسی کام میں عار نہ تھی۔ سب اپنے ہاتھ سے کپڑے دھوتے، کھانا پکاتے، جنگل سے لکڑی لاتے، چکی پیستے، بیماروں اور معذوروں کی قے اور نجاست اٹھا کر باہر پھینکتے، جو لوگ بعد میں آئے انہوں نے پہلوں کو دیکھ کر سبق حاصل کر لیا۔"

حق گوئی میں بیباکی

مجاہدین سید صاحب کا اتنا ادب کرتے تھے کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے، تاہم حق بات کہنے میں کسی کو باک نہ تھا۔ سید صاحب نے خود کئی مرتبہ مجاہدین سے فرمایا تھا کہ میں بشر ہوں اگر کسی وقت کوئی بے جا یا خلاف شریعت بات میری زبان سے صادر ہو تو ضرور مجھے آگاہ کرنا، ورنہ قیامت کے روز سب کا دامن پکڑوں گا۔ چنانچہ ایک مرتبہ میاں عبداللہ کیلئے بے اختیار "مردود" کا لفظ زبان مبارک سے نکل گیا۔ میاں نظام الدین چشتی نے آپ کو یاد دلایا کہ یہ لفظ کسی مسلمان کیلئے کیسا ہے؟ فرمایا سخت قصور ہوا۔ پھر سب کے سامنے میاں عبداللہ سے معافی مانگی۔ شاہ اسمٰعیل آئے تو خود انہیں یہ واقعہ سنایا، ساتھ ہی بے تکلف اپنے معافی مانگنے کا ذکر کیا۔

ایک مرتبہ حسن زئی قبیلے نے سید صاحب سے عشر معاف کر دینے کی درخواست کی۔ آپ نے تالیف قلوب کی غرض سے درخواست منظور کر لی۔ اس کا چرچا ہوا تو شاہ اسمٰعیل نے صاف کر دیا کہ عشر حقوق شرعی میں سے ہے اور امام بھی اسے معاف نہیں کر سکتا۔

امب پر حملے کا خطرہ پیدا ہوا تو سید صاحب نے شاہ اسمٰعیل کو لکھا کہ مستورات کو قلعے سے نکال کر کسی محفوظ مقام پر بھیج دیا جائے۔ شاہ صاحب سمجھتے تھے کہ مستورات کو نکالا تو گردوپیش کے علاقے میں سراسیمگی پیدا ہو جائے گی۔ انہوں نے اس حکم کی تعمیل کو خلاف مصلحت بتایا۔ سید صاحب نے دوبارہ یہ لکھا کہ مستورات کو قلعے میں نہ رکھنا چاہیے۔ شاہ اسمٰعیل اگرچہ تعمیل حکم میں ہمیشہ مستعد رہتے تھے لیکن اس حکم کے خلاف اپنی

رائے ظاہر کرتے ہوئے صاف صاف لکھ دیا کہ اس پر عمل کرنے سے شوکت اسلام کو نقصان پہنچا تو خدا کے نزدیک اس کی جواب دہی آپ ہی کے ذمہ ہوگی۔

عفت و پاک بازی

مجاہدین کی عفت و پاک بازی درجۂ کمال پر پہنچی ہوئی تھی۔ قیامِ خمر کے زمانے میں ایک مرتبہ ملا کلیم اخوندزادہ نے گاؤں کی عورتوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا کہ سید بادشاہ کے ساتھی یا تو نفسانی خواہشات سے محروم ہیں یا اولیاء ہیں۔ پن چکیوں پر آٹا پسوانے آتے ہیں، وہاں عورتیں بھی ہوتی ہیں لیکن کیا مجال کہ آج تک کسی مجاہد کی نگاہ عورت کی طرف اٹھی ہو۔ ملا کلیم نے کہا: واقعی اولیاء ہیں۔ یہ سید صاحب کی صحبت و تربیت کا اثر ہے کہ ان کی نظر شرع شریف کے خلاف قطعاً نہیں اٹھتی۔

پشاور پر پیش قدمی کے دوران میں مجاہدین چارسدہ سے تنگئی ہوتے ہوئے مٹ پہنچے تو لشکر کی حق شناسی دیکھ کر لوگ پکار اٹھے:

> "ایں عجب لشکر است۔ باوجود آنکہ شش ہفت ہزار سوار و پیادہ نزول کردہ اند اما بر کسے ظلمے نمی رود"(۱)

> **ترجمہ**: یہ عجیب لشکر ہے۔ اگرچہ سات ہزار سوار اور پیادے اترے ہوئے ہیں لیکن کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔

محض محرمات ہی نہیں بلکہ مکروہات سے بھی گریز کا یہ حال تھا کہ اپنی تحریک کو اس قسم کی چیز سے بھی آلودہ نہ ہونے دیا۔ عبدالغفار خاں پشاوری کا واقعہ بیان ہو چکا ہے، اسے قلب سازی میں کمال حاصل تھا۔ کہتا تھا کہ جتنے روپے چاہیں بنا کر دے سکتا ہوں اور ان سے سب کچھ خرید سکتے ہیں۔ سید صاحب نے صاف صاف فرما دیا کہ ہمارے ساتھ رہنا ہے تو قلب سازی چھوڑ دو، ورنہ سکھوں کے علاقے میں چلے جاؤ۔

---

(۱) "منظورہ" ص: ۸۹۰۔

شانِ تربیت

سید صاحب کا طریق تربیت یہ تھا کہ کسی کو مخصوصاً حکم نہ دیتے تھے۔ عموماً فرما دیتے تھے کہ فلاں کام ہونا چاہیے یا خود کام شروع کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ قیامِ اسب کے زمانے میں پانی کی ضرورت پیش آ گئی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ کوئی بھائی دو چار مشکیں دریا سے لے آئے۔ ہر شخص نے سمجھا کہ پانی آ گیا ہوگا۔ جب معلوم ہوا کہ پانی نہیں آیا تو سید صاحب نے خود مشک اٹھائی، پھر تمام مجاہدین مشک، پکھال، ڈول، بدھنا، گھڑا لے کر دوڑ پڑے۔ سید صاحب پانی لے کر آئے تو فرمایا کہ میری خاطر داری سے کام نہ کرنا چاہیے، للّٰہیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر بھائی ہر کام صرف خدا کی رضا کیلئے کرے۔

''منظورہ'' کا بیان ہے:

> ''آنجناب را منظور بود کہ حکم علی العموم باشد و مسلماناں بر آں سبقت کنند و بالخصوص کسے را حکم دادہ نہ شود''(۱)

ترجمہ : سید صاحب کو منظور یہ تھا کہ حکم علی العموم دیا جائے اور مسلمان اس کی تعمیل میں پیش قدمی کریں۔ تخصیص سے کسی کو حکم نہ دیا جائے۔

سیادت

ہمارے زمانے میں سیادت کے احترام و عزت پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سید صاحب کے تصورِ سیادت کا بھی اندازہ کر لینا چاہیے۔ قیامِ اسب کے زمانے میں ایک آدمی سید صاحب کے پاس کچھ مانگنے کیلئے آیا۔ آپ نے جہاد کی ترغیب دی۔ اس نے کہا کہ میں ضعیف ہوں اور میرے بال بچے سکھوں کے علاقے میں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں لشکر بھیج کر تمہارا سامان اور بال بچے منگوالوں گا۔ وہ بولا: اس طرح جانیں

---

(۱) ''منظورہ'' ص: ۴۲۳۔

تلف ہوں گی اور اگر دشمن کامیاب ہو گیا تو مصیبت پیش آئے گی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ اسے دو روپے دے دیے جائیں۔ وہ بولا کہ میں سید ہوں۔ حضرت یہ سنتے ہیں غصے میں آ گئے اور فرمایا:

> "وقتیکہ بہ شما کارے فرمودم کہ بر دیگراں واجب و بر سادات اوجب است، آں وقت عذر کردید۔ اکنوں برائے یک دو روپیہ سیادت خود را می فروشید! ایں عجب است کہ شخصے برائے بجا آوردنِ احکامِ الٰہی اظہارِ سیادت خود نہ کند، چہ اقدام و سبقت در امورِ عبادت شایانِ شان سیادت است و در مقامِ طمع اظہارِ سیادت خودی نماید۔"(۱)

> **ترجمہ** : جب تمہیں ایک ایسے کام کا حکم دیا جو دوسروں کیلئے لازم اور سادات کیلئے بدرجہا لازم ہے، اس وقت تم نے عذر کر دیا۔ اب ایک دو روپے کیلئے اپنی سیادت بیچ رہے ہو، کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ اس شخص نے خدائی کام بجالانے کے سلسلے میں تو سیادت کا اظہار نہ کیا، اگرچہ معاملات عبادت میں سبقت اور پیش قدمی سیدوں کے شایانِ شان ہے اور طمع کی خاطر اپنے سید ہونے کی نمائش کرتا ہے۔

بیشک سیادت کا دعویٰ اسی صورت میں زیبا ہے کہ انسان کا عمل اسکے شایانِ شان ہو۔

آخری گزارش

یہ اس جماعت کی تربیت و تنظیم اور اسلامیت کا ایک سرسری خاکہ تھا، جو مختلف مآخذ سے متفرق حالات جمع کر کے مرتب کیا گیا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں جماعت کی پوری تصویر آ گئی، لیکن اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سید صاحب نے تھوڑی مدت میں اپنی بے مثال تربیت سے کیسی جماعت پیدا کر دی تھی، جس کی اسلامیت زوال کے تاریک

---

(۱) "منظورہ" ص:۶۳ے۔

دور میں آفتاب جہاں تاب کی طرح درخشاں رہی اور اس کی روشنی کبھی ماند نہ پڑے گی۔ اسی نقشے سے سید صاحب کی مردم گری کا درجہ بھی آشکارا ہو سکتا ہے۔ آپ کے ظہور سے پیشتر یہ لوگ انہیں مشاغل میں مصروف تھے، جن میں لاکھوں دوسرے افراد کی زندگیاں بسر ہو رہی تھیں، لیکن آپ نے پانچ چھ سال میں ایسا گروہ پیدا کر لیا، جس کے نمونے یہاں ہماری صدیوں کی تاریخ میں بہت ہی کم ملیں گے۔ اس مردم گری کے مزید کمالات ان مجاہدین کے حالات میں پیش ہونگے جنکے مختصر سے سوانح آئندہ ابواب کی زینت ہیں۔

تیرھواں باب:

پیر محمد قاصد کا ایک سفر

سید صاحب کے قاصد

سید صاحب کے تمام قاصدوں کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی۔ ان میں سے بعض پنجاب کے راستے ہندوستان آتے، جن شہروں اور قصبوں میں سید صاحب کے نیاز مند اور مخلصین موجود ہوتے، ان میں ٹھہرتے اور پیغامات پہنچاتے ہوئے دہلی جاتے، جو پیغامات اور وصول وارسالِ زر کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ وہاں سے حسبِ ضرورت پورب اور ٹونک کا چکر بھی لگا لیتے، اسی راستے سے وہ واپس جاتے تھے۔ روپیہ دوسرے ذریعوں سے بھی دہلی پہنچ جاتا تھا۔ بعض اوقات قاصد بھی مختلف مقامات سے جمع شدہ روپیہ لے کر دہلی پہنچاتے۔ وہاں شاہ محمد اسحاق ہنڈیاں تیار کرا دیتے یا کبھی کبھی روپوں کو اشرفیوں میں تبدیل کر کے کپڑے میں اس طرح سی دیا جاتا کہ کسی کو خبر نہ لگ سکے۔ پنجاب ہی کے راستے وہ واپس چلے جاتے۔ چونکہ ان کا لباس فقیرانہ اور سیاحانہ ہوتا اس لئے عموماً کسی مقام پر تعرض نہ کیا جاتا۔ بعض قاصد سرحد سے سندھ جاتے جہاں سید صاحب کے اہل وعیال پیر کوٹ میں مقیم تھے۔ پھر مارواڑ ہوتے ہوئے ٹونک پہنچتے۔ یہیں سے پلٹ کر سندھ ہوتے ہوئے یہ سرحد چلے جاتے۔ میاں دین محمد کے ایک سفر کے متعلق بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مرتبہ بنارس بلکہ اس سے بھی آگے تک ہو آئے تھے۔ بہرحال سید صاحب نے مخابرت ومکاتبت کا پختہ انتظام کر لیا تھا اور قاصد مقاصد کے اخفا کا بھی پورا خیال رکھتے تھے۔

پیر محمد قاصد

ان معتبر قاصدوں میں سے ایک کا نام پیر محمد تھا، جو سید صاحب کے قیام سرحد کے دوران میں خدا جانے کتنی مرتبہ ہندوستان آیا اور واپس گیا۔ اس کے تمام سفروں کی کیفیت تو محفوظ نہیں، حسن اتفاق سے صرف ایک سفر کی تفصیلات روایات کے ذخیرے میں محفوظ رہ گئی ہیں۔ جنہیں اس غرض سے یہاں درج کیا جاتا ہے کہ اندازہ ہو جائے کہ سید صاحب اور ان کے رفقاء مشکلات ومصائب کے کس خوفناک ہجوم میں اپنا دینی اور قومی فرض ادا کرتے رہے۔ یہ سفر ستمبر ۱۸۲۹ء میں شروع ہوا تھا اس لئے کہ میاں پیر محمد کا اپنا بیان ہے کہ اسے جنگ زیدہ میں فتح وکامرانی کا نامۂ بشارت دے کر بھیجا گیا تھا اور جنگ زیدہ ۴؍ یا ۵؍ ستمبر ۱۸۲۹ء کو ہوئی تھی۔

بہر حال پیر محمد فقیرانہ بھیس میں سرحد سے چلا اور پنجاب سے گذر کر مظفر نگر میں مولوی خدا بخش میرٹھی کے پاس پہنچا جو انگریزی کچہری میں ملازم تھے۔ انہیں نامۂ فتح دکھایا اور وہ بہت خوش ہوئے۔ خط کی نقل رکھ لی۔ رخصت کے وقت سات سو روپے کی اشرفیاں اور تن سکھ کا ایک تھان سید صاحب کے لئے دیا۔ دس یا بیس روپے منشی محمدی انصاری کے لئے دیئے جو سید صاحب کے میر منشی تھے۔ پیر محمد کو راستے کے خرچ کے لئے کچھ رقم دی۔

مظفر نگر سے دہلی

مظفر نگر سے دہلی تک کے سفر کی اجمالی کیفیت ذیل میں درج ہے:

۱۔ مظفر نگر سے پیر محمد پھلت گیا اور مولوی وحید الدین سے ملا۔ انکے بھائی حافظ قطب الدین چند ہی روز پیشتر سید صاحب سے رخصت لیکر آئے تھے۔ نامۂ فتح کی نقل انہوں نے بھی لے لی اور قاصد کو خرچ راہ بھی دیا ہوگا روایت میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔

۲۔ پھلت سے پیر محمد میرٹھ پہنچا۔ وہاں شیخ محمد تقی اور شیخ عبداللہ سے ملا جو انگریزی

فوجوں میں گوشت کے ٹھیکیدار تھے۔ ان کے علاوہ داروغہ محمد راحم اور قاضی حیات بخش سے بھی ملاقات کی۔ آخر الذکر کے فرزند قاضی احمد اللہ سید صاحب کے پرانے رفیقوں میں سے تھے اور جہاد کی غرض سے سرحد میں تشریف فرما تھے۔ ان حضرات نے بھی قاصد کو خرچ راہ دیا۔ قاضی صاحب نے اپنے فرزند کے نام ایک خط بھی حوالے کیا۔ چونکہ وہ بہت تنگ دست تھے اس لئے خرچ کے واسطے صرف ایک روپیہ پیش کر سکے۔

میرٹھ سے رخصت ہو کر پیر محمد دہلی پہنچا اور شاہ اسحاق کی درسگاہ میں مقیم ہوا۔

قیامِ دہلی

دہلی میں شاہ اسحاق اور شاہ یعقوب سے ملاقات کی اور لشکر اسلام کے پورے حالات سنائے۔ شاہ اسماعیل نے ایک خط دیا تھا، وہ شاہ صاحبان کو پہنچایا۔ اس خط میں مولوی سید محبوب علی دہلوی کے متعلق کچھ سخت باتیں درج تھیں، جو مجاہدین کا قافلہ لے کر سید صاحب کی خدمت میں پہنچے تھے لیکن بعض ناگزیر تکالیف سے دل تنگ ہو کر واپس چلے آئے تھے۔ شاہ اسحاق نے وہ خط چھپا لیا۔ لیکن مولوی سید محبوب علی کو کسی ذریعے سے خبر مل گئی اور پیر محمد ملا تو اصرار کیا کہ وہ خط لا کر دکھاؤ۔ چنانچہ پیر محمد نے شاہ اسحاق سے خط لے کر مولوی صاحب کو دکھایا۔ پڑھ چکنے کے بعد انہوں نے کہا کہ شاہ اسمٰعیل کا کچھ قصور نہیں، دہلی کے مفسدوں نے جو مجھ سے عناد رکھتے ہیں، مجھ پر بہتان و افترا باندھ کر لکھے ہوں گے۔

پیر محمد نے مولوی محبوب علی کی معیت میں شاہ اسحاق کی ہمشیر سے بھی جو پس پردہ تھیں، باتیں کیں اور حکیم مومن خاں سے بھی وہ ملا۔

سفرِ ٹونک

پیر محمد دہلی سے ٹونک گیا جہاں اس زمانے میں سید صاحب کے بھانجے سید

عبدالرحمن آئے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان سے ملاقات کی۔ نامۂ فتح دکھایا۔ سید عبدالرحمن نے وہ خط نواب امیر الدولہ کو دکھایا۔ وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ نواب وزیر الدولہ اس وقت سرونج میں تھے، ان سے ملنے کے لئے پیر محمد سرونج گیا اور بیس بائیس روز وہاں رہا۔ نواب وزیر الدولہ سید صاحب کے متعلق بار بار مختلف باتیں پوچھتے تھے۔ رخصت کے وقت تاکید کی کہ ہماری طرف سے حضرت کے ہاتھ پر نیابتاً بیعت امامت کرنا اور آپ کے لئے توشہ خانہ سے دو عمدہ چھریاں لیتے جانا۔ ان میں سے ایک کا دستہ شیر ماہی کا تھا اور دوسری کا سنگ یشب کا۔

واپسی کی تیاری

پیر محمد ٹونک سے دہلی آیا۔ شاہ اسحاق نے تین ہزار کی ہنڈی اور تین سو روپے کی اشرفیاں دیں۔ سات سو روپے کی اشرفیاں جو خدا بخش میرٹھی نے دی تھیں پہلے سے ان کے پاس جمع تھیں۔ ان رقموں کی حفاظت کا مناسب انتظام کر کے واپسی کے سفر کی تیاری کر لی۔ عین اس وقت معلوم ہوا کہ پیر محمد کے ہندوستان آنے کی اطلاع رنجیت سنگھ کی حکومت کو مل گئی ہے اور اس کا حلیہ بھی بتا دیا گیا ہے۔ چنانچہ لاہور سے سکھ حکومت کے مختلف کارندوں کو حکم بھیج دیے گئے کہ اس حلیے کا آدمی جہاں ملے گرفتار کر لیا جائے۔ حکومت پنجاب کے وکیل دہلی کے پاس بھی یہ حکم آیا۔ اس سے یہ ذکر سن کر ایک مخلص نے شاہ اسحاق تک اطلاع پہنچائی۔ پیر محمد خود کہتا ہے:

> ''میں سفر میں فقیرانہ لباس رکھتا تھا۔ میرے پاس بڑے بڑے دانوں کی ایک تسبیح، ایک روئی دار میرزئی اور ایک پانی بھرنے کی ڈورتھی اور ایک تونبا تھا اور ایک دوہرا کرتا اور ایک دوپٹا۔

سفر مراجعت اور گرفتاری

خطرے کا علم ہو چکا تھا، لیکن پیر محمد کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ پنجاب ہی کے راستے واپس جاتا۔ چنانچہ خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے چل پڑا۔ ہر روز پچیس تیس کوس کی منزل طے کرتا ہوا دریائے ستلج کو عبور کر کے کپورتھلہ پہنچا۔ اس سفر میں چھ دن گذر گئے۔ ایک روز کپورتھلہ میں ٹھہر کر پھر چلا اور دریائے بیاس عبور کیا۔ وہاں تین آدمی مل گئے جن کا بیان یہ تھا کہ وہ سید صاحب کے پاس جا رہے ہیں۔ ایک رات جنڈیالہ میں گزاری، اگلے روز امرتسر پہنچے اور ایک مسجد میں قیام کیا۔ اگلے سفر میں سے ایک جگہ عبور دریائے راوی کا ذکر ہے اور دوسری جگہ ایمن آباد میں قیام کا۔

پیر محمد کہتا ہے کہ میں کھانا نفیس کھاتا تھا، جسے میری وضع قطع اور فقیرانہ لباس سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ ایک مسلمان دکاندار نے یہ کیفیت دیکھی تو سمجھا کہ یا تو میرے پاس دست غیب ہے یا میں کیمیاگر ہوں۔ چنانچہ اس نے اصرار کیا کہ مجھے بھی کوئی تبرک عنایت فرمایئے۔ پیر محمد نے کہا کہ سو بار سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص پڑھا کرو، خدا روزی میں برکت دے گا۔

ایمن آباد سے پیر محمد اور ساتھی گجرات اور کھاریاں ہوتے ہوئے جہلم پہنچے وہاں کے راستے میں دتو راول مل گیا۔ اس نے پیر محمد کی طرف غور سے دیکھا اور اپنے ایک سوا سے کہا کہ اسے اپنے ڈیرے میں لے چلو۔

تلاشی اور قید

پیر محمد کا بیان ہے کہ میں ڈیرے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ سوار شاہ میر خاں آفریدی کے رسالے کے ہیں۔ ان لوگوں نے بھی مجھے پہچان لیا اور بہت متاسف ہوئے کہ بھائی بہت بے ڈھب پھنسے ہو۔ شاہ میر خاں وہاں موجود نہ تھے اور لاہور آئے ہوئے تھے۔

میں نے چاہا کہ اپنی رقمیں، ہنڈی اور خطوط انہیں دے دوں۔ اس اثناء میں ایک سکھ سوار مجھے ساتھ لے جانے کیلئے آ گیا اور میں کوئی شئے بھی اپنے سے جدا نہ کر سکا۔ تلاشی میں ساری چیزیں نکل آئیں، مجھے زدوکوب بھی کیا گیا۔ بالآخر ایک ڈیرے میں قید کر دیا گیا۔

وہاں سے لاہور روانہ ہوئے۔ مجھے بھی پابہ زنجیر ساتھ لے لیا۔ میں نے ہر چند کہا کہ میں قاصد ہوں مجھے کیا معلوم لوگ خطوں میں کیا کچھ لکھتے ہیں، میں تو خط پہنچانے کا ذمہ دار ہوں۔ دنتورا نے کہا کہ سب کچھ سچ سچ بتا دو ورنہ تمہیں پھانسی کی سزا دوں گا۔

حالات اسیری

لاہور پہنچے تو پیر محمد کو انارکلی کی چھاؤنی میں قید رکھا گیا۔ اس کا بیان ہے کہ ایک جنگی کو میرا ساتھی بنا دیا گیا۔ اس میں مجھے نماز کی سخت تکلیف تھی۔ دنتورا سے ایک روز میں نے شکایت کی تو اس نے سکھوں کو سخت سست کہا، چنانچہ یہ مصیبت رفع ہو گئی۔ کھانا مجھے اچھا نہ ملتا تھا لیکن ایک شخص رحمو ’ترم نواز‘ تھا اس نے اپنے ہاں سے میرے لیے کھانا مقرر کر دیا۔ پھر مجھے وزیر سنگھ کے پاس بھیجا گیا جو ایک مرتبہ سید صاحب کے پاس سفیر بن کر آ چکا تھا اور آپ کا بہت احترام کرتا تھا، بلکہ سید صاحب کے حلقے کا خیال تھا کہ وہ خفیہ خفیہ مسلمان ہو چکا ہے۔ وزیر سنگھ نے چوکی پہرا موقوف کر دیا۔ پیر محمد صرف بیڑی پہنے ہوئے رہتا تھا اور روز وزیر سنگھ کے ہاں سے اسے نفیس کھانا بھی مل جاتا تھا۔

وہیں سید انور شاہ امرتسری سے ملاقات ہوئی جو سفر ہجرت میں سید صاحب کے ساتھ تھے اور واقعہ بازار تک ساتھ رہے، پھر انہیں سید صاحب نے واپس بھیج دیا۔ وزیر سنگھ نے کچھ مدت بعد پیر محمد کو کوتوالی میں بھیج دیا اس زمانے میں خدا بخش نامی ایک کوتوال تھا۔ اس نے پیر محمد سے بہت اچھا سلوک مرعی رکھا، یہاں تک کہ عام قیدیوں کی رپورٹ میں اس کا ذکر ہی نہ کرتا تھا کہ مبادا کوئی غیر مناسب حکم اس کے متعلق جاری ہو جائے۔

اسیری ہی کے زمانے میں یہ خبر ملی کہ سید صاحب نے مایار کی لڑائی میں درانیوں کو شکست دی اور پشاور میں داخل ہو گئے۔ چند روز بعد پیر محمد کو رہا کر دیا گیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ پیر محمد کی گرفتاری اور اسیری کی خبر ہندوستان میں بھی پہنچ گئی تھی اور حکیم مغیث الدین سہارن پوری نے بیگم سمرو سے کہہ کر دنتورا کو ایک خط لکھوایا کہ پیر محمد کو رہا کر دیا جائے۔ خود ان مسلمانوں نے بھی رہائی کیلئے کوششیں کی ہوں گی جو سید صاحب سے عقیدت وارادت رکھتے تھے اور پیر محمد کے حالات سے آگاہ ہو چکے تھے۔

رہائی کے بعد

رہائی کے بعد پیر محمد لاہور ہی میں تھا کہ خبر ملی کہ سید صاحب نے سلطان محمد خان درانی سے عہد و پیمان کے بعد پشاور اس کے حوالے کر دیا ہے۔ سید انور شاہ بھی ان دنوں لاہور ہی میں مقیم تھے۔ کچھ مدت پیر محمد نے ان کے پاس گزاری۔ وہ خود کہتا ہے:

> ”وہ (سید انور شاہ) بڑے نامی شخص تھے۔ بہت لوگ ان کے مرید اور معتقد تھے اور وہ عجیب خوش طبع اور بے تکلف اور صاف گو آدمی تھے۔ امیروں میں امیر، غریبوں میں غریب، درویشوں میں درویش، بڈھوں میں بڈھے، جوانوں میں جوان، سیدوں میں سید، لڑکوں میں لڑکے اور پنجاب میں ان کی قدر و منزلت ہر کسی کے روبرو تھی۔ یہاں تک کہ سکھ لوگ بھی ان کی عزت و توقیر کرتے تھے اور جس کو وہ سخت سست کہتے تھے کوئی برا نہ مانتا تھا۔“(۱)

اسی زمانے میں درانیوں اور بعض سرداروں نیز خوانین سمہ کی سازش سے مجاہدین کے جابجا شہید ہونے کی دردناک خبریں ملیں، لہٰذا سید انور شاہ نے پیر محمد کو مشورہ دیا کہ اب سرحد جانے کے بجائے تمہیں ہندوستان چلے جانا چاہیے۔

---

(۱) وقائع احمدی جلد آخری ص: ۱۳۱۔

لاہور سے دہلی

چنانچہ پیر محمد لاہور سے ہندوستان روانہ ہو گیا۔ سات آٹھ روز سہارن پور میں حکیم مغیث الدین کے مکان پر رہا۔ انہوں نے رخصت کے وقت خرچ راہ دیا، پھر میرٹھ چھاؤنی میں شیخ محمد تقی اور شیخ عبداللہ کے پاس پہنچا۔ میرٹھ شہر میں قاضی حیات بخش سے ملاقات کی اور دہلی پہنچ گیا۔

اہل سمہ کی سازش اس کے الم انگیز نتائج اور پنجتار سے سید صاحب کی ہجرت کے متعلق اطلاعات دہلی آ چکی تھیں۔ پیر محمد بہر حال واپس جانے پر مصر تھا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ بے شک چلے جاؤ لیکن ہم کوئی رقم یا ہنڈی اس وقت تک نہیں بھیج سکتے جب تک قطعی طور پر معلوم نہ ہو جائے کہ سید صاحب نے کہاں اقامت اختیار کی ہے۔ غرض پیر محمد دہلی سے دوبارہ سرحد کی طرف نکل پڑا۔ صرف پچاس روپے پاس تھے۔

دوسرا سفر

دہلی سے روانگی کے بعد شاملی میں قیام کا ذکر ہے، جہاں کا نور بخش جراح لشکر اسلام میں تھا۔ ان کے مکان سے قریب ایک مسجد تھی جس میں پیر محمد ٹھہرا۔ نور بخش کے باپ اور بھائیوں سے ملاقات کی۔ وہاں بانس بریلی کے امداد علی خاں تحصیلدار تھے، پیر محمد ان سے بھی ملا تو انہوں نے مسجد سے اٹھوا کر اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ وہاں چند بڑھئی کام کر رہے تھے۔ تحصیلدار سے کہہ کر ان سے لکڑی کا ایک کشتی نما پیالہ تیار کرایا جس کے پیندے میں روپے رکھنے کیلئے ایک خانہ بنوالیا اور روپے رکھ کر اس پر ڈاٹ لگا دی۔ پھر امرتسر ہوتا ہوا گجرات پہنچا، جہاں سے سیالکوٹ اور کشمیر کا راستہ اختیار کر لیا، اس لئے کہ عام افواہ یہ تھی کہ سید صاحب کشمیر کی طرف تشریف لے گئے ہیں۔

ایک سید کی شفقت

پیر پنجال سے دو اڑھائی کوس درے خان پور نامی ایک مقام تھا، پیر محمد وہاں کی مسجد میں اترا۔ ایک کشمیری آیا اور اس نے کہا کہ یہاں سے اٹھ جاؤ۔ پیر محمد کہاں جاتا؟ کچھ دیر بعد وہ کشمیری دوبارہ آیا اور پیر محمد کو اپنے ہاں کے ایک سید کے پاس لے گیا۔ اس نیک بخت نے پیر محمد کو اپنے پاس ٹھہرالیا، کھانا کھلایا، تنہائی میں پوچھا کہ اپنا حال سچ سچ بتادو۔ جب معلوم ہوا کہ پیر محمد سید صاحب کا قاصد ہے تو اس کی دلداری اور تواضع میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی، یہ بھی بتایا کہ ہمیں جو خبریں ملی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب پچوں میں ہیں، شاہ اسماعیل لشکر لے کر بالاکوٹ پہنچے ہوئے ہیں اور مولوی خیر الدین مظفر آباد میں ہیں۔ چار پانچ روز کے بعد اس سید نے پیر محمد کیلئے اون کے پاتابے اور گھاس کی چپلی تیار کرادی جس کے بغیر برفستانی علاقے میں سے گذرنا مشکل تھا۔

ایک فقیر کی دغا بازی

پیر پنجال کی چڑھائی میں ایک فقیر اور ایک کشمیری پیر محمد کے ساتھی بن گئے۔ پہاڑ سے گذر جانے کے بعد ایک گوجر کے مکان میں ٹھہرے اور روٹی پکوائی۔ ساتھی فقیر نے پیر محمد کے آٹے میں کوئی نشہ آور چیز ملادی جسے کھاتے ہی آہستہ آہستہ غفلت طاری ہوگئی۔ کمر میں جو تھیلی بندھی ہوئی تھی، اس میں چار پانچ روپے تھے، وہ فقیر نے کھول لی اور پیر محمد کا ہاتھ پکڑ کر ایک نالے پر چھوڑ گیا جو کوس سوا کوس پر تھا۔ سارا اسباب خود لے گیا۔

کشمیری کی مہربانی

تین روز نالے پر گزارے۔ پھر ہوش آیا تو ایک بستی میں پہنچا، ایک مسلمان کشمیری سے اشارۃً کہا کہ میں بھوکا ہوں۔ اس نے روٹی پر گھی اور شہد لاکر پیش کیا۔ ہوش وحواس بجا ہوئے تو اس کشمیری سے کہا کہ بھائی میں بے یارومددگار ہوں، کوئی ایسی جگہ بتادو

جہاں آٹھ دس دن گزار لوں، جسم میں کچھ طاقت آجائے تو جاؤں۔ کچھ کھانا دے دیا کرو گے تو مہربانی ہوگی ورنہ تم پر کچھ الزام نہیں۔ اس دردمند شخص نے ایک موٹا کمبل اوڑھنے کے لئے دے دیا اور ایک جگہ بتادی جہاں کوئلوں اور انگیٹھی کا انتظام کردیا۔ گھر والوں کو تاکید کردی کہ جو کچھ پکا کرے ان شاہ صاحب کو کھلا دیا کرو۔

دغاباز فقیر کی تلاش

وہاں کا حاکم رام پور کا پٹھان تھا۔ کشمیری نے اس سے ذکر کیا تو پیر محمد کو بلوایا گیا۔ سارے حالات سنے۔ سپاہی بھیج کر اس فقیر کو تلاش کرایا۔ گوجر کے مکان سے پتہ چلا کہ وہ دامن کوہ کی بستیوں میں رہتا ہے۔ پہلے اس کے متعلقین پکڑے آئے پھر وہ فقیر بھی گرفتار ہوکر آیا۔ پیر محمد نے حاکم کو بتادیا کہ میرا سارا اسباب یہ لے گیا ہے۔ چالیس روپے تو کشتی نما پیالے میں تھے۔ پانچ روپے میری تھیلی میں تھے۔ حاکم نے کہا چند روز ٹھہر جاؤ تو ہر چیز مل جائے گی، لیکن پیر محمد کو قوت بحال ہوتے ہی یہ اضطراب پیدا ہوا کہ جلد سے جلد سید صاحب کی خدمت میں پہنچ جائے۔ اسے ایک لمحے کے لئے بھی ٹھہرنا دوبھر ہوگیا۔

آخری منازل

چنانچہ وہ دوسرے روز چلنے کے لئے تیار ہوگیا۔ کشمیری نے ناشتے کیلئے کچھ روٹیاں پکوادیں اور دو روز کا آٹا دے دیا۔ ایک شخص پشاور جارہا تھا اور وہ راستے سے خوب واقف تھا، اس کا ساتھ ہوگیا۔ راستے میں ایک گہرا نالہ ملا جس پر لکڑی کا پل بنا ہوا تھا۔ منزل بہ منزل مظفر آباد پہنچا۔ اس سے پیشتر مولوی خیر الدین مظفر آباد سے ہٹ چکے تھے اور سکھوں کی عمل داری پہلے کی طرح بحال ہوچکی تھی۔ (۱)

---

(۱) روایت کا یہ حصہ میرے نزدیک نظر ثانی کا محتاج ہے، اس لئے کہ مظفر آباد کی لڑائی اور بالاکوٹ کی جنگ میں فصل بہت کم ہے۔ اگر اس بیان کو درست تسلیم کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ مولوی خیر الدین نے مظفر آباد سے نکل کر ایک مہینے سے زیادہ مدت بالاکوٹ پہنچنے میں گزاری۔ اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

اس کے بعد پیر محمد نے متعدد بستیوں کا ذکر کیا ہے جن کے نام درج نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ وہ کس راستے سے بالاکوٹ گیا، لیکن اس نے تکلیفیں بہت اٹھائیں، دو وقت مٹر کے کھیت سے کچا ساگ کھا کر گزارا کیا۔ اپنی میرزئی ایک شخص کو دیکر بالاکوٹ کا رہبر بنایا اور شیخ بلند بخت بالاکوٹ والے لشکر کے امیر تھے۔ پیر محمد بالاکوٹ سے پکھوں جانا چاہتا تھا، لیکن شیخ بلند بخت نے روک لیا کہ حضرت خود چند روز میں یہاں آنے والے ہیں۔

غور طلب نکتے

یہ صرف ایک سفر کی کہانی ہے، خدا جانے ان قاصدوں نے مسلسل سفروں میں کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں، لیکن اپنا کام وہ اس انداز میں انجام دیتے رہے گویا یہ ایک اہم دینی فرض تھا۔ سید صاحب کا کمال یہ ہے کہ ہر کام کیلئے حد درجہ موزوں آدمی انتخاب فرما لیتے تھے۔ پھر ان قاصدوں کی شانِ دیانت ملاحظہ فرمایئے کہ جو رقم سید صاحب کے لئے دی جاتی تھی، اس میں سے ایک حبہ بھی اپنی ذات پر خرچ نہ کرتے تھے۔ ذاتی تکالیف کی انہوں نے کبھی پرواہ نہ کی، ہمیشہ یہ امر پیش نظر رہتا تھا کہ جو کام امام نے انہیں سونپا ہے، اسے احسن طریق پر جلد از جلد پورا کر دیں۔ ان تمام برکات کا سرچشمہ یہ تھا کہ سید صاحب کی پوری تحریک دینی تھی اور جو اصحاب بھی اس میں شامل ہوئے، خواہ وہ کسی کام پر لگائے گئے، اسے کارِ حق سمجھ کر پورا کرتے تھے اور ہر قسم کی دنیاوی مشقتیں اس لئے خوشی خوشی برداشت کرتے تھے کہ بارگاہِ باری تعالیٰ سے اجر و ثواب پائیں گے۔ دنیوی منافع کے خیال سے بھی ان کا دامنِ قلب کبھی آلودہ نہ ہوا۔

چودھواں باب:

منظومات

مدحیاتِ منظوم

سید صاحب اور ان کی جماعت کیلئے مدحیہ نظمیں بھی خاصی بڑی مقدار میں لکھی گئیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے جتنی نظمیں اب تک دستیاب ہو سکیں انہیں یہاں درج کر دیا جائے تا کہ وہ یکجا محفوظ ہو جائیں۔ آئندہ جو نظمیں ملیں، انہیں شامل کر لینا مشکل نہ ہوگا۔

یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ ان میں سید صاحب اور ان کی جماعت یا ان کے کام کی مدح وستائش اس طرح مخلوط ہے کہ ایک کو دوسری سے الگ کرنے کی کوئی صورت نہیں، لہٰذا میں انہیں بجنسہٖ درج کر رہا ہوں۔

پہلی نظم

فقہی مسائل کی ایک منظوم قلمی کتاب کے ستاون اوراق ہاتھ آئے، ان کے مصنف کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اس کتاب کے آغاز میں سید صاحب کے متعلق مندرجہ ذیل اشعار آبدار درج تھے:

دوم ایں است کہ بے رنج وتشویش ❁ بہ بیت اللہ بردہ ہمرہ خویش(۱)

---

(۱) مصنف نے یہ سید صاحب کا دوسرا احسان بتایا۔ نظر بظاہر پہلا احسان یہ بتایا ہوگا کہ انہوں نے ہدایت کی راہ پر لگایا۔

بہ انواعِ کرم بنواخت مارا ❁ بہ فیضِ حج مشرف ساخت مارا
از آنجا پس بہ توقیر وسکینہ ❁ شدم باوے سوئے شہر مدینہ
زبحر شور تا پایانِ قندھار ❁ شد از فیض کراماتش پرُ انوار
تمامی شرک و بدعت محو فرمود ❁ رواجِ سنت از اول برافزود
ازو باب غزا گشتہ کشادہ ❁ رواجِ حج ازوے اوفتادہ
نہاد او سرچو در راہِ شہادت ❁ نہادہ سر بہ پائے او سعادت
شہید و غازی و تیغ مہند ❁ امام و سید السادات احمد
شریعت را رسید ازوے رواجے ❁ طریقت یافت بر سر طرفہ تاجے
بشکست از ملک ہندستاں رشادش ❁ سوادِ شرک و بدعت از سوادش
بہ ملک سکھ چو تیغ او علم شد ❁ سر ہر سرکش از دستش قلم شد
بہ دارالضرب دیں زد سکہ زانساں ❁ کہ رفت از ہند شورش تا خراساں

چو از ذوقِ شہادت تشنہ لب بود
چو جامش یافت شد خود رفت و آسود

دوسری نظم

سید عبدالرزاق حسنی حسینی متخلص بہ کلامی رائے بریلی کے باشندے تھے اور ٹونک میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے صمصام الاسلام یا مجاہدات الاخیار کے نام سے فتوح الشام کو نظم کیا تھا۔ اس میں حمد، نعت، مناقبِ اصحاب واہل بیت ومناقب سید عبدالقادر جیلانی کے بعد ”حضرت شمس العارفین امام الزاہدین، مجدد ماۃ ثالث وعشر سیدنا ومرشدنا مولانا جناب سید احمد غازی وشہید کے مناقب یوں لکھتے ہیں:

قلم کو ہیں میرے ہزار افتخار ❁ کہ لکھتا ہے وصفِ شہ نامدار

شہ اصفیاء سید احمد بنام ❁ سپہر ہدایت کے ماہ تمام
وہ تھے نور چشم امام رسل ❁ وہ تھے عاشق خالق جزو کل
وہ ساقی جامِ شرابِ طہور ❁ فرشتہ بہ سیرت تھے صورت میں نور
عیاں شان سے ان کے تھی شانِ حق ❁ کہ مخلص ہوئے ان کے قربانِ حق
نہیں ہند میں کوئی شہر و دیار ❁ کہ مخلص نہ ہوں ان کے واں بیشمار
عنایت سے جس پر نظر ڈال دی ❁ وہیں ہوگیا بس وہ کامل ولی
وہ امی تھے ایسے کہ عالم بڑے ❁ ہوئے مستفیض اور خادم رہے
وہ تھے اہل حق اور فنا فی الرسول ❁ گریزاں تھے ان سے ظلوم وجہول
نہ تھی خادموں کو کچھ ان کے ہوس ❁ رضائے الٰہی کے خواہاں تھے بس
فنا عشقِ مولا میں وہ ہوگئے ❁ ہیں دونوں جہاں انکے قدموں تلے
خوشی سے وہ جامِ شہادت چڑھا ❁ ہوئے واصلِ حضرت کبریا
ہمیشہ ہو ان پر خدا کا کرم
وہ تھے ہادی و رہنمائے امم(۱)

مومن کے فارسی قصیدے

حکیم مومن نے میرے علم کے مطابق سید صاحب کی مدح میں دو قصیدے کہے۔ پہلا قصیدہ انسٹھ شعر کا تھا، دوسرا ایک سو دس کا۔ دونوں عرفی کے قصیدوں پر کہے تھے۔ ان میں سے منتخب اشعار ذیل میں درج ہیں۔ پہلا قصیدہ:

ازفیض عام کیست؟ ندانم کہ ایں زماں ❁ زری کند نثار بہ ہر کشور آفتاب
اے خاکیاں! نوید کہ خرم زمانہ ایست ❁ نیکوست چرخ باہمہ نیکوتر آفتاب
سردست بستہ داد کشاد گرہ فلک ❁ برفرقِ بے کلاہ نہاد افسر آفتاب

---

(۱) "صمصام الاسلام" مطبوعہ اعظم المطابع جون پور ص: ۴۰۔

خواہد تلافیے کند ایامِ رفتہ را ❁ ناہید از طرب بہ زر و گوہر آفتاب
بر ہر ستارہ سوختہ سوز و دلِ فلک ❁ ہر غم کشیدہ را کشد اندر بر آفتاب
او کارگر دکار سرانجام کن فلک ❁ او حکمراں و حکم بجا آور آفتاب
سبطِ نبیؐ امامِ زماں زاقتصابِ او ❁ بر روئے خاک ریخت زرِ افسر آفتاب
او دورِ چرخ و حکم خداوند آسماں ❁ او ماہتاب و سنت پیغمبر آفتاب
بر منبرے کہ خطبہ بنامش ادا کنند ❁ سوزد بہ داغ حسرت آں منبر آفتاب
زنارِ کہکشاں شکند ہند وے فلک ❁ صہبائے نور افگند از ساغر آفتاب
کم پایہ خادمانِ ترا خادم آسماں ❁ کم رتبہ چاکرانِ ترا چاکر آفتاب
لشکر کشی چنانکہ بہ فوج تو می رود ❁ مریخ پیش پیش و پسِ لشکر آفتاب
تا در مجاہدان بشمارند ہر سحر ❁ بر خصمت از شعاع کشد چادر آفتاب
تا خطبۂ مدیح تو خواندیم و او را ❁ آورد ماہ سیم نثار و زر آفتاب

دوسرے قصیدے میں آسمان کے ظلم و جور بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ز جاں گزشتم و از جانِ نے توانم رفت ❁ بہ نیم جذبہ مگر داورم کند امداد
سپہر مرتبہ ممدوحِ قدسیاں احمد ❁ امیرِ لشکرِ اسلام، امامِ پاک نہاد
بے شمار عطائیش قواعد دگر است ❁ رقم کنند پے صد ہزار صفر احاد
نظارۂ تو بر تیرگی ز دل گویا ❁ سرشت تست بہ نورِ ہدایت و ارشاد
پیامِ داعی ویراں بہ حضرتت ایں است ❁ کہ اے ز مقدمِ تو ہر خرابہ نور سواد
بیا وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ چو ماہ تمام ❁ تمام ساختہ کارے کہ کردہ بنیاد(۱)

---

(۱) مومن کا فارسی کلام صرف ایک مرتبہ چھپا تھا اب بہت کمیاب ہے۔ صدیق مکرم امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتب خانہ رام پور نے میری درخواست پر یہ دونوں قصیدے اور بعض دوسرے قطعات نقل کرا کے بھیج دیے، جس کیلئے وہ دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔

مومن کے اردو اشعار

حکیم مومن نے اردو میں بھی بہت سے شعر سید صاحب کی مدح میں لکھے ہیں۔

مثلاً:

خدایا لشکر اسلام تک پہنچا کے آپہنچا ❁ لبوں پر دم بنا ہے جوشِ خوں شوقِ شہادت کا
نہ کر بیگانہ مہر امام اقتدا سنت ❁ کہ انکار آشنائے کفر ہے انکی امامت کا
امیر لشکر اسلام کا محکوم ہوں یعنی ❁ ارادہ ہے مرا فوج ملائک پر حکومت کا
زمانہ مہدئ موعود کا پایا اگر مومن ❁ تو سب سے پہلے تو کہیو سلام پاک حضرت کا

شوقِ بزمِ احمد و ذوقِ شہادت ہے مجھے ❁ جلد مومن لے پہنچ اس مہدئ دوراں تلک

جو سید احمد امامِ زماں وائلِ زماں ❁ کرے ملاحدِ بے دین سے ارادۂ جنگ
تو کیوں نہ صفحۂ عالم پہ لکھے سالِ وغا ❁ خروجِ مہدئ کفار سوز کلکِ تفنگ
۱۲۴۲ھ

ایک قطعہ

سید صاحب کے متعلق ایک قطعہ درج ہے:

گلاب ناب سے دھوتا ہوں مغز اندیشہ ❁ کہ فکر مدحت سبط قسیم کوثر ہے
وہ کون امام، امام حامیانِ احمدؐ ❁ کہ محض مقتدئ سنت پیمبرؐ ہے
زمیں کو مہر فلک سے نہ کیوں ہو دعویٰ نور ❁ کہ اس کا رایت اقبال سایہ گستر ہے
عروج سنگ در قصر جاہ کو جس کے ❁ ہزار طعن حضیض اوج لامکاں پر ہے
زبسکہ کام نہیں ہے اسے سوائے جہاد ❁ جو کوئی اس سے مقابل ہے سو وہ کافر ہے

شرف ہے مہر کو اسکے زمانے سے دائم ❀ زبسکہ روز و شب انصاف سے برابر ہے
وہ بادشاہِ ملائک سپاہ کو کب دیں ❀ کہ نورِ شمس و قمر جس کے گرد لشکر ہے
وہ شعلہ خصلت و حساد سوز و کفر گداز ❀ کہ جس کا نقش قدم مہرِ روز محشر ہے
وہ برقِ خرمن و باب شرک اہل ضلال ❀ کہ شعلہ خوشۂ حاصل تو دانہ اخگر ہے
وہ قہرمان فلک توسن و نجومِ حشم ❀ کہ ترک چرخ غلام اسکا مہر چاکر ہے

وہ شاہِ مملکت ایماں کہ جس کا سالِ خروج
امام برحق مہدی نشاں علی فر ہے
۱۲۴۲ھ

مثنوی جہادیہ

آپ مولانا خرم علی بلہوری کا ایک جہادیہ سیرت سید احمد شہید میں پڑھ چکے ہیں۔ حکیم مومن خاں نے بھی جہاد پر ایک مثنوی لکھی تھی جو ذیل میں درج ہے:

یہی اب تو کچھ آگیا ہے خیال ❀ کہ گردن کشوں کو کروں پائمال
بہت کوشش و جاں نثاری کروں ❀ کہ شرع پیمبر کو جاری کروں
دکھادوں بس انجام الحاد کا ❀ نہ چھوڑوں کہیں نام الحاد کا
نہ کیونکر ہوں اس کام میں ناشکیب ❀ ظہورِ امامِ زماں ہے قریب
وہ خضر طریقِ رسولِ خدا ❀ کہ سایے سے جس کے خجل مہر و مہ
زہے سید احمد قبولِ خدا ❀ سرِ امتحانِ رسولؐ خدا
نکو گوہری کا نہ پوچھو شرف ❀ علیؓ و حسینؓ و حسنؓ کا خلف
رہے حشر تک زندہ وہ نیک ذات ❀ ہے کفار کی موت اس کی حیات
خدا نے مجاہد بنایا اسے ❀ سرِ قتل کفار آیا اسے

دم اس دست و بازو پہ دیوے اجل ❁ لب تیغ کے بوسے لیوے اجل
اجل میں ہمیشہ دواں ہو ظفر
رکاب اس کی پکڑے رواں ہو ظفر

کہوں کیا لوائے امامت کا اوج ❁ کہ ہیں غوث و ابدال سب اہل فوج
خبردار ہو جاؤ اے اہل دل ❁ کہ رحمت برستی ہے اب متصل
ہوا مجتمع لشکر اسلام کا ❁ اگر ہو سکے وقت ہے کام کا
ضرور ایسے مجمع میں ہونا شریک ❁ کہ خوش تم سے ہو وحدہٗ لاشریک
جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا ❁ فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا
حبیبِ حبیبِ خداوند ہے ❁ خداوند اس سے رضامند ہے
امامِ زمانہ کی یاری کرو
خدا کے لئے جاں نثاری کرو

سمجھ لو جو کچھ بھی ہے تم کو تمیز ❁ نہ جاں آفریں سے کرو جاں عزیز
کسی کو نہیں ہے اجل کی خبر ❁ کہ آجائے بیٹھے ہوئے اپنے گھر
تو مقدور کس کا کہ آنے نہ دے ❁ تن خستہ سے جاں کو جانے نہ دے
تو بہتر یہی ہے کہ جاں کام آئے ❁ پسِ مرگ تربت میں آرام پائے
قیامت کو اٹھو تو تم بامراد
لب الحمد گو اور دل شاد شاد

عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرو ❁ حیات ابد ہے جو اس دم مرو
جو ہے عمر باقی تو غازی ہو تم ❁ سزاوار گردن فرازی ہو تم
یہ ملکِ جہاں ہے تمہارے لیے ❁ نعیم جناں ہے تمہارے لیے

شراکت جہاں کی ہے طالع کا اوج ❀ کہ ایسا امام اور ایسی ہے فوج
سعادت ہے جو جانفشانی کرے
یہاں اور وہاں کامرانی کرے

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب ❀ یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار ❀ پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار
تو اپنی عنایت سے توفیق دے ❀ عروج شہید اور صدیق دے
کرم کر نکال اب یہاں سے مجھے ❀ ملا دے امامِ زماں سے مجھے
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں ❀ مری جاں فدا ہو تری راہ میں
میں گنج شہیداں میں مسرور ہوں
اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

فارسی کی دو نظمیں

میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس ایک قلمی نسخہ دیکھا تھا، اس کا نام تھا **ملهماتِ احمدیه فی الطریق المحمدیه** منتخب از "**صراطِ مستقیم مع فوائد وزوائد**" از مولوی الٰہی بخش کاندھلوی۔ اس میں سید صاحب کے متعلق دو فارسی نظمیں بھی تھیں جو ذیل میں درج ہیں۔ ان میں نشاط تخلص استعمال کیا گیا ہے۔ معلوم ہے کہ مفتی صاحب نشاط تخلص فرماتے تھے جیسا کہ "تذکرہ" میں ان کے منتخب اردو اور فارسی اشعار سے واضح ہے۔ (۱)

دوست ہر لحظہ بر ما شد پے غمخواری ما ❀ از چہ رہ روز فزوں گشت دل افگاری ما
ہست نزدیک ترا ز جاں بہ من خستہ حبیب ❀ از کجا خاست ندانم تپش و زاری ما

---

(۱) التذکرۃ مشمولہ شرح قصیدہ بانت سعاد از مفتی الٰہی بخش۔

یار اندر بغل وحسرت دیدار ہماں ❁ آہ زیں وصل کہ افزود طلب گاری ما
یارب احوال دل خستہ ندانم چہ شود ❁ میر احمد نہ رسد گر بہ طلب گاری ما
اے نشاط ار چہ ضعیفی طلب ہمت کن
غیر ازیں سید برحق کہ کند یاری ما

جناب سید احمد کہ باشد فیض ربانی ❁ بسان مہر انوری کند ہر ذرہ نورانی
مجدد الف ثانی شد جناب احمد اول(۱) ❁ مجدد ماۃ ثالث جناب احمد ثانی(۲)
بہ خلق احمدی کامل بہ نور ایزدی واصل ❁ نمود اندر رضاء حق رضائے خویش را فانی
طریقت کار و بار او شریعت پیش کار او ❁ حقیقت ہست یار او، بہ یمن لطف سبحانی
نیارد خطرہ در خاطر بجز تائید دین حق ❁ نیاید در خیال او مگر مشروع حقانی
پس اے خورشید را او دیں بہ پشت عرش می دارد ❁ غریبے بے سر و ساماں نشاط از فرط حیرانی
بپائے سعی خود تا منزل مقصود رسیدن را ❁ بسے دشواری بینم بفرما ہمت ارزانی
بعید از ہمت نبود کہ چوں من بے پر و بالے
بہ بال زور بازویت رسد تا قرب یزدانی

سب سے آخر میں مولوی نجف علی صاحب جھجری کے چند اشعار پیش کرتا ہوں جو موصوف نے ایک کتاب میں لکھے تھے۔ یہ کتاب دساتیری فارسی میں لکھ کر نواب وزیر الدولہ کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ مجھے اس کا ایک قلمی نسخہ اپنے عزیز دوست خلیل الرحمٰن صاحب داؤدی کے پاس دیکھنے کا موقع ملا، جو غالباً اصل کتاب کا واحد نسخہ تھا۔ اس میں سید صاحب کے متعلق مرقوم ہے۔

---

(۱) مراد ہے شیخ احمد سرہندیؒ۔
(۲) مراد ہے سید احمد سے۔ تخصیص کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دونوں بزرگ طریقۂ نقشبندیہ کے مشہور مرشد تھے۔

تابش گوہر خدا دانی ❁ رہبر یتمسار یزدانی
سرورِ آگہانِ رازِ نہاں ❁ پیشوائے ستودگانِ جہاں
سید احمد گزیدہ داوار ❁ تخمۂ پاک احمد مختارؐ
مصطفیٰؐ را ستودہ فرزندے ❁ مرتضیٰؓ را گزیدہ دل بندے
دل نہ بستہ دریں نشیمنِ خاک ❁ پا فشردہ بہ راہِ ایزدِ پاک
یادگارِ گزیدگانِ خدا ❁ پیشوائے رسیدگانِ خدا
سرمۂ چشمِ دل ز خاکش باد
مہر یزداں بہ جانِ پاکش باد

برصغیر ہند میں تحریک احیائے دین اور سرفروشانہ جدوجہد کی مکمل سرگذشت

حصہ دوم

مجاہدین ورفقاء

پہلا باب:

مولانا عبدالحیؒ

عبدالحیؒ بن ہبۃ اللہ بن نور اللہ، وطن بڑھانہ ضلع مظفر نگر۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے آپ کے دو گونہ رشتے کا ہمیں علم ہے۔ اول یہ کہ مولانا عبدالحیؒ کی پھوپھی شاہ صاحب کی اہلیہ تھیں، دوسرے شاہ صاحب کی ایک صاحبزادی کی شادی مولانا عبدالحیؒ سے ہوئی۔ اغلب ہے پھلت والوں کی طرح مولانا کے خاندان کی رشتہ داریاں بھی پہلے ہی سے شاہ صاحب کے خاندان سے ہوں۔ شاہ صاحب کی صاحبزادی سے مولانا کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ تعلیم دہلی ہی میں خود شاہ صاحب اور ان کے بھائیوں سے پائی۔ چوں کہ بہت قریبی رشتہ دار تھے، اس لئے شاہ عبدالعزیز بہت شفقت فرماتے تھے اور مولانا عبدالحیؒ اپنے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کے باعث زیادہ سے زیادہ شفقت کے مستحق تھے۔ مولانا نسباً صدیقی تھے "ابجد العلوم" میں بہ حوالہ "الیانع الجنی" مرقوم ہے کہ شاہ عبدالعزیز کے شاگردوں میں سے فقہ حنفی مولانا سے بہتر کوئی نہ جانتا تھا اور درسیات میں بھی ان سے زیادہ ماہر کوئی نہ تھا۔(۱)

ملازمت

انگریزوں کو ابتدائے حکومت میں اس بات کی بڑی خواہش وجستجو تھی کہ خاندانی اور ذی وجاہت علماء افتاء وصدارت کے مناصب قبول کریں، تاکہ شمالی ہند میں انگریزی حکومت عوام کے نزدیک مقبول ہو سکے۔ چنانچہ میرٹھ میں مفتی عدالت کا عہدہ خالی ہوا تو

---

(۱) "ابجد العلوم"، ص: ۹۱۵۔

کوشش کی گئی کہ شاہ عبدالعزیز مولانا عبدالحئی کو یہ عہدہ قبول کرنے کی اجازت دے دیں اور انہوں نے اجازت دیدی۔ یوں کچھ مدت تک مولانا عبدالحئی میرٹھ میں مفتی عدالت بھی رہے۔

بیعت

سید صاحب نواب امیر خاں کا ساتھ چھوڑ کر دہلی آئے اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ایک مستقل جماعت کی تاسیس کا انتظام کرنے لگے تو مولانا عبدالحئی کو سید صاحب سے کسب فیض کا موقع ملا، جس کی کیفیت ''سیرت احمد شہید'' میں پیش کی جا چکی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا عبدالحئی نے شاہ عبدالعزیز کے مشورے کے مطابق سید صاحب سے نمازِ حضورِ قلب کے متعلق سوال کیا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ مولانا! بات چیت سے تو یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اٹھیے اور میرے پیچھے دو رکعت نماز پڑھیے۔ اس کے بعد مولانا نے بیعت کر لی اور شاہ اسمٰعیل بھی انہیں کی ترغیب سے سید صاحب کے مرید ہوئے۔ (۱)

نواب وزیر الدولہ نے ''وصایا'' میں اس واقعہ کا ذکر یوں کیا ہے کہ مولانا نے صحابہ کرامؓ کی نماز کا اشتیاق ظاہر کیا تھا۔ سید صاحب نے ترکیب بیان فرمادی۔ مولانا نے نمازِ عشاء کے بعد اسی ترکیب کے مطابق دو رکعت نفل کی نیت باندھی۔ سید صاحب حجرے کے دروازے پر بیٹھ گئے۔ مولانا نے پوری رات انہیں دو رکعتوں میں گزار دی۔ بس اس وقت سے سید صاحب کے ساتھ ایسی عقیدت اور راہِ ایمان پر ایسی استقامت نصیب ہوئی کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ (۲)

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ خدا نے مجھے ایسے شیخ کی خدمت میں پہنچایا، گویا حضرت خضر کی زیارت نصیب ہوئی، لیکن مجھے ان سے اس کے سوا کوئی غرض نہیں کہ اپنے لئے دعا

---

(۱) سیرت شہید جلد اول ص: ۱۱۶-۱۱۷۔　(۲) ''وصایا'' حصہ دوم ص: ۷-۱۔

کراؤں۔(۱)

رفاقت

مولانا جب سے مرید ہوئے سید صاحب کی رفاقت نہ چھوڑی۔ سفر وحضر میں اکثر ساتھ رہتے، سفر حج میں بھی ساتھ تھے اور سید صاحب کے جہاز میں حجاز پہنچے تھے۔ اسی سفر میں یمن کے مشہور محدث قاضی محمد بن علی شوکانی سے مکاتبتاً حدیث کی سند لی اور ان کی کتاب "موضوعات" مولانا ہی ہندوستان لائے۔ ردِ بدعات، احیائے سنن اور ترغیب جہاد میں مسلسل وعظ فرماتے رہے۔ وعظ کا آغاز مدرسے میں ہوا تھا۔ جب لوگ بہ کثرت شامل ہونے لگے تو شاہی مسجد میں اجتماع ہونے لگا۔ مولانا رشید الدین مرحوم سے بدعات ومحدثات کے متعلق آپ کا اور شاہ اسمٰعیل کا ایک مناظرہ بھی ہوا تھا، جس کی روئداد آپ نے مرتب فرمادی تھی۔(۲)

بیان کیا جاتا ہے کہ معترضوں کی طرف سے مولانا رشید الدین سترہ سوال مرتب کرکے لائے تھے، وہ پیش ہوئے تو مولانا عبدالحیؒ نے فرمایا:

> "ملائے محض نیستم، سپاہی گری ہم دانم۔ اگر باساز وتفنگ گراں بار قطع یک منزل راہ پیادہ پانمودہ باشم وتعب آں دامن گیر حال من باشد، درآں وقت نیز اگر سوالات پیش خواہید نمود، بہ تائید تعالیٰ جواب باصواب خواہید یافت۔"
>
> **ترجمہ**: میں نرا ملا نہیں، سپاہ گری بھی جانتا ہوں۔ اگر بھاری بندوق اور گولی بارود لے کر ایک منزل پیادہ طے کرکے آؤں اور تکان کے باعث چور چاؤں۔ اس وقت بھی جو سوالات پیش کروگے، خدا کی مدد سے ان کا شافی جواب پاؤگے۔

---

(۱) "وصایا" حصہ دوم ص: ۱۰۷۔

(۲) تراجم علمائے اہل حدیث ص: ۱۴۷۔

ہجرت

مولانا، سید صاحب کے ساتھ جہاد کیلئے نکلے تھے۔ نواب وزیر الدولہ فرماتے ہیں کہ ٹونک پہنچنے کے بعد مولانائے موصوف، حاجی احمد اور مولانا عبد القدوس کو مریدوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مقرر فرما دیا۔ میرا خیال ہے کہ انہیں بعض انتظامات کی تکمیل کے لئے روک دیا تھا۔ مولانا کو سید صاحب سے مفارقت گوارا نہ تھی، لیکن حکم کی بنا پر ٹھہر گئے، تاہم ہر وقت انتظار رہتا کہ سید صاحب کب بلاتے ہیں۔ پانچ مہینے گذر جانے کے بعد سید صاحب کی طرف سے نامۂ طلب صادر ہوا۔ مولانا نے فوراً سفر کا سامان تیار کیا اور روانہ ہو گئے۔ اگر چہ پرانی بیماریوں کے باعث بہت کمزور ہو گئے تھے، لیکن سید صاحب سے ملاقات کے شوق میں سب کچھ بھلا دیا۔ راستہ چلتے چلتے رفیقوں سے الگ ہو جاتے۔ سید صاحب کا خط نکال کر پڑھتے تو بے اختیار رقت طاری ہو جاتی۔ پھر شوق گرم جوشی سے تیز چلنے لگتے۔ جو شخص سامنے آتا کہتے، مجھے سید صاحب نے طلب فرمایا ہے۔ غرض اس حال میں لمبا سفر طے کیا جیسے عاشق محبوب کی خدمت میں جاتا ہے۔ سید صاحب سے ملاقات کے بعد دوستوں کو جو خط لکھا اس میں مرقوم تھا:

> "مجھ پر ویسی ہی حالت طاری ہوئی جس کا ذکر حدیث شریف میں آیا ہے کہ قیامت کے وقت مومن کو جنتِ معنی میں غوطہ دیں گے اور اس نے زندگی میں جو مصیبتیں اور مشقتیں برداشت کیں ان کا رنج و ملال جان و تن سے دھل جائے گا۔(۱)"

سفر کا راستہ

مولانا تھانیسر، مالیر کوٹلہ، ممدوٹ اور بہاول پور ہوتے ہوئے سرحد پہنچے تھے۔

---

(۱) "وصایا" حصہ دوم ص: ۱۰۷-۱۰۹۔

مسافت کے طول اور مشقتوں کو مدنظر رکھیں تو شانِ عزیمت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس کی سرسری کیفیت یہ ہے کہ نواحِ بہاول پور سے شکار پور تک کا پورا علاقہ زیرِ آب تھا۔ دس روز کی مسافت چھتیس روز میں طے کر کے بہاول پور سے شکار پور پہنچے۔ پھر بھاگ، حاجی شھڑی ہوتے ہوئے براہ بولان قندھار گئے۔ بیماری کے باعث وہاں تقریباً ڈیڑھ مہینہ ٹھہرے رہے۔ قندھار سے ۸ر شوال کو کابل، ۱۸ر کو جلال آباد پہنچے۔ پھر پشاور کا راستہ چھوڑ کر مہمند اور باجوڑ کے مواضع سے ہوتے ہوئے چار باغ سوات میں سید صاحب سے ملاقی ہوئے۔ شدید سردی اور برف باری کا موسم کچھی (بلوچستان) میں گزارا۔ انہیں کے سفر ہجرت کو مولوی محمد جعفر مرحوم تھانیسری نے غلطی سے سید صاحب کا سفر ہجرت قرار دے لیا۔ حالاں کہ سید صاحب دوسرے راستے سے گئے تھے۔

یہ اوائل ذی الحجہ ۱۲۴۲ھ (اواخر مئی ۱۸۲۷ء) کا واقعہ ہے۔ سید صاحب کے ساتھ پنجتار گئے۔ جب انہوں نے درانی سرداروں کی مخالفانہ تدبیروں کو ختم کرنے کی غرض سے خہر (سوات) میں قیام ضروری سمجھا تو مولانا بھی ساتھ آئے۔

وفات

بہت بوڑھے ہو چکے تھے، پھر بواسیر کا شدید دورہ ہوا ''وقائع'' کا بیان ہے کہ کوئی دوا مفید نہ پڑتی تھی اور بیماری بڑھتی جاتی تھی، یہاں تک کہ مولانا پر نزع کی حالت طاری ہو گئی:

> ''کسی وقت آپ بے ہوش ہو جاتے تھے اور کسی وقت ہوش میں آتے تھے۔ آپ کا یہ حال سن کر حضرت علیہ الرحمۃ (سید صاحب) تشریف لائے۔ جب مولانا صاحب کو ہوش آیا، حضرت کو دیکھا اور پہچانا۔ حضرت نے پوچھا کہ اس وقت کیا حال ہے؟ کہا نہایت تکلیف ہے۔ آپ میرے واسطے دعا کریں اور میرے سینے پر اپنے قدم دھریں کہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس مصیبت سے مجھ کو نجات دے۔ آپ (سید صاحب) نے فرمایا: مولانا صاحب! آپ

> کے سینے میں علم قرآن وحدیث کا گنجینہ ہے، یہ اس قابل نہیں کہ میں اس پر قدم رکھوں۔ پھر آپ نے بسم اللہ کر کے اپنا دست مبارک رکھا۔ مولانا صاحب کو قدرے تسکین ہوئی اور کئی بار "اللہ رفیق الاعلیٰ، اللہ رفیق الاعلیٰ" اپنی زبان سے کہا اور یہی کہتے کہتے انتقال فرمایا۔ (۱)

شعبان ۱۲۴۳ھ کی آٹھویں تاریخ تھی (۲۴ فروری ۱۸۲۸ء) اور انتقال رات کے وقت ہوا تھا۔ اگلے دن صبح کے وقت شاہ اسمٰعیل، مولوی محمد حسن رام پوری، قاضی علاؤ الدین پھلردی، میاں جی نظام الدین چشتی اور میاں جی محی الدین غسل میت میں مصروف ہو گئے۔ سید صاحب مولانا کے فضائل ومحاسن بیان کرتے رہے۔ آپ نے فرمایا۔ مولانا دین کے ایک رکن تھے اور بڑی برکت والے شخص تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھا لیا، جو مرضی مالک کی۔ آنکھوں سے برابر آنسو بہہ رہے تھے۔ جنازہ اٹھانے والوں میں خود سید صاحب بھی تھے۔ آپ ہی نے نماز جنازہ پڑھائی، جس میں اہل خمر کے علاوہ تقریباً سات سو مجاہدین شریک تھے۔ خمر کے جنوب مشرق میں ایک تیر کے فاصلے پر قبرستان تھا، جہاں لشکر اسلام کے اس مایۂ ناز شیخ الاسلام کو دفن کیا گیا۔ آج تک یہ مزار "ڈکی بابا" کا مزار کہلاتا ہے۔

تربیت کا عمدہ نمونہ

مولانا عبدالحئی سید صاحب کی دینی تربیت کے کمال کا ایک نہایت عمدہ نمونہ تھے۔ علم وفضل، بڑھاپے، ضعف وناتوانی، وطن، اہل وعیال اور عزیزوں سے بالکل بے پروا ہو کر رضائے باری تعالیٰ کے ابتغاء میں سرحد پہنچ گئے اور اسی حالت میں مالک حقیقی سے جا ملے۔ رضائے حق کا یہ جذبہ سید صاحب ہی کی تربیت وصحبت کی بدولت بیدار ہوا۔

مولانا نے وفات سے پیشتر ایک وصیت نامہ لکھوا دیا تھا، جس میں تمام چیزیں اپنی

---

(۱) "وقائع"، ص: ۴۳۵۔

دوسری اہلیہ (والدۂ مولانا عبدالقیوم) کے حوالے کر دی تھیں۔ مولانا عبدالقیوم کا سن اس زمانے میں تیرہ چودہ سال ہوگا۔ وہ سید صاحب کے ساتھ سرحد پہنچ گئے تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد سید صاحب عبدالقیوم کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے۔ پھر اس خیال سے انہیں ہندوستان بھیج دیا کہ ان کی والدہ کو مولانا کے انتقال کی خبر ملے گی تو ان کے پاس غم غلط کرنے کا بھی کوئی ذریعہ ہونا چاہیے۔ عبدالقیوم کے دو حقیقی ماموں شیخ جلال الدین اور شیخ صلاح الدین ساتھ ہندوستان آئے۔

اہل و عیال

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ شاہ عبدالعزیز کی صاحبزادی سے مولانا کی کوئی اولاد نہ تھی۔ غالباً اس اہلیہ کی وفات پر مولانا نے اپنی چچیری بہن سے شادی کی جن سے عبدالقیوم پیدا ہوئے۔(۱) جب سید صاحب نے نکاحِ بیوگان کی سنت تازہ کی تو شاہ اسمٰعیل نے محض بغرض احیاءِ سنت اپنی بیوہ ہمشیر کی شادی مولانا عبدالحئی ہی سے کر دی تھی، گویا انتقال کے وقت مولانا نے دو بیوائیں چھوڑیں۔ سید احمد علی رائے بریلوی نے نواب وزیرالدولہ کو مولانا کے انتقال کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا کہ دونوں بیواؤں کے لئے امداد کا بندوبست کر دیا جائے۔

بعض مبالغہ آمیز باتیں

آخر میں دو باتوں کا ذکر ضروری ہے، بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ سید صاحب نے دوسرا نکاح کیا تو ایک مرتبہ خلافِ معمول صبح کی جماعت میں کچھ تاخیر ہوگئی۔ دوسرے دن پھر سید صاحب سے تکبیر اولیٰ فوت ہوگئی۔ مولانا عبدالحئی نے سلام پھیرنے کے بعد سید صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ عبادتِ الٰہی ہوگی یا شادی کی عشرت؟ سید صاحب

---

(۱) فیض روحِ قدسی کا بیان بھی یہی ہے۔

نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا۔ ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ سید صاحب نے فرمایا: مجھ سے کوئی بات خلافِ سنت دیکھئے تو متنبہ کر دیجئے۔ مولانا عبدالحئیؒ نے کہا: جب آپ سے کوئی مخالفِ سنت فعل دیکھوں گا تو آپ کے ساتھ ہوں گا ہی کہاں؟

میرے نزدیک یہ دونوں باتیں مبالغہ آمیزی پر مبنی ہیں۔ سید صاحب سے غلطی کا صدور غیر ممکن نہ تھا، لیکن ایسی کوئی مستند روایت نہیں ملتی کہ آپ عشرت میں مبتلا ہوکر واجبات میں تساہل کے مرتکب ہوئے ہوں اور مولانا عبدالحئیؒ کا تعلق سید صاحب سے ایسا نہ تھا کہ "عبادتِ الٰہی ہوگی یا شادی کی عشرت" جیسا جملہ فرماتے۔ اس میں تبلیغ کی بھی کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ عبادتِ الٰہی میں سید صاحب غیر معمولی مشقتیں برداشت کرتے رہے۔ نواب وزیرالدولہ کے بیان کے مطابق انہوں نے مدت تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی۔ وہ اپنی جماعت میں عزیمت کا ایک عجیب و غریب پیکر تھے اور جو کچھ مذکورہ بالا واقعے میں ان سے منسوب کیا گیا ہے، اسے کسی درجے میں بھی قابلِ قبول نہیں سمجھا جا سکتا۔ رہی دوسری بات تو وہ مولانا عبدالحئیؒ کے لئے سراسر نازیبا ہے۔

ایک شخص کہتا ہے کہ مجھ سے خلافِ سنت فعل سرزد ہو تو آگاہ کر دیجئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اتباعِ سنت کا خواہاں ہے۔ ہوسکتا ہے، نادانستہ اس سے کوئی خطا سرزد ہو جائے۔ اس حالت میں ہر عالمِ سنت کا فرض یہی ہے کہ اسے آگاہ کر دے۔ اس کا ساتھ چھوڑ جانے کی دھمکی کون سی دین پروری ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ لوگ اشخاص کے محاسن بیان کرتے وقت جوشِ عقیدت میں بعض بنیادی باتیں نظر انداز کر جاتے ہیں۔ مولانا عبدالحئیؒ یقیناً بہت بڑے بزرگ تھے اور ان کی زندگی کے روشن شواہد ہمارے سامنے موجود ہیں، لیکن مبالغہ آمیز واقعات ان کی عظمت میں قطعاً کوئی اضافہ نہیں کرتے۔

صراطِ مستقیم کا عربی ترجمہ

مولانا عبدالحئیؒ "صراطِ مستقیم" کی ترتیب میں بھی شریک رہے۔ وہ اور شاہ اسمٰعیل

سید صاحب کی زبان سے جو حقائق سنتے تھے، انہیں قلمبند کر کے آپ کو سنا دیتے تھے۔ کتاب کا ایک حصہ شاہ اسمٰعیل کا مرتبہ ہے اور باقی مولانا عبدالحئی کا لکھا ہوا ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ان بزرگوں کو اپنی تحریرات میں پانچ پانچ مرتبہ ترمیم کرنی پڑی۔ اس کے بعد سید صاحب نے اس پر اظہارِ اطمینان فرمایا۔ قیامِ حرمین کے زمانے میں مولانا عبدالحئی نے ''صراطِ مستقیم'' کا ترجمہ عربی میں کر دیا تھا تاکہ عربی داں اصحاب بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ مولانا موصوف نے نکاحِ بیوگان پر بھی ایک رسالہ مرتب فرمایا تھا۔ ممکن ہے ''صراطِ مستقیم'' کی طرح اس رسالے کی بھی عبارت مولانا عبدالحئی کی ہو، لیکن یہ خود سید صاحب کا ہے، اس لئے کہ اس کے تمام مطالب سید صاحب نے ارشاد فرمائے تھے۔ میں نے اس کے جتنے قلمی نسخے دیکھے، ان میں اس کا انتساب سید صاحب ہی سے کیا گیا تھا۔

علم و فضل

مولانا عبدالحئی کے علم و فضل کی تعریف خود شاہ عبدالعزیز نے فرمائی۔ ایک مرتبہ کہا کہ علم تفسیر میں مولانا عبدالحئی میرا نمونہ ہیں۔ ایک خط میں شاہ صاحب نے مولانا اور شاہ اسمٰعیل کو تاج المفسرین، فخر المحدثین اور سرآمد علماءِ محققین لکھا، نیز فرمایا کہ دونوں تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، منطق وغیرہ میں مجھ سے کم نہیں۔ دونوں کو علماءِ ربانی میں شمار کیا۔ خود مولانا کی یہ حالت تھی کہ بار بار فرماتے، مجھے جو کچھ ملا، سید صاحب کی برکت سے ملا۔

شاہ اسمٰعیل بعض اوقات غصے میں بے قابو ہو جاتے تھے۔ چنانچہ گڑھی امان زئی میں جو واقعہ پیش آیا ''وہ سید احمد شہید'' میں نقل ہو چکا ہے۔(۱) درانیوں کی طرف سے ایک قاصد آیا، وہ انعام لینے کی غرض سے بالا خانے کی سیڑھی پر کھڑا ہو گیا، جہاں سید صاحب

---

(۱) سید احمد شہید جلد دوم ص: ۲۸۵۔

مقیم تھے۔ شاہ صاحب نے اسے نرمی سے ہٹانے کی کوشش کی تو وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔ شاہ صاحب نے دو تین طمانچے مارے۔ ایک مرتبہ ان کا ہاتھ سیڑھی میں لگا جو لکڑی کی تھی۔ ایک باریک ریشہ ہتھیلی میں چبھا اور خون جاری ہو گیا۔ عین اس وقت سید صاحب برآمد ہوئے۔ خون دیکھ کر واقعہ پوچھا اور سنا تو فرمایا آپ کا غصہ بڑھ رہا ہے، اسے دور کرنا چاہیے۔ بعد ازاں شاہ صاحب نے منشی محمدی نصاری کے سامنے ندامت کا اظہار کیا۔ منشی صاحب نے کہا کہ مولانا عبدالحئی کو بھی غصہ آتا تھا، لیکن وہ راہِ شریعت سے اِدھر اُدھر کبھی نہ ہوئے۔ غصے کے باوجود شرعی دلائل ان کی تمام باتوں پر غالب رہتے تھے۔ شاہ صاحب نے فرمایا: مولانا کا غصہ ''آورد'' ہوتا تھا، وہ امور شرعیہ پر بہ قصد و ارادہ غصہ لاتے تھے۔ میرا غصہ ''آمد'' ہے جب آتا ہے تو عقل و دانش پر غلبہ پا لیتا ہے۔

غرض صاحب ''الیانع الجنی'' کے قول کے مطابق مولانا عبدالحئی تقویٰ، عمل، تاثیر وعظ، خواہشات کی تقلیل اور لباس و غذا میں قناعت کے لحاظ سے خدا کا نشان تھے۔ بہت کم سخن، متوکل اور باوقار آدمی تھے۔ سنت کے شیدائی، رسوم و بدعات سے متنفر۔ نورِ ایمان ان پر برس رہا تھا۔ صالحیت ان کی پیشانی سے نمایاں تھی۔ اپنی تعریف سن کر ناراض ہوتے، نصیحت سے انہیں خوشی حاصل ہوتی۔ وہ ایسے جامع الصفات بزرگ تھے کہ قلم بیان سے عاجز ہے۔

دوسرا باب:

شاہ اسمٰعیل

بلند نسبتیں

شاہ اسمٰعیل شاہ عبدالغنی کے اکلوتے بیٹے، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے پوتے، شاہ عبدالعزیز محدث، شاہ رفیع الدین محدث اور شاہ عبدالقادر محدث کے بھتیجے تھے۔ پاک وہند کی وسیع سرزمین میں علم وفضل، وعظ وارشاد، درس وتدریس اور خدمت اسلامیت کی ایسی بلند نسبتیں شاید ہی کسی کے حصے میں آئی ہوں، جن سے شاہ اسمٰعیل مشرف ہوئے۔ لیکن شاہ شہید کی عظمت کا اصل سرمایہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے عمل سے ان نسبتوں کی شان برتری کو چار چاند لگا دیے۔

عرفی خوب کہہ گیا کہ:

مایۂ او زندگی از گہر خویش گیر ✿ تا بکے ایں عز و ناز از اب و عم داشتن

یہ بالکل درست ہے، لیکن اگر کسی کو اپنے حسن عمل کے ساتھ بلند نسبتیں بھی میسر آجائیں تو اس کی خوش نصیبی پر کون رشک نہ کرے گا؟

ولادت

شاہ صاحب مستند روایت کے مطابق ۱۲/ربیع الآخر ۱۱۹۳ھ (۱۹/اپریل ۱۷۷۹ء) کو اپنی ننھیال پھلت ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ (۱)

---

(۱) ''حیات طیبہ'' ص۔۱۵، ''حیات ولی'' طبع اول ص:۳۵۲۔

تاریخ ولادت کے متعلق اور روایتیں بھی ہیں، لیکن ان کا استناد محلِ نظر ہے۔

میر شہامت علی نے شاہ صاحب کی مشہور تصنیف ''تقویت الایمان'' کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا تھا، جو ۱۸۵۲ء میں چھپا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دیباچہ بھی لکھا تھا، جس میں شاہ صاحب کی تاریخ ولادت ۱۸ر شوال ۱۱۹۶ھ بتائی، مگر اس کیلئے کوئی حوالہ نہیں دیا، لہذا یہ مستند روایتوں کے مقابلے میں شایانِ توجہ نہیں۔

شاہ صاحب کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی فاطمہ بتایا گیا ہے۔ وہ مولوی علاء الدین پھلتی کی صاحبزادی تھیں، جن کے پوتے شیخ کمال الدین سے شاہ صاحب کی ہمشیر رقیہ کی شادی ہوئی تھی۔

ابتدائی تعلیم

شاہ صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے پائی۔ وہ ۱۶ر رجب ۱۲۰۳ھ (۱۲ر اپریل ۱۷۸۹ء) کو فوت ہو گئے۔ جب شاہ صاحب کی عمر صرف دس سال کی تھی۔ اسی وقت سے شاہ عبدالقادر نے انہیں دامنِ تربیت میں لے لیا، یا سرسید مرحوم کے الفاظ میں ''بجائے فرزندوں کے پرورش کیا''۔ شاہ عبدالقادر کی اولاد میں صرف ایک صاحبزادی تھی، مسماۃ زینب، جس کا عقد شاہ رفیع الدین کے فرزند عبدالرحمٰن عرف مصطفیٰ سے ہوا تھا۔ ان کے بھی صرف ایک بیٹی ہوئی، جس کا نام کلثوم تھا۔ شاہ عبدالقادر نے کلثوم کا نکاح شاہ اسمٰعیل سے کر دیا تھا۔ اس طرح شاہ عبدالقادر کو شاہ اسمٰعیل سے کئی نسبتیں پیدا ہو گئیں۔ اول یہ کہ شاہ اسمٰعیل ان کے حقیقی بھتیجے تھے، دوم یہ کہ انہوں نے شاہ صاحب کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا، سوم یہ کہ اپنی نواسی کا نکاح ان سے کر دیا تھا۔ شاہ عبدالقادر نے اپنی زندگی میں کل جائداد حصصِ شرعیہ کے مطابق اپنی صاحبزادی اور بھائیوں کے نام کر دی تھی اور ان کی اجازت سے ایک حصہ شاہ اسمٰعیل کو دے دیا تھا۔ (۱)

---

(۱) ارواحِ ثلاثہ ص: ۳۹۔

غیر معمولی دل ودماغ

ابتدائی تعلیم کے بعد زیادہ تر کتابیں شاہ عبدالقادر سے پڑھیں۔ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالعزیز سے بھی فیض حاصل کیا۔ دماغ ابتدا ہی سے غیر معمولی تھا۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے:

> "جوہر ذکاوت او بہ غایت عالی افتادہ بود وحکایات ذہانت وفطانت وے ہنوز نقل ہر مجلس وزیب ہر محفل اہل علم است۔"(۱)

> **ترجمہ**: انکی ذکاوت کا جوہر بہت بلند پایہ تھا اوران کے ذہن وفہم کی تیزی کے قصے اب تک اہل علم کی ہر مجلس کیلئے باعث زینت سمجھے جاتے ہیں۔

سرسید نے بھی یہی لکھا ہے کہ ایسے افراد کا پیدا ہونا خدائے ذوالجلال کی قدرت کا ایک خاص کرشمہ تھا۔ غیر معمولی ذہانت کے ساتھ طبیعت میں استغنا بھی بہت تھا۔ مطالعے پر چنداں توجہ نہ تھی۔ سرسید فرماتے ہیں کہ مقامِ سبق اکثر محفوظ نہ رہتا۔ کبھی اصل مقام چھوڑ کر آگے سے شروع کر دیتے۔ شاہ عبدالقادر ٹوکتے تو کہہ دیتے کہ بیچ کا حصہ آسان سمجھ کر چھوڑ دیا۔ کبھی پڑھا ہوا حصہ دوبارہ پڑھنے لگتے۔ تنبیہ پر عرض کر دیتے کہ فلاں فلاں بات سمجھ میں نہیں آئی اور اس پر ایسے اعتراضات وارد کر دیتے کہ استاد کو انہیں دور کرنے کیلئے خاص توجہ کی ضرورت پیش آتی۔

پندرہ سولہ سال کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہو گئے۔ بڑے بڑے عالم راستے میں ان سے ایسے مسائل پوچھ لیتے، جن کا جواب کتابوں اور شرحوں کی مدد کے بغیر نہ دیا جا سکتا، لیکن شاہ اسمٰعیل بے اعانتِ کتب ایسے جواب دیتے کہ عالم محو حیرت رہ جاتے۔ فقہ کا ہر مسئلہ آیات واحادیث سے مستند فرماتے۔ معقول کی بیشتر کتابوں پر حاشیے تحریر کیے۔ ایک رسالہ منطق میں لکھا، اس میں شکل اول کے بعید الطبائع اور شکل رابع کے ابدہ البدیہیات

---

(۲) اتحاف النبلاء، ص: ۳۱۶۔

ہونے کا دعویٰ کیا۔ سرسید کہتے ہیں کہ اس کے دلائل کی قوت ارسطو کو بھی معرضِ حیرت میں ڈال دیتی اور وہ اپنے دلائل کو تارِ عنکبوت سے بھی سست تر سمجھتا۔ سعادت خاں رنگین کا ایک قول بعض اصحاب نے نقل کیا ہے کہ شاہ اسمٰعیل کی غیر معمولی ذکاوت دیکھ کر اس نے کہا تھا، اس خاندان سے جو اٹھتا ہے باون گزا اٹھتا ہے۔

دعوت و تبلیغ

جیسا کہ ''سید احمد شہید'' میں بتایا جاچکا ہے، سید صاحب سے بیعت کے بعد زندگی احیائے دین اور ردِ بدعات کیلئے وقف کردی۔ سہ شنبہ اور جمعہ کو شاہی مسجد میں وعظ فرماتے۔ سرسید لکھتے ہیں کہ نماز جمعہ کیلئے ایسی کثرت ہونے لگی، جیسے عیدگاہ میں نماز عیدین کیلئے ہوا کرتی ہے۔ تقریریں ایسی جامع ہوتی تھیں کہ ہر شخص کو اس کے شبے کا جواب مل جاتا تھا اور سادگی کا یہ عالم تھا کہ عالم و عامی یکساں ان سے مستفید ہوتے تھے۔

کچھ مدت بعد سید صاحب کے ایماء سے وعظ و تقریر میں جہاد فی سبیل اللہ کے مسائل بیان فرمانے لگے۔ سرسید کے الفاظ میں مسلمانوں کا آئینۂ باطن مصفا اور مجلّٰی ہوگیا اور راہِ حق میں اس طرح سرگرم ہوئے کہ ہر شخص بے اختیار چاہنے لگا کہ اس کا سر فی سبیل اللہ فدا ہو اور اسکی جان دینِ محمدی کا علم بلند کرنے کے سلسلے میں کام آئے۔ (۱) ان کی وضع سادہ اور بے تکلف تھی، یعنی عام علماء کی طرح وعظ میں جبہ وغیرہ کا اہتمام نہ کرتے تھے، اسلئے ابتداء میں بعض سامعین ناخوش ہوئے۔ قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھ کر تفسیر شروع کی تو سامعین کے دل خوفِ خدا سے لرز اٹھے اور انکی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

بعض ثقات سے سنا کہ بارہ سال کے اشتغال و مراقبہ سے جو نسبت پیدا ہوتی ہے وہ شاہ صاحب کے ایک وعظ سے پیدا ہوجاتی تھی۔ پنجابی تاجر دکانداری میں بہت مشاق تھے۔ وہ اعتراف کرتے تھے کہ خرید و فروخت کی کثرت اور نفع کی زیادتی کے باوجود وعظ

---

(۱) ''آثار الصنادید'' بحوالہ تاریخ و سیاست، وحیات دلی ص ۳۵۸۔

سے اٹھنے اور دکان کھولنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہزاروں لوگ تائب ہوئے۔ ان میں زنانِ بازاری بھی تھیں۔ ایک مرتبہ ایامِ محرم میں قلعے کے اندر بلائے گئے۔ اکبر شاہ ثانی بادشاہ بھی مجلس میں شریک تھا۔ شاہ صاحب نے ایک آیت پڑھ کر حضرت امام حسینؓ کے مراتب پر ایسے انداز میں بیان فرمائے کہ اسوۂ حسینی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان شرک و بدعات کی بلائے سخت میں مبتلا ہیں۔

بعض غیر مستند روایتیں

مختلف اصحاب نے شاہ صاحب کی ورزشوں مثلاً تیراکی، سواری، شمشیر زنی، نیزہ بازی، پٹے بازی، بنوٹ وغیرہ کے متعلق لمبی چوڑی داستانیں بیان کی ہیں۔ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ تیز دھوپ میں مسجد فتح پوری کے تپتے ہوئے فرش پر گھٹنوں چلتے رہتے تھے۔ مجھے ان روایات کی کوئی سند اب تک نہ مل سکی۔ اسی طرح میرے نزدیک شاہ صاحب کے مواعظ اور دورۂ پنجاب کی جو مفصل رودادیں "حیاتِ طیبہ" میں چھپی ہیں، وہ بالکل بے اصل ہیں۔ دورۂ پنجاب یقیناً بعید از قیاس نہیں لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، اور جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان میں سے بعض یقینی طور پر محلِ نظر ہیں۔ شاہ صاحب لاریب ایک غیر معمولی انسان تھے اور ورزشوں یا دورے کے بغیر بھی ان کی عظمت میں کوئی کمی نہیں آسکتی۔

سید صاحب سے بیعت کے بعد زیادہ وقت انہیں کی معیت میں گذرا۔ جہاد کے لئے تبلیغ و تنظیمات کا کام سب سے بڑھ کر انہیں نے انجام دیا۔ سید صاحب کے ساتھ حج کیا۔ اس وقت تک ان کی والدہ ماجدہ زندہ تھیں۔ حج کیلئے ساتھ گئیں۔ مکہ معظمہ میں انہوں نے سید صاحب کی بیعت کی، وہیں وفات پائی اور جنت المعلٰی میں دفن ہوئیں۔

"ارمغانِ احباب" میں میاں نذیر حسین صاحب مرحوم کا ایک بیان درج ہے کہ شاہ صاحب حج کے بعد پانچ چھ مہینے دہلی میں رہے، جب مٹکاف کلکتہ سے آیا تو وہ استقبالاً

دہلی سے چلے گئے کیوں کہ کلکتے میں اس سے مولانا کی بحث ہو گئی تھی۔ (۱)

کارنامہ ہائے جہاد

۷ر جمادی الاخریٰ ۱۲۴۱ھ (۱۷ر جنوری ۱۸۲۶ء) دوشنبہ کو رائے بریلی سے سید صاحب کے ساتھ راہِ ہجرت میں قدم رکھا اور وطن عزیز سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر ایک غیر معروف گوشے میں شہادت پائی، جسے ان کی اور سید صاحب کی شہادت کے باعث ہمیشہ کی ناموری حاصل ہوئی۔

دورانِ جہاد میں ان کے کارنامے "سید احمد شہید" کے صفحات پر تفصیل بیان ہو چکے ہیں اور ان کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ اجمالاً ان کی کیفیت ذیل میں درج ہے:

۱۔ وہ تمام انتظامات میں سید صاحب کے مشیر خاص تھے۔

۲۔ سید صاحب کیلئے امامت جہاد کا پورا بندوبست انھیں نے کیا تھا۔

۳۔ جنگ شیدو میں جان پر کھیل کر سید صاحب کو محفوظ مقام پر پہنچایا۔

۴۔ ہزارہ میں جہاد کی ابتدائی تنظیمات انھیں نے کیں۔

۵۔ جنگ شنکیاری میں تھوڑی سی جمعیت سے سکھوں کے بہت بڑے لشکر کو شکست دی۔ سکھوں کی گولیوں سے شاہ صاحب کی قبا چھلنی ہو گئی، لیکن نہ آپ میدان سے ہٹے نہ مورچے میں پناہ لی، نہ جنگ روکی۔ اسی لڑائی میں شاہ صاحب کی ایک انگلی زخمی ہو گئی، جسے دکھا کر آپ مزاحاً فرمایا کرتے تھے کہ یہ ہماری انگشتِ شہادت ہے۔

۶۔ بیعت شریعت کے سلسلے میں علمائے سرحد سے تمام گفتگوئیں شاہ صاحب ہی نے کی تھیں۔

---

(۱) "ارمغان احباب" بحوالہ معارف فروری ۱۹۲۹ء۔ راوی کا درجہ اتنا معتمد ہے کہ اس بیان میں شبہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ حج سے واپسی پر شاہ صاحب ٹونک اور دہلی تشریف لے گئے۔ شاہ عبدالعزیز کا انتقال ہو چکا تھا۔ پھر وہ بطور خود دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں دورے کرتے رہے۔ مخالفین سے جھگڑے کے متعلق کوئی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

۷۔ ہنڈ کا مضبوط و مستحکم قلعہ چھوٹی سی فوج کے ساتھ فتح کر لیا اور دشمن کے صرف دو آدمی مارے گئے، اپنے کسی آدمی کے خراش تک نہ آئی۔

۸۔ جنگ زیدہ میں صرف سات سو مجاہدین سے درانیوں کی آٹھ ہزار فوج کو شکستِ فاش دی۔

۹۔ مایار کی جنگ میں درانی فوج بارہ ہزار سے کم نہ تھی اور مجاہدین صرف ساڑھے تین ہزار تھے، جن میں بڑی تعداد ملکیوں کی تھی تاہم درانی مقابلے پر ٹھہر نہ سکے۔

۱۰۔ امب و عشرہ کی لڑائیاں شاہ صاحب کے کمالِ سپہ گری کا ایک روشن ثبوت ہیں۔

۱۱۔ انتظام عشر کے سلسلے میں وہ سید محمد حبان قاضی القضاۃ کے مشیر خاص تھے اور جنگِ مردان میں انہیں کے حسن تدبیر سے فتح حاصل ہوئی۔

۱۲۔ پشاور میں صلح کی تمام گفتگوئیں سید صاحب کی طرف سے شاہ صاحب ہی نے کی تھیں۔

غرض وہ سید صاحب کی پوری تحریک جہاد میں اول سے آخر تک روحِ رواں بنے رہے۔

اطاعتِ امام

نواب وزیر الدولہ نے لکھا ہے کہ وہ اور مولانا عبدالحئی سید صاحب کے سامنے بالکل بے حس و حرکت رہتے تھے اور آپ کی بات کا جواب بھی بڑی مشکل سے دیتے تھے۔ (۱) تاہم شرعی معاملات میں شاہ صاحب کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے اور جو کچھ دل میں ہوتا تھا، سید صاحب کے سامنے بھی بیباکانہ بیان کر دیتے تھے۔ ایک موقع پر حسن زئی قبیلے

---

(۱) ''وصایا'' حصہ دوم ص: ۱۰۹۔

نے سید صاحب سے عشر معاف کرالیا، شاہ صاحب کو معلوم ہوا تو کہا کہ عشر زکوٰۃ و خمس کی طرح حقوقِ شریعت میں سے ہے، اسے معاف کرنے کا اختیار امام کو بھی حاصل نہیں۔ چنانچہ سید صاحب نے ان کی رائے کے مطابق عمل کیا۔

جنگِ مایار کے بعد شاہ صاحب سے پیشتر مردان پہنچ گئے تھے اور وہاں اس شرط پر رسول خاں رئیس مردان سے صلح کر لی تھی کہ لشکر قصبے میں نہ آئے گا۔ اس کے متعلق سید صاحب کے پاس مفصل اطلاع بھی بھیج دی تھی، اتفاق سے وہ اطلاع سید صاحب تک نہ پہنچ سکی اور آپ لشکر کے ساتھ قصبے میں داخل ہو گئے۔ شاہ صاحب کو اس پر سخت رنج ہوا۔ انہوں نے سمجھا کہ سید صاحب نے شرط کا خیال نہ رکھا۔ چنانچہ سامنے پہنچتے ہی کہا:

> ”جناب خود خلافِ شرع امر کے مرتکب ہوئے۔ لشکر اسلام میں سے ایک آدمی کے عہد کا ایفاء بھی امام اور پورے لشکر پر واجب ہو جاتا ہے۔ مجھے آپ نے اپنا نائب بنا کر بھیجا تھا، لیکن میرے عہد کا بھی خیال نہ رکھا، اور قصبے میں داخل ہو گئے۔ یہ لشکر ہے، جسے میدان میں ٹھہرنا چاہیے، پیرزادوں کا قافلہ نہیں کہ قصبے میں گھس آئے۔

حقانی ربانی بزرگ

سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ نسوار کی عادت تھی۔ کتابت کی مشق نہ تھی۔ البتہ ضروری احکام و مکاتبت کی عبارتیں بے تکلف بولتے جاتے تھے اور منشی لکھتے تھے۔ منظورہ کے الفاظ ہیں ”قدرت بہ کتابت چنانکہ باید نہ داشتند“۔ ”ارواحِ ثلاثہ“ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ پنجہ کش نے انہیں کتابت سکھانے پر آمادگی ظاہر کی فرمایا: معمولی لکھنا کافی ہے۔(۱) سید صاحب نے شاہ صاحب کی سواری کیلئے ایک گھوڑا دے دیا تھا، لیکن وہ کبھی اس پر سوار نہ ہوئے۔ اپنے رفیقوں میں سے کسی ایک کو

---

(۱) ارواحِ ثلاثہ ص: ۸۷۔

سوار کرا دیتے اور خود پیدل چلتے۔ عقیدہ یہ تھا کہ خدائی کام ہے، جتنی زیادہ مشقت اٹھائیں گے اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا۔

فرماتے تھے کہ میں خواب کی تعبیر نہیں جانتا۔ جس طرح دوسرے لوگ عقل سے قرائن تجویز کر لیتے ہیں، میں بھی کر لیتا ہوں۔ معانیٔ قرآن و حدیث مجھے اللہ نے عطا فرمائے۔ بظاہر استاد سے پڑھا، لیکن جو کچھ اللہ نے دل پر ڈال دیا وہی میرا اصلی علم ہے۔ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ نماز میں غفلت نہیں ہوتی، اگر ہوتی بھی ہے تو جلد آگاہ ہو جاتا ہوں۔

حقانی ربانی آدمی تھے۔ اپنی کسی غلطی یا کمزوری کے اعتراف میں تامل نہ ہوتا تھا۔ اگرچہ عمر زیادہ نہ تھی لیکن جسم خاصا کمزور تھا۔ پہاڑ کی چڑھائی میں چند قدم چلنے سے سانس پھول جاتا تھا۔ زیادہ بوجھ بھی نہ اٹھا سکتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ سید صاحب دریا سے پانی لانے کیلئے اٹھے تو انہوں نے مشکیزہ لے لیا۔ شاہ صاحب مشکیزہ نہ اٹھا سکتے تھے، لہٰذا اس کو لے لیا، تاہم تعلیم عزیمت کی غرض سے ایک موقع پر زنبورک اٹھوا کر اپنے کندھے پر رکھ لی۔ پاؤں لڑکھڑانے لگے تو زنبورک ساتھیوں نے سنبھال لی۔ (۱)

نواب وزیر الدولہ نے لکھا ہے کہ بعض اوقات بیماری کی تکلیف میں دو دو دن سو نہ سکتے، یہاں تک کہ اٹھنے بیٹھنے کی طاقت بھی نہ رہتی، تاہم سید صاحب کی طرف سے کسی جنگی مہم کے انتظام کا حکم پہنچ جاتا تو بے توقف ہتھیار سنبھال کر شیر کی طرح مسلمانوں کے معاملات کی درستی میں مصروف ہو جاتے۔ (۲) دینی کاموں میں نہ خود کبھی تساہل کو راہ دی، نہ کسی رفیق سے کام کے وقت نرمی کا برتاؤ رکھا۔ شاہ صاحب کے رعب و ہیبت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ کوئی درانی سپاہی کسی خاتون کا مال چھیننا چاہتا تھا، خاتون نے شاہ صاحب کا نام لیا تو سپاہی سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ جنگ مایار ناگزیر ہو گئی تو سید صاحب نے شاہ صاحب کو بھی امب سے بلا لیا۔ منشی محمدی انصاری نے بلاوے کے خط

---

(۱) یہ تمام معلومات "منظورہ" کے مختلف صفحات سے ماخوذ ہیں۔ (۲) "وصایا" ص ۱۰۹۔

میں اپنی طرف سے لکھ بھیجا کہ اپنی تشریف آوری کی خبر کو شہرت دیجیے، اس لیے کہ آپ کی شجاعت اس علاقے کے خاص و عام پر روشن ہے۔ کیا عجب ہے دشمن آپ کا نام سن کر مرعوب ہو جائیں اور اس طرح مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔

نواب صدیق حسن خاں کا بیان

مولانا سید محمد علی رام پوری نے لکھا ہے کہ وہ حافظ قرآن تھے اور متبحر عالم۔ تیس ہزار حدیثیں انہیں نوکِ زبان تھیں۔ (۱) نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں:

> ''در علوم معقول و منقول یاد پیشینیاں از خاطر می برد۔ در علم فروع و اصول ائمہ آں را دور تری نشاند۔ در ہر علم کہ با او سخن رانی دانی کہ دے امام ایں است و در ہر فن کہ با دے مناظرہ کنی، شناسی کہ دے حافظ ایں علم است..... تمام عمر خود را در اعلائے کلمۃ اللہ و احیاء سنن رسول اللہ و جہاد فی سبیل اللہ و ہدایت خلق اللہ گزرانید و دے با آرام در جائے از بلاد اسلام نیاسود۔'' (۲)

ترجمہ: معقول و منقول میں پہلوں کی یاد بھلا دیتے تھے۔ فروع و اصول میں ائمہ کو پرے بٹھا دیتے تھے۔ جس علم میں ان سے بات کر دگے جان لوگے کہ وہ اس فن کے امام ہیں اور جس فن میں ان سے مناظرہ کی نوبت آئے گی پہچان لوگے کہ وہ اس کے حافظ ہیں۔ ساری عمر خدا کے کلمے کی بلندی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے احیاء، خدا کی راہ میں جہاد اور خلقِ خدا کی ہدایت میں گزار دی۔ کسی اسلامی مقام پر ایک لمحے کیلئے بھی آرام نہ فرمایا۔

فراستِ مومن

سید صاحب فرمایا کرتے تھے کہ خدا نے مجھے تلوار، گھوڑے اور آدمی کی خاص پہچان عطا کی ہے، یہاں تک کہ میں جو تاڑ دیکھ کر آدمی کی سیرت کا حال بیان کر سکتا ہوں، البتہ

---

(۱) تنبیہ الضالین ص: ۱۹۔ (۲) ''اتحاف'' ص: ۱۳۲۔

اس میں غلطی کا بھی امکان ہے۔ شاہ صاحب کو بھی بصیرت کا خاص نور عطا ہوا تھا اور وہ سرسری ملاقات میں آدمی کی نیت اور ارادے کے متعلق اندازہ فرما لیتے تھے جو عموماً درست ہوتا۔ وہ سید صاحب کے حکم سے پہلی مرتبہ بالاکوٹ آئے تھے تو سکھوں کے لشکر پر شبخون کا فیصلہ کر لیا تھا۔ عین آخری وقت میں تاکیدی حکم آیا کہ شاہ صاحب خود پچوں آجائیں اور بالاکوٹ کی حفاظت کا کام حبیب اللہ خاں گڑھی والے کے حوالے کر دیا جائے۔ شاہ صاحب نے یہ فرمان پاتے ہی شبخون کا ارادہ ملتوی کر دیا اور پچوں جانے کی تیاری کر لی۔ ساتھ ہی فرمایا: حبیب اللہ خاں نے جب دیکھا کہ بھوگڑ منگ کی طرف حملے کا خطرہ بڑھ گیا ہے تو سید صاحب سے کہا کہ ادھر کی حفاظت فرمائیں، بالاکوٹ کی دیکھ بھال میں کروں گا، لیکن یقین ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں حبیب اللہ خاں پھر ہمیں بالاکوٹ بلائے گا۔

شاہ صاحب کی یہ رائے حرفاً حرفاً درست ثابت ہوئی۔ چنانچہ کچھ دیر بعد وہ اور سید صاحب حبیب اللہ خاں کے بلانے پر بالاکوٹ آئے، جسے ان کی شہادت سے دائمی شرف حاصل ہونے والا تھا۔

بے مثال شخصیت

کسی قسم کے تکلف کی پرچھائیں بھی ان کے قلب صافی پر نہ پڑی تھی۔ کھانے پینے، رہنے سہنے اور پہننے اوڑھنے میں حد درجہ سادہ تھے۔ سفر حج میں کلکتہ پہنچے تو لباس ایسا پہن رکھا تھا کہ منشی امین الدین کو پہلی نظر میں ان کے شاہ اسمٰعیل ہونے کا یقین نہ آیا۔ جب معلوم ہوا کہ یہی وہ شخصیت ہے جس کی ناموری سے ملک کے در و دیوار گونج رہے ہیں تو منشی صاحب یہ سنتے ہی آبدیدہ ہو گئے۔

مشہور ہے کہ دوران جہاد میں کبھی کبھی گھوڑے کو کھریرا کرتے۔ اس حالت میں بھی

کوئی شخص دینی یا علمی مسئلہ پوچھنے کیلئے آجاتا تو ساتھ ساتھ جواب دیتے جاتے۔ ایک نیازمند نے لکھا ہے:

> "ایسا عالم باعمل، فاضل بے بدل، صاحب اخلاق، شہرۂ آفاق، المعیِ زماں، لوذعیِ دوراں، واقف علوم معقول و منقول، کاشف دقائق فروع واصول، رافع اعلام توحید و سنت، قامع بنیانِ شرک و بدعت، فتوت کردار، شجاعت دثار، اس وقت میں ہم نے نہیں سنا، دیکھنا تو کیا۔"

تصانیف

سید صاحب سے وابستگی کے بعد شاہ صاحب نے اپنی حیات عزیز جن اہم کاموں کیلئے وقف کردی تھی، ان کے پیش نظر تصانیف کا موقع بہت کم تھا تاہم انہوں نے مقصد اصلاح کیلئے کتابیں بھی لکھیں، جن میں سے بعض اپنے موضوع پر آج بھی نادر و یگانہ ہیں۔ مثلاً:

۱۔ ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح۔ اہل علم کا بیان ہے کہ حقیقت بدعت میں ایسی کوئی کتاب کسی زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی۔

۲۔ منصب امامت۔

۳۔ عبقات۔

۴۔ تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین۔

۶۔ اصول فقہ۔

۷۔ صراط مستقیم کا پہلا حصہ۔

۸۔ ایضاح الحق الصریح۔

۱۰۔ ایک روزی۔ یہ مختصر سا رسالہ ہے۔ مولوی فضل حق خیرآبادی نے "تقویت الایمان" پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ شاہ صاحب نماز کیلئے مسجد کی طرف جا رہے تھے۔

راستے میں مولوی فضل حق کا رسالہ ملا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایک ہی نشست میں اس کا جواب مکمل کر دیا، لہٰذا ایک روزی نام پایا۔

علاوہ بریں انہوں نے بہت سی کتابوں پر نہایت قیمتی حاشیے لکھے تھے جو سب کی سب ضائع ہو گئیں۔ مولانا رشید الدین کا نادر کتب خانہ ایامِ غدر میں لٹ گیا تھا۔ ان کے فرزند مولوی سدید الدین حد درجہ افسوس سے فرمایا کرتے تھے کہ اپنے کتب خانے کا اس قدر رنج نہیں، جتنا کہ ان حواشی کے ضائع ہو جانے کا ہے جو شاہ صاحب نے ان کتابوں پر لکھے تھے۔ (۱)

سید صاحب کے مکاتیب کا بڑا حصہ بھی انہیں کا لکھوایا ہوا ہے۔ کچھ منظومات بھی ان سے منسوب ہیں۔ مثلاً ایک نعتیہ قصیدہ فارسی میں، ایک قصیدہ سید صاحب کی مدح میں، توحید پر ایک مثنوی فارسی میں موسوم "بہ سلک نور" اور اسی نام کی ایک مثنوی اردو میں۔

امتِ محمدیہ کا حکیم

حکیم جمیل الدین کہتے ہیں کہ شاہ صاحب کا ذہن حد درجہ سریع الانتقال تھا۔ پانچ آدمیوں کو سامنے بٹھا کر پانچ مختلف مضامین لکھواتے تھے اور کسی کا قلم رکتا نہ تھا۔ (۲) ایک مرتبہ "محمد کالے" نامی ایک شخص نے عرض کیا کہ میرے نام کا سجع کہہ دیجیے، بے تکلف فرمایا: "ہر دم نام محمد کا لے"۔ (۳)

سید صاحب کے ساتھ بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔ مولوی فضل حق خیرآبادی سے خاصی کشمکش رہی تھی۔ مولوی صاحب نے شہادت کی خبر اس وقت سنی جب طلبہ کو سبق پڑھا رہے تھے۔ یہ سنتے ہی کتاب بند کر دی۔ گھنٹوں بیٹھے روتے رہے۔ اس کے بعد کہا کہ اسمٰعیل کو ہم مولوی نہ جانتے تھے، وہ امتِ محمدیہ کا حکیم تھا۔ کوئی شے نہ تھی جس کی

---

(۱) "حیات بعد المماۃ" ص: ۱۱۳۔ (۲) "ارواح ثلاثہ" ص: ۷۶۔ (۳) "ارواح ثلاثہ" ص: ۷۸۔

انیت اور نیت اس کے ذہن میں نہ ہو۔(۱)

مزاح

شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کے نواسے اور شاہ اسحاق کے داماد مولوی نصیر الدین سید صاحب کے ساتھ حج کیلئے نہ گئے تھے لیکن کلکتہ تک معیت میں رہے۔ وہ اس وقت بعض ضروری کاموں کے سلسلے میں رک گئے تھے، بعد ازاں شاہ اسحاق کے ساتھ فریضہ حج ادا کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ قیامِ کلکتہ کے دوران میں مجھے روزانہ شاہ اسمٰعیل کے پاس حاضر ہونا پڑتا تھا اور ایک گھڑی رات گئے تک ان کی قیام گاہ میں رہتا۔ پھر شاہ صاحب مجھے میری قیام گاہ پر پہنچانے کیلئے ساتھ آتے۔ ان کی طبیعت میں مزاح بہت تھا۔ دروازہ کھٹکھٹاتے تو چوکیدار پوچھتا کون؟ شاہ صاحب بہ آواز بلند فرماتے: غطوس۔ غطوس اس بہادر و دلیر آدمی کو کہتے ہیں، جس کا قدم جنگ یا ہجومِ خطرات میں ہمیشہ آگے رہے۔

زہد و تقویٰ

شاہ صاحب کے زہد و ریاضت کے سلسلے میں مولانا عبدالقیوم کی ایک روایت خاص توجہ کی مستحق ہے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ ضلع بلند شہر کی تحصیل سکندر آباد میں شاہ صاحب کے خاندان کو کچھ اراضی ملی ہوئی تھی۔ شاہ اسمٰعیل تحصیل کیلئے وہاں جایا کرتے تھے اور جاتے آتے غازی آباد میں ایک بھٹیاری کے یہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ تحصیل کے وقت وہ بیمار ہوگئے اور ان کی جگہ شاہ رفیع الدین کے فرزند شاہ موسیٰ کو بھیجا گیا۔ شاہ اسمٰعیل نے انہیں تحصیل کے متعلق تمام تفصیلات بتادیں اور غازی آباد کی بھٹیاری کا پتا دیتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ اسے بتا دینا، میں اسماعیل کا بڑا بھائی ہوں۔ شاہ موسیٰ غازی آباد پہنچے اور بھٹیاری کو اپنا نام و نشان بتا دیا۔ اس نے رات کے وقت شاہ موسیٰ کی چارپائی کے نیچے

---

(۱) ”حیات بعد المماتؒ“ ص:۱۴۲۔

دو لوٹے، ایک چٹائی اور ایک جانماز رکھ دی۔ موسیٰ نے کہا: اس سامان کی کیا ضرورت ہے؟ عشاء کی نماز مسجد میں پڑھ آئے ہیں، صبح پھر وہیں نماز پڑھ لیں گے۔ بھٹیاری نے ان کی طرف تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا: میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ تم اسمٰعیل کے بھائی نہیں ہو اور اب تو یقین ہو گیا۔ مولوی اسمٰعیل بھی نماز مسجد ہی میں پڑھا کرتے تھے، مگر وہ رات کو تھوڑی دیر سو کر اٹھ بیٹھتے اور وضو کر کے صبح تک نفلوں میں قرآن پڑھتے رہتے تھے۔ تم کہتے ہو مجھے پانی کی ضرورت نہیں۔ میں تو سمجھی تھی کہ تم بڑے بھائی ہو اور عابد بھی ان سے زیادہ ہو گے، مگر تم کچھ بھی نہ نکلے۔

شاہ موسیٰ کہتے تھے کہ میں بھٹیاری کی یہ بات سن کر مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا اور کوئی جواب بن نہ آیا۔(۱)

دو خطرناک موقعے

شاہ صاحب کی شجاعت، دلیری اور بہادری ستائش سے بالا ہے۔ وہ اپنی جانِ عزیز جس بلند مقصد کیلئے نذر کر چکے تھے، اس میں ہر قدم پر شہادت کا خطرہ موجود تھا، تاہم شاہ صاحب کی حالت یہ تھی کہ وہ گولیوں کی بارش میں انتہائی بے تکلفی سے جاتے تھے، دوسرے لوگ پھولوں کی بارش میں بھی اس طرح جانا گوارا نہ کریں۔

اس سلسلے میں سوانح نگاری کے نقطۂ نگاہ سے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ دو مرتبہ شاہ صاحب عین موت کے منہ سے بچے۔ ایک مرتبہ جنگ مایار میں جہاں انہوں نے کئی درانی سواروں کو مار گرایا۔ اس اثناء میں ایک سوار ان کے بالکل قریب آ گیا۔ وہ بندوق نہ بھر سکے۔ خود فرماتے تھے کہ مجھے شہادت کا یقین ہو گیا۔ عین اس موقع پر حافظ وجیہ الدین پھلتی کی نظر پڑی۔ انہوں نے دور سے درانی سوار پر بندوق سر کی۔ وہ گولی لگتے ہی گرا اور شاہ صاحب بال بال بچے۔ دو چار لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو ان کا زندہ بچنا مشکل تھا۔

---

(۱) ''ارواحِ ثلاثہ'' ص: ۵۰-۵۱۔

دوسرا واقعہ سفر ہجرتِ ثانیہ میں پیش آیا۔ دریائے سندھ کے کنارے تاکوٹ میں منزل ہوئی۔ شاہ صاحب کو غسل کی حاجت تھی۔ منہ اندھیرے میں دریا پر چلے گئے۔ سخت سردی کا موسم اور دریا کا پانی برفانی۔ غسل کرتے ہی باہر نکل کر کپڑے پہنے۔ عین اس وقت بے بس ہو کر گرے اور بے ہوش ہو گئے۔ صبح صادق کے وقت دوسرے مجاہدین وضو کیلئے دریا پر گئے تو انہیں اٹھایا۔ چارپائی پر لٹا کر لائے، کمبل اڑھائے، پاس آگ جلائی، سورج نکلنے پر شاہ صاحب کو ہوش آیا۔

افراط وتفریط اور توسط

ایک مرتبہ وعظ ونصیحت کے نتائج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

”ہر چند مردم بسیار بر راہ راست آمدہ اند لاکن آنچہ من می خواہم ہیچ کس از ایشاں اختیار آں وضع نہ نمودہ، وآں راہ توسط است، در افراط وتفریط کہ در ملازمین صحبت حضرت امیر المومنین یافتہ ومن ہر چند بسیار سعی می نمایم کہ آں طریقہ توسط بہ تعلیم یافتگان از من حاصل شود لاکن حسب مراد من ہیچ یکے از ایشاں تعلیم قبول نمی کند۔ یا راہ افراط می روند یا تفریط می کنند۔ پس معلوم می شود کہ ہدایت کاملہ کہ مصون از افراط وتفریط باشد جز صحبت آں جناب میسر نخواہد شد، الا ماشاء اللہ۔“

ترجمہ: اگرچہ وعظ ونصیحت سے بہت سے آدمی راہ راست پر آ گئے لیکن جو وضع میں چاہتا تھا وہ کسی نے اختیار نہ کی اور وہ افراط وتفریط کے درمیان توسط کی راہ تھی۔ یہ توسط سید صاحب کی صحبت سے فیض یاب ہونے والوں میں پایا جاتا ہے۔ میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ توسط کا یہ طریقہ مجھ سے تعلیم پانے والے بھی سیکھ لیں، لیکن یا تو وہ افراط کی راہ اختیار کر لیتے یا تفریط کرنے لگتے ہیں۔ پس معلوم ہو گیا کامل ہدایت جو افراط وتفریط سے محفوظ ہو

سید صاحب کی صحبت کے بغیر کسی کو میسر نہ ہوگی الا ماشاءاللہ۔

یہ شاہ صاحب کی حق اندیشی، حق شناسی اور حق گوئی تھی۔

شہادت

شہادت کی تفصیل ''سید احمد شہید'' میں درج ہو چکی ہے۔ مختلف راویوں کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ پہلے ان کی پیشانی یا سر پر گولی لگی، جس سے خفیف سا زخم آیا، لیکن داڑھی خون سے تر ہو گئی۔

۲۔ پھر آپ کو ننگے سر دیکھا گیا۔ بندوق بھری ہوئی تھی اور مٹی کوٹ کے ٹیلے کی طرف گئے، جہاں بہ کثرت گولیاں آ رہی تھیں۔

۳۔ ایک صاحب نے انہیں مٹی کوٹ کے نالے کے قریب دھانوں کے کھیتوں میں بندوق چلاتے دیکھا۔

۴۔ ایک اور صاحب نے انہیں اس حالت میں دیکھا کہ رائفل کندھے پر تھی، ننگی تلوار ہاتھ میں تھی اور پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔

۵۔ ایک روایت ہے کہ سید صاحب کے متعلق پوچھا کہاں ہیں؟ لوگوں نے اس ہجوم کی طرف اشارہ کیا جہاں گھمسان کا رن تھا۔ مولانا اُدھر چلے گئے۔

یہ تمام روایتیں اصل میدانِ جنگ کے متعلق ہیں، جو بالا کوٹ اور مٹی کوٹ کے ٹیلے کے درمیان تھا۔ لیکن شاہ صاحب کی قبر وہاں سے دور مشرق میں ست بنے کے نالے کے پار ہے۔ یقین ہے کہ وہ وہیں شہید ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لڑتے لڑتے سکھوں کے دباؤ کے تحت پیچھے ہٹتے گئے۔ آخر ست بنے کے نالے سے گذر کر شہادت پائی۔ ارباب بہرام خاں کی قبر بھی ساتھ ہی تھی۔ اس لئے خیال ہے کہ وہ بھی مولانا کے ساتھ ہی شہید ہوئے۔

تیسرا باب:

سید صاحب کے بھانجے

سید محمد علی

سید محمد علی بن سید عبد السبحان بن سید محمد عثمان (عم محترم سید احمد شہید) بن سید محمد نور بن سید محمد ہدیٰ بن شاہ علم اللہ۔ سید عبد السبحان کی شادی سید احمد شہید کی علاتی ہمشیر سیدہ نجیبہ سے ہوئی تھی۔ ان سے چار فرزند ہوئے جن میں سب سے بڑے سید محمد علی تھے۔ تاریخ ولادت معلوم نہیں، قیاس یہ ہے کہ سید احمد شہیدؒ سے کم وبیش چار برس بڑے ہوں گے۔ سید عبد السبحان غالباً لکھنؤ میں ملازم تھے۔ وہیں شوال ۱۲۱۲ھ (فروری یا مارچ ۱۷۹۸ء) میں عبد القادر خاں جائسی کے مکان واقع اسماعیل گنج میں فوت ہوئے۔ خاندانی حالات کے متعلق ایک قلمی رسالے میں بیت تاریخ وفات یوں مرقوم ہے:

زرضوان چو جستیم تاریخ فوت ❁ بگفتا کہ خوش آمدی مرحبا
۱۲۱۲ھ

سفر حج

سید محمد علی کی توجہ ابتداء ہی سے تحصیل علم پر مبذول رہی۔ سوانح نگاروں نے انہیں "فاضلِ گراں مایہ" لکھا ہے۔ سید صاحب عموماً انہیں ملا کہہ کر پکارتے تھے۔ لکھنؤ کے پہلے سفر میں سید صاحب کے ساتھ تھے، لیکن دہلی تک ساتھ نہ جا سکے۔ سید صاحب حج کے لئے تیار ہوئے تو دوسرے اقرباء کی طرح سید صاحب نے سید محمد علی کو بھی دعوت دی۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابتداء میں تنہا تیار ہوئے۔ سید صاحب نے پوچھا کہ بال بچوں کو کیوں ساتھ نہیں لیتے تو انہوں نے عذر کیا۔ سید صاحب نے فرمایا:

> ”بھائی! شاید موت کا ڈر ہے۔ بالفرض والتقدیر موت پیش بھی آ جائے تو نہیں سنا کہ مرگ انبوہ جشنے دارد؟ مع ہذا حج وعمرہ کا ثواب ملے گا۔ نیز شرف شہادت جس کا جویا ہر مسلمان ہے۔“

اس کے بعد سید محمد علی نے اہل وعیال کو بھی ساتھ لے لیا۔ سفر حج کے بیشتر حالات انہیں کی زبانی ہمیں معلوم ہوئے۔

ٹونک کی زندگی

ہجرت میں شریک سفر نہ ہوئے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد ٹونک میں مقیم ہو گئے تھے۔ نواب وزیر الدولہ اونچا عہدہ دینا چاہتے تھے، سید محمد علی نے عذر پیش کر دیا اور اپنے خرچ کا اندازہ کر کے صرف پچاس روپے ماہانہ وظیفہ قبول کیا۔ غالباً اسی زمانے میں ”مخزنِ احمدی“ لکھی جو سید صاحب کے ابتدائی حالات کے متعلق واحد مستند ذریعۂ معلومات ہے۔ ابتدا میں قندھاریوں کی چھاؤنی (لکھنؤ) میں بہت رہتے تھے اور سیکڑوں لوگ ان کے معتقد ہو گئے تھے۔ آپ نے ہمیشہ سادہ فقیرانہ زندگی بسر کی۔ ۴ر ذی الحجہ ۱۲۶۶ھ (۱۱ر اکتوبر ۱۸۵۰ء) کو ٹونک میں وفات پائی۔ فارسی بے تکلف لکھتے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ مخزن احمدی میں ان کی کئی نظمیں ہیں۔ سید ابوالحسن علی نے لکھا ہے کہ آزاد منش اور بے تکلف بزرگ تھے۔

ازواج واولاد

ان کی پہلی شادی بی بی علیہ بنت سید محمد مرتل سے ہوئی۔ اس بی بی کے بطن سے ایک فرزند سید نور الہدیٰ تھے اور دو بیٹیاں۔ دوسری شادی سے تین بیٹے ہوئے اور ایک بیٹی۔

سید نور الہدیٰ ۱۲۴۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۹۹ھ میں ہیضے سے وفات پائی۔ وہ ٹونک میں بخشی الملک بن گئے تھے اور سید نور الہدیٰ خاں بہادر ہیبت جنگ کا خطاب پایا۔ ان کے بڑے فرزند سید عثمان والد کے عہدے پر مامور ہوئے اور چھوٹے فرزند سید محمد کو نظامت کا عہدہ ملا۔ سید عثمان نے ضلع فتح پور میں تین گاؤں خرید لیے تھے۔

سید احمد علی

سید احمد علی بن سید عبد السبحان، سید احمد شہید کے دوسرے بھانجے آپ سے عمر میں دو برس بڑے تھے۔ سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ ''بہت صالح، ذی علم، ذی وقار اور صاحب دین و دیانت تھے۔'' ان کی شادی قاضی سید رحیم کی صاحبزادی بی بی زینب سے ہوئی تھی۔ ابتدا میں بمقام لکھنؤ ملازم تھے۔ سید صاحب کے ساتھ مع اہل و عیال حج کیا۔ سید صاحب کے جو پانچ ہزار روپے رسالدار فقیر محمد خاں کے پاس بطور امانت جمع تھے وہ سید احمد علی ہی لے کر کلکتہ گئے تھے اور جاتے ہوئے ستر روپے میں شاہ عبد العزیز اور محدث دہلوی کے اردو ترجمہ قرآن کا مخطوطہ خرید لے گئے تھے۔ جس کی نقل عبد اللہ نے بغرضِ طباعت حاصل کر لی تھی۔

جہاد

حج سے مراجعت پر غالباً اپنے مشاغل میں مصروف رہے۔ سفر ہجرت میں سید صاحب کے ساتھ نہ گئے۔ جس زمانے میں سید صاحب بنیر و سوات کا دورہ کر رہے تھے تو مجاہدین کا قافلہ لے کر سرحد پہنچے اور مختلف جنگوں میں شریک رہے۔ جنگِ امب میں اس فوج کے سالار تھے جس نے ستھانہ کی جانب سے پیش قدمی کی تھی۔ سید صاحب مشوروں میں بھی انہیں شریک رکھتے تھے۔

عزم پھولڑہ

فتح امب کے بعد ہزارہ میں پیش قدمی کا فیصلہ ہوا تو سید صاحب نے مشیروں سے پوچھا کہ کسے امیر لشکر بنایا جائے؟ سید احمد علی بھی اس مجلس میں شریک تھے۔ انہوں نے خلاف معمول کہا کہ میں یہ خدمت انجام دینے کیلئے تیار ہوں، بشرطیکہ مجھے ساتھیوں کے انتخاب کی اجازت دی جائے۔ سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ سید احمد علی نے پہلے کسی موقع پر ایسی پیش کش نہ کی تھی اور انہیں بھیجنے کا سید صاحب کو خیال بھی نہ تھا۔ وہ خود تیار ہو گئے تو سید صاحب نے انہیں اجازت دیدی۔ اپنی سواری کا گھوڑا ان کے حوالے کر دیا اور سید احمد علی کی خواہش کے مطابق وہ سیاہ قبا بھی انہیں دیدی جو سید صاحب نے ۲۷؍ رمضان ۱۲۴۵ھ (مارچ ۱۸۳۰ء) کی رات کو عبادت کرتے وقت پہنی تھی۔ چنانچہ سید احمد علی شوال ۱۲۴۵ھ کے اواخر یا ذی قعدہ کے اوائل میں ضلع ہزارہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

لشکر کی تقسیم

مجاہدین کے پاس کشتیاں زیادہ نہ تھیں اور پورے لشکر کو دریا کے پار اتارنے میں بہت وقت لگتا، نیز اندیشہ تھا کہ بحالت عبور ہی سکھوں سے تصادم نہ ہو جائے اس لئے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کر کے تین مختلف گھاٹوں سے پار اترنے کا حکم دیدیا گیا۔ مولوی محمد حسن (رام پور منہاران) سید احمد علی کے مشیر خاص تھے۔ عبور دریا کے بعد سید احمد علی نے وہ راستہ اختیار کیا جسے آجکل لساں کا راستہ کہتے ہیں۔ وہ لساں سے شاہ کوٹ پہنچے اور اس پر قبضہ جماتے ہوئے پھولڑہ میں داخل ہو گئے۔ بستی سے باہر مانسہرہ کے راستے پر خیمہ زن ہوئے۔ باقی دونوں لشکر بھی مختلف راستوں سے پھولڑہ پہنچ گئے اور انہوں نے سید احمد علی کے قریب ڈیرے ڈال دیے۔ جو مقامی خوانین ساتھ تھے انہوں نے بستی میں قیام کیا۔

آغازِ جنگ

مؤرخین کا بیان ہے کہ سید صاحب نے لشکر کی روانگی کے وقت سید احمد علی کو جو ہدایتیں دی تھیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ دامن کوہ کو کسی حالت میں بھی نہ چھوڑنا۔ پھولڑہ پہنچے تو ساتھیوں کے مشورے سے انہوں نے میدان میں اقامت اختیار کر لی۔ مانسہرہ کی جانب سکھوں کا لشکر آنے کی افواہ تھی، اس لئے اونچی جگہ پہرے بٹھا دیے اور انہیں تاکید کر دی کہ سکھ لشکر کو دیکھتے ہیں بندوقیں سر کر دیں۔ دو دن اطمینان سے گذر گئے۔ تیسرے دن صبح کی اذان ہوئی، مجاہدین نماز کی تیاری میں لگ گئے۔ بعض وضو کر کے سنتیں پڑھ رہے تھے، بعض وضو ہی کر رہے تھے کہ پہریداروں کی بندوقیں سر ہوئیں۔ یہ سکھ لشکر کی آمد کا اعلان تھا۔ وہ سب سوار تھے اور اس تیزی سے میدان میں پہنچ گئے کہ مجاہدین کو صف بندی کا موقعہ بھی نہ مل سکا۔

شہادت

سید احمد علی فوراً قبلہ رو کھڑے ہو کر دعاء مانگنے لگے۔ ساتھیوں کو بھی پکار کر کہا۔ دعاء ختم نہ ہوئی تھی کہ سکھ سوار سر پر آ پہنچے۔ انہوں نے پہلے سے ایک منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ میدان میں پہنچتے ہی وہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں منقسم ہو کر ادھر اُدھر بکھر گئے۔ مجاہدین بھی ان کے تعاقب میں منتشر ہو گئے۔ یہ حالت دیکھتے ہی سکھ سوار گھوڑے دوڑا کر اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے زبردست اجتماعی حملے شروع کر دیے۔ مجاہدین چوں کہ پیدل تھے اس لئے جلد مجتمع ہو کر مقابلے پر نہ جم سکے اور بحالتِ انتشار جا بجا شہید ہو گئے۔

سید احمد علی اور میر فیض علی گورکھپوری یکجا تھے۔ دونوں اپنی جگہ قائم رہ کر مردانگی سے لڑتے رہے۔ سید احمد علی کا سنگ چقماق خراب ہو گیا اور بندوق سے کام لینے کی کوئی صورت نہ رہی، چنانچہ وہ نالی پکڑ کر بندوق کو لٹھ کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ آخر

نیزوں، تلواروں اور گولیوں کے زخموں سے چور ہو کر گر گئے۔ اسی حالت میں وفات پائی۔ راویوں نے بیان کیا ہے کہ ان کے بے شمار زخم لگے، لیکن سب زخم جسم کے اگلے حصہ میں تھے، پچھلے حصے میں خراش تک نہ آئی۔

خبر شہادت

پھولڑہ سے جو قاصد لڑائی کی خبر لے کر اسب گیا، وہ دریا سے پار اترا تو سید صاحب نے دور سے اسے دیکھ لیا۔ وہ پہلے میاں عبدالقیوم سے ملا۔ وہ چند لمحے زمین پر بیٹھ گئے۔ سید صاحب نے فرمایا: قاصد کو بلاؤ، وہ کیسی خبر لایا جسے سنتے ہی میاں عبدالقیوم زمین پر بیٹھ گئے۔ محبوب بھانجے کی شہادت کی خبر سنی تو بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے ہوئے فرمایا: الحمد للہ وہ جو مراد لے کر آئے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں اس مراد کو پہنچایا۔ ایک روایت ہے، قاصد نے جب بیان کیا کہ شمشیر و نیزہ کے تمام زخم سید احمد علی کے چہرے پر لگے تو پھر آنسو جاری ہو گئے۔ آپ الحمد للہ الحمد للہ کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے آنسو پونچھتے جاتے تھے۔ سید احمد علی اگرچہ بھانجے تھے لیکن سید صاحب ہمیشہ انہیں ''بھائی'' کہہ کر پکارتے تھے۔ ماموں بھانجے میں رضاعت کا رشتہ بھی تھا۔ تمام بھانجوں میں انہیں کے ساتھ سب سے زیادہ محبت تھی۔ خود سید صاحب کا بیان ہے کہ سید احمد علی سچی بات کہنے میں مراعات ادب کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔

اولاد

آپ کا نکاح سیدہ زینب دختر قاضی سید رحیم سے ہوا۔ تین فرزند ہوئے: سید زین العابدین عرف عابد میاں، سید موسیٰ عرف حسن مثنی (شہید جنگ مایار) اور سید ابوالقاسم۔ تین صاحبزادیاں تھیں: سیدہ بتول، سیدہ حمیرا، سیدہ صدیقہ۔

سید موسیٰ

سید موسیٰ جن کا دوسرا نام حسن مثنیٰ تھا، سید احمد علی شہید پھولڑہ کے منجھلے صاحبزادے تھے۔ اپنے بھائی سید ابو القاسم کی طرح یہ بھی سید صاحب کے ساتھ جہاد کیلئے آئے۔ سید ابو القاسم کو سید صاحب نے بعض کاموں کیلئے واپس بھیج دیا، سید موسیٰ ساتھ رہے۔ جب سے ان کے والد شہید ہوئے تھے، بہت غمگین اور بے چین رہتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے رفیقوں سے کہتے کہ کسی لڑائی میں جانے کا اتفاق ہوا تو انشاء اللہ میں بھی لڑ کر شہید ہوں گا۔

مجروحیت

سید صاحب کو اپنے شہید بھانجے کے جگر بند کی کیفیت معلوم تھی۔ جنگِ مایار کے دن سید موسیٰ سواروں میں شامل تھے۔ غازیوں کا لشکر تورو سے مایار کی جانب چلا تو سید صاحب نے سید موسیٰ سے فرمایا کہ اپنا گھوڑا کسی بھائی کو دے دو اور خود ہمارے ساتھ پیادوں میں شامل ہو جاؤ۔ عرض کیا، مجھے سواروں ہی میں رہنے دیجیے۔ سید صاحب نے زیادہ اصرار نہ کیا۔ سواروں نے درانیوں پر حملہ کیا تو سید موسیٰ دشمن کی صفوں میں گھس کر خوب لڑے۔ آخر زخموں سے دونوں ہاتھ بیکار ہو گئے۔ کئی زخم سر میں لگے اور بے بس ہو کر گر گئے۔

جنگ کے بعد زخمیوں اور شہیدوں کی دیکھ بھال شروع ہوئی تو خادے خاں قندھاری ان کے پاس پہنچا۔ خان موصوف کا بیان ہے کہ ایک جگہ دور سے اللہ اللہ کی آواز آئی۔ نزدیک جا کر دیکھا تو سید موسیٰ تھے۔ سر کے زخموں سے اتنا خون بہا تھا کہ ان کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ اس حالت میں بھی سب سے پہلے یہ پوچھا کہ کون ہو اور فتح کس کی ہوئی؟ خادے خاں نے نام بتایا اور ساتھ ہی کہا کہ سید بادشاہ کو خدا نے فتح دی۔ یہ سن کر بولے: ''الحمد للہ''۔

سید صاحب کے ارشادات

خادے خاں انہیں اٹھا کر پہلے مایار کی مسجد کے حجرے میں لے گیا پھر دوسرے زخمیوں کے ہمراہ انہیں تورو بھیج دیا گیا۔ سید صاحب انہیں دیکھنے گئے تو فرمایا یہ فرزند توفیق الٰہی سے بڑا بہادر نکلا۔ مالک حقیقی کا حق ادا کیا۔ پھر سید موسیٰ سے کہا:

> ”بیٹا! لکھنؤ میں دیکھا ہوگا کہ لوگ شیطان کے اکسانے سے فاحشہ عورتوں کیلئے یا کسی کے سامنے متکبرانہ کھانس کر لڑائی چھیڑ لیتے ہیں اور اس میں اپنے ہاتھ پاؤں کھو بیٹھتے ہیں۔ اس طرح ان کا ثمرہ دنیا میں حمیت و جاہلیت اور عقبیٰ میں عذابِ الیم ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمہارے ہاتھ پاؤں راہِ مولا میں کام آئے۔
>
> اب اگر دیکھو کہ کوئی شخص خوش رفتار گھوڑے پر سوار اسے دوڑاتا کداتا ہوا جا رہا ہے تو کبھی یہ حسرت دل میں نہ لانا کہ میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہوتے تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔ تمہارے ہاتھ پاؤں بارگاہ ربانی میں قبول ہوئے۔ خوش نصیب ہیں وہ ہاتھ جو رضائے مولا میں قربان ہوں اور اس پاک ذات کی خاطر کٹیں جو جہانوں کی پناہ گاہ ہے۔ اگر کسی کو شمشیر برہنہ کے ساتھ پٹابازی کرتے ہوئے دیکھو تو یہ غم دل میں نہ لانا کہ میرے ہاتھ پاؤں ہوتے تو ایسے ہی جوہر دکھاتا۔ تمہارے دست و پا کو بڑا رتبہ ملا۔ ان زخموں کے عوض میں ثوابِ عظیم حاصل ہوا۔ سالم ہاتھ پاؤں والے کو ہر روز مظنۂ گناہ درپیش ہے۔ تمہارے جوارح کو پروردگار حکیم کی بارگاہ میں بہت شاندار اجر ملا۔“

شانِ صبر و شکیب

سید موسیٰ نے صابرانہ عرض کیا: میں ہزار زبان سے اللہ کی رضا پر راضی اور شاکر ہوں۔ الحمد للہ کہ میری ہستی نیک ترین عبادت میں صرف ہوئی۔ خدا اسے قبول کرے

لیکن آپ سے ایک آرزو ہے:

> "ہر روز خود تکلیف اٹھا کر اپنے جمال مبارک سے آنکھیں منور فرماتے رہیے۔ میں معذور ہو چکا ہوں، خود آپ کی مجلس میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوا نہ مجھے کوئی رنج ہے اور نہ حسرت۔"

وفات

سید موسیٰ کو تورو سے پنجتار بھیج دیا گیا۔ علاج باقاعدہ ہوتا رہا، لیکن ان کے زخم اچھے نہ ہوئے۔ پنجتار سے انہیں دکھنڑہ پہنچا دیا گیا جو بلحاظ آب وہوا بہتر تھا۔ سید صاحب کی اہلیہ بھی تیمارداری کیلیے ساتھ گئیں۔ شیخ حسن علی اور ان کے عزیز بھی ہمراہ تھے۔ جب سید صاحب نے وسط رجب ۱۲۴۶ھ میں ہجرت ثانیہ کا قصد کیا اور پنجتار سے وادی چملہ کی جانب روانہ ہوئے تو دکھاڑہ پیغام بھیج دیا کہ سب لوگ کنگلی پہنچ کر انتظار کریں۔ چنانچہ سید صاحب کی اہلیہ، سید موسیٰ اور دوسرے حضرات پہلے پہنچ گئے۔

مولوی سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ میں سید موسیٰ کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ بہت بیمار تھے اور بار بار امیر المومنین کا پوچھتے تھے۔ سید صاحب نے صرف سید موسیٰ کی خاطر کنگلی میں دو دن گزارے۔ شدت علالت کے باعث انہیں وہیں چھوڑ دیا اور تیسرے دن روانہ ہو گئے۔ دو روز بعد سید موسیٰ نے وفات پائی اور کنگلی کی خاک میں ابدی نیند سوئے۔

ان کا نکاح سید محمد علی کی صاحبزادی حدیقہ سے ہوا تھا، لیکن اولاد کوئی نہ ہوئی۔ غالباً رخصتی بھی نہ ہوئی تھی۔ اس سیدہ کا نکاح بعد ازاں سید محمد یعقوب سے ہوا۔ سید موسیٰ کے دو بھائی ابوالقاسم اور سید زین العابدین ٹونک میں مقیم رہے۔

سید حمید الدین

یہ سید صاحب کے تیسرے بھانجے تھے، سید احمد علی شہید پھولڑہ سے چھوٹے اور سید عبدالرحمٰن سے بڑے۔ تاریخ ٹونک سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر بھی کہتے تھے اور حمیدی ان کا تخلص تھا۔ ابتدا ہی سے سید صاحب کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔ سفر حج میں ساتھ رہے۔ سفر ہجرت میں بھی ساتھ تھے۔ وہی تھے جو مختلف منازل سے سفر کے حالات خطوط کی شکل میں اپنے عزیزوں کو بھیجتے رہے۔ یہ خطوط جن میں سے ایک کے سوا سب محفوظ ہیں، نہ صرف حالاتِ سفر کا بہترین مرقع ہیں بلکہ ان میں مقاماتِ سفر کی تمدنی، معاشرتی، اقتصادی اور جغرافیائی تفصیلات بھی نہایت عمدگی سے بیان کی گئی ہیں۔ جب سید صاحب پنجتار سے خبر تشریف لے گئے تو سید حمید الدین اور بعض دوسرے اصحاب کو کارِ خاص کی غرض سے ہندوستان بھیج دیا گیا۔ سید حمید الدین نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ میں نے اپنی برادری کے آدمیوں کا ایک الگ ہیلہ بنالیا ہے۔

سید صاحب کی زندگی میں یا ان کی شہادت کے بعد سید حمید الدین نے ٹونک میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ نواب وزیر الدولہ نے انہیں میر منشی کے عہدے پر مامور کر دیا۔ نواب کی نظروں میں وہ اس درجہ معزز و معتمد تھے کہ حکمران خاندان کے بعض افراد نے سرکشی کے بعد فرمانبرداری اختیار کی تو سید حمید الدین ہی کی وساطت سے وہ دربار میں حاضر ہوئے۔ ۲۰ رجمادی الاولیٰ ۱۲۸۲ھ (۱۱ر اکتوبر ۱۸۶۵ء) کو شام کے وقت ٹونک میں وفات پائی۔ بڑے ہی صالح، پرہیز گار اور باوقار تھے۔ ان کے دو فرزند تھے: سید محمد سعید اور سید عبدالمجید۔ یہ ٹونک میں مقیم رہے اور ان کی اولاد اب تک وہاں موجود ہے۔

سید عبدالرحمٰن

یہ سید صاحب کے سب سے چھوٹے بھانجے تھے اور خاندان کے لوگ انہیں چھوٹے میاں کہتے تھے۔ قرآن مجید حفظ کر لیا تھا، "سید احمد شہید" میں بتایا جا چکا ہے کہ

ایک موقع پر تہجد کے وقت اٹھ کر سورۂ روم کا ایک رکوع حفظ کر رہے تھے، سید صاحب نے رکوع سن لیا اور صبح کی نماز کے بعد بتایا کہ مراقبہ توجہ اللہ کا مضمون یہی ہے۔

سید صاحب معتمد الدولہ آغا میر کی دعوت پر لکھنؤ گئے تھے تو راستے میں سے سید عبدالرحمٰن کو پہلے بھیج دیا تھا کہ قندھاریوں کی چھاؤنی میں اپنا مکان صاف کرا کے فرش بچھا کر رکھیں، نیز کچھ چنے بھنوالیں نمک مرچ اور گڑ بھی لے لیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید عبدالرحمٰن نے لکھنؤ کے کسی جیش میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔

سندھ میں اقامت

سید صاحب کے ساتھ ہجرت کی۔ ٹونک پہنچنے کے بعد انہیں رائے بریلی واپس بھیج دیا گیا تا کہ سید صاحب کے اہل وعیال کو لے کر آئیں۔ پھر اس دنیا میں سید صاحب سے ملاقات کی سعادت نصیب نہ ہوئی۔ سید عبدالرحمٰن پہلے خاندان کی مستورات کے ساتھ ٹونک پہنچے، پھر سندھ گئے اور سید صاحب کے انتظام کے مطابق پیر کوٹ میں سید صبغۃ اللہ شاہ کے پاس ٹھہر گئے، جن کے خاندان نے بعد میں پیر پگاڑو کے نام سے ہمہ گیر شہرت حاصل کی۔ سید صاحب چاہتے تھے کہ اہل وعیال اور دوسرے متعلقین کو اپنے ساتھ سرحد بلوالیں، لیکن درانی سرداروں کی عداوت کے باعث راستے مخدوش ہو گئے تھے اور اہل وعیال کے محفوظ پہنچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اسی حالت میں سید صاحب نے بالاکوٹ میں شہادت پائی اور اہل وعیال کیلئے آگے جانے کا سوال ہی باقی نہ رہا۔

سید عبدالرحمٰن نے تمام متعلقین کے ساتھ تقریبا دس سال سندھ ہی میں گزارے۔ جس زمانے میں مولوی سید نصیر الدین دہلوی احیائے تحریک جہاد کے ارادے سے ہجرت کر کے سندھ پہنچے تھے، سید عبدالرحمٰن وہیں موجود تھے، لیکن پیر کوٹ سے میرانِ سندھ کی ملاقات کیلئے حیدر آباد گئے ہوئے تھے۔ مولوی سید نصیر الدین کو بھی وہیں بلا لیا اور میروں سے ان کی ملاقات کرائی۔ بعد ازاں مولوی صاحب کی اعانت کیلئے اعلام ناموں پر دستخط

کر کے بھیجتے رہے۔ ایک اعلام نامے کے آخر میں اپنے قلم سے مندرجہ ذیل عبارت لکھی:

> "از نیازمند درگاہ ایزدی عبدالرحمٰن بہ خدمات سامات محبان و دوستان مکتوب الیہم سلام برسد۔ مضمون واحد بود، لہٰذا علیحدہ ترقیم نمود، ضعیف را بہ ہر صورت در اہتمام ایں مہم دانند و وسع و امکان خود را صرف ایں عبادت عظمیٰ گردانند۔(۱)

> **ترجمہ**: خدا کی درگاہ کے نیازمند عبدالرحمٰن کی طرف سے ان محبوں اور دوستوں کو سلام پہنچے جن کے نام یہ اعلام نامہ بھیجا جا رہا ہے۔ مضمون واحد تھا، اس لئے علیحدہ نہ لکھا۔ میں بہرحال اس مہم کے اہتمام میں مشغول ہوں، آپ حضرات بھی اپنی ہر قوت و طاقت اس بڑی عبادت یعنی جہاد میں صرف کریں۔

بقیہ زندگی

تاریخ ٹونک سے معلوم ہوتا ہے کہ میر علی مراد خاں والی خیر پور نے سید عبدالرحمٰن کو اپنے مصاحبوں میں شامل کر لیا تھا۔ ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں نواب وزیر الدولہ نے انہیں دعوت دے کر اپنے پاس بلایا۔ چنانچہ وہ سید صاحب کے اہل و عیال اور دوسرے متعلقین کے ساتھ سندھ سے تشریف لائے۔ نواب نے انہیں قطب الامراء بہادر مظفر جنگ کا خطاب دے کر اپنے مشیروں اور مصاحبوں میں شامل کر لیا۔ نیز اپنی سپاہ کا خاص جرنیل مقرر کیا۔ باقی عمر انہوں نے اسی عہدے پر گزاری۔

ان کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی سید صاحب کے بڑے بھائی سید ابراہیم کی صاحبزادی سیدہ عاصمہ سے ہوئی۔ ان کے بطن سے ایک صاحبزادہ تھا، سید عبدالرزاق۔ یہ لاولد فوت ہو گیا۔ دوسری شادی مولوی سید حیدر علی دیوان ٹونک کی صاحبزادی نجم النساء بیگم سے ہوئی۔ ان کے بطن سے صرف دو لڑکیاں تھیں۔

---

(۱) اخبار مولوی نصیر الدین مخطوطہ ص: ۶۷۔

سید محمد یعقوب

یہ سید صاحب کے بڑے بھائی سید ابراہیم کے صاحبزادے تھے۔ ان سے سید صاحب کا دوہرا رشتہ تھا، ان کی والدہ سیدہ فاطمہ سید صاحب کی دوسری اہلیہ سیدہ ولیہ کی حقیقی بہن تھیں، اس لئے سید صاحب کو یہ بہت عزیز تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سب کے سامنے فرمایا کہ میں خدا اور اس کے رسول برحق کی اطاعت میں عزیزوں اور رشتہ داروں میں سے کسی کی خوشی، ناخوشی کو خاطر میں نہ لاؤں گا:

> ''اس وقت مجھے سب سے زیادہ محمد یعقوب عزیز ہے۔ دنیا کی چیزوں سے وہ جو چاہے لے لے، لیکن اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام بجالانے میں اس کی بھی رعایت نہ کروں گا۔''

بقیہ زندگی

سید صاحب کے ساتھ حج کیلئے گئے۔ آپ کے ساتھ ہجرت کی، لیکن انہیں بھی سید عبدالرحمٰن کے ساتھ ٹونک سے واپس بھیج دیا تھا۔ پھر یہ مستورات کے ساتھ سندھ میں رہے۔ وہاں سے ٹونک واپس آئے۔ نواب وزیرالدولہ انہیں بڑا عہدہ دینا چاہتے تھے لیکن قبول نہ کیا۔ پچاس روپے وظیفہ لے لیا۔ اسی میں عمر گزار لی۔ نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔ احکامِ شرعیہ کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) میں فوت ہوئے۔ ان کے تین صاحبزادے تھے: سید یوسف، سید ایوب اور سید ابراہیم۔ سید صاحب کی چھوٹی صاحبزادی سیدہ ہاجرہ کی شادی سید یوسف سے ہوئی تھی۔ سیدہ ہاجرہ کا انتقال ۲ ربیع الآخر ۱۲۷۶ھ (۲ نومبر ۱۸۵۹ء) کو ہوا۔ سید یوسف نے ۷ صفر ۱۲۸۶ھ (۱۹ مئی ۱۸۶۹ء) کو بہ عارضۂ فالج تکیہ رائے بریلی میں وفات پائی۔ ان کی اور ان کے بھائیوں کی اولاد ٹونک میں موجود ہے۔

چوتھا باب:

مولانا محمد یوسف پھلتی

یہ غالباً شاہ ولی اللہ کے بھائی شاہ اہل اللہ کے پوتے تھے۔ نواب وزیر الدولہ نے لکھا ہے کہ علم میں "بے مثل" اور عمل میں "بے بدل" تھے۔ (۱) سید صاحب راجپوتانہ سے دہلی پہنچے تو انہوں نے مولانا عبدالحئی اور مولانا شاہ اسمٰعیل سے پہلے سید صاحب سے بیعت کی اور ترقیٔ مدارج میں وہ مقام حاصل کیا کہ ان دونوں بزرگوں کیلئے باعثِ رشک بنے رہے۔ ارادت اور خدمت گزاری میں کوئی ان کے برابر نہ پہنچ سکا۔ سید صاحب نے ذکر و فکر اور مراقبے کے بجائے بندوق، تلوار اور دوسرے ہتھیار چلانے کی مشق کا حکم دیا تا کہ جہاد کا سرو سامان ہو سکے تو مولانا محمد یوسف نے ایسی مشق بہم پہنچائی کہ پے بہ پے بندوقیں چلاتے تھے اور ایک مرتبہ سر کر کے دوسری مرتبہ بھرنے اور سر کرنے میں تین بار پلک جھپکنے سے زیادہ دیر نہ لگتی تھی۔ (۲)

ابتدا ہی سے سید صاحب نے اپنے اور جماعت کے تمام انتظامی امور مولانا محمد یوسف کے حوالے کر دیے تھے۔ انہیں کے پاس روپیہ جمع ہوتا۔ وہی چیزیں خریدتے۔ انہیں کے پاس حساب کتاب رہتا۔ جب کام بڑھ گیا تو سید صاحب نے ان کی امداد کیلئے مقرر کر دیے۔ حافظ قرآن تھے۔ قضاء حوائج بشریہ کے سوا قرآن ہر وقت ان کی زبان پر جاری رہتا تھا۔ رمضان شریف میں روزانہ ایک مرتبہ قرآن شریف ضرور ختم کر لیتے۔ کچھ حصہ تراویح میں سناتے، باقی تہجد میں پڑھتے۔

---

(۱) وصایا حصہ دوم ص: ۶۰ (۲) وصایا حصہ دوم ص: ۶۰

شانِ اتقاء

سید صاحب نے ایک مرتبہ انہیں رائے بریلی سے مظفر نگر یا سہارنپور گھوڑا لانے کیلئے بھیجا جو کسی شخص نے بطور نذر پیش کیا تھا۔ یہ آئے، وطن راستے میں پڑتا تھا۔ عام مقامات کی طرح وہاں بھی صرف ایک رات ٹھہرے۔ اس سے زیادہ قیام نہ کیا۔ اس لئے کہ سید صاحب نے ایک خاص کام کیلئے بھیجا تھا اور اس سلسلے میں دوسرا کام گوارا نہ ہوا۔ عزیزوں نے ہر چند کہا کہ ایک آدھ دن کے زیادہ قیام میں مضائقہ نہیں۔ مولانا نے قبول نہ کیا۔ اس سے بھی حیرت انگیز تر امر یہ ہے کہ واپسی میں گھوڑا ساتھ تھا، تاہم ایک لمحے کیلئے بھی اس پر سوار نہ ہوئے۔ اس لئے کہ وہ سید صاحب کا تھا اور ان کی کوئی چیز اذن واجازت کے بغیر اپنے مصرف میں لانا ان کی شانِ اتقا کے منافی تھا۔

علالت

جنگ شیدو کے بعد سید صاحب نے بونیر و سوات کا دورہ شروع کیا تو دوسرے رفقاء کی طرح مولانا محمد یوسف بھی ساتھ تھے۔ اسی سفر میں وہ بیمار ہوئے اور بیماری مسلسل بڑھتی رہی۔ غالباً ضیق النفس کا عارضہ تھا۔ شدید علالت کے باوجود نہ یہ سید صاحب سے مفارقت پر راضی تھے اور نہ سید صاحب کو یہ پسند تھا کہ انہیں کسی مقام پر چھوڑ جائیں۔ دورے کے سلسلے میں سید گل بادشاہ پشاوری نے ایک جھپان سید صاحب کی سواری کے لیے بھیج دیا تھا، آپ نے مولانا محمد یوسف کو اس میں سوار کرا کے ساتھ لے لیا۔ اوچ سے نکلے ہوئے تیسرا دن تھا کہ ایک گاؤں کے لوگوں نے آپ کو روک لیا اور عرض کیا کہ پاس کے گاؤں والوں سے ہماری کش مکش چلی آرہی ہے، آپ صلح کرادیں۔ سید صاحب وہاں مسجد میں ٹھہر گئے اور گاؤں والوں کو بلا کر صلح کیلئے بات چیت شروع کر دی۔ زیادہ تر ساتھی قریب کے ایک بڑے گاؤں میں چلے گئے۔ سید صاحب مسجد ہی میں تھے کہ میاں

دین محمد نے حاضر ہو کر عرض کیا: مولوی محمد یوسف کو بڑی تکلیف ہے۔ سید صاحب نے فرمایا، بارگاہِ الٰہی میں دعاء کیجیے اور ان کی خدمت میں حاضر رہیے۔

علاج

مجمع میں پاس کے گاؤں کا بھی آدمی تھا۔ وہ بولا کہ ہمارے ہاں تین آدمی طبابت کرتے ہیں، مولوی صاحب کو ان کے پاس بھیج دیجیے۔ سید صاحب نے فرمایا: تندرستی اور بیماری اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ لوگوں نے علاج کی ضرورت پر زیادہ زور دیا تو سید صاحب نے اجازت دے دی، چار آدمی مولانا محمد یوسف کی چارپائی اٹھا کر پاس کے گاؤں میں لے گئے۔ میاں عبدالقیوم بھی ساتھ تھے۔

وفات

راویوں کا بیان ہے کہ گاؤں پہنچ کر بیماری شدید صورت اختیار کر گئی۔ مولانا نے اس حالت میں کہا کہ میرا دل نان پیاز کھانے کو چاہتا ہے اور تھوڑا سا دہی بھی لاؤ۔ تیمارداروں نے عرض کیا کہ کھچڑی تیار ہے، وہی کھانی چاہیے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں تو صرف نان پیاز کھاؤں گا۔

غرض اسی گاؤں میں طبیعت اس درجہ بگڑ گئی کہ بظاہر جانبری کی کوئی امید نہ رہی۔ اس حالت میں مولانا نے کہا: جس طور بھی ممکن ہو، مجھے جلد سے جلد حضرت کی خدمت میں پہنچاؤ تاکہ جان دینے سے پہلے ان کی زیارت کا شرف حاصل کرسکوں۔ چارپائی اٹھانے والوں کی تلاش شروع ہوئی، وہ جلد نہ مل سکے اس لئے کہ فصل کے دور کا موسم تھا۔ لوگ کھیتوں میں مصروف تھے۔ دیر ہوگئی تو مولانا نے فرمایا، مجھے اٹھا کر بٹھاؤ۔ سہارا دے کر بٹھا دیا گیا۔ اسی حالت میں اس پاک نفس مجاہد کی روح عالم علوی میں پہنچ گئی۔

ولی اللہ

سید رستم علی چلگانوی گھوڑے پر سوار ہو کر یہ دردناک خبر سید صاحب کے پاس لائے۔ آپ اس وقت تک مسجد میں تشریف فرما تھے۔ سنتے ہی کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اور تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا:

سید دنیا بڑی سخت جگہ ہے، جو یہاں سے ثابت قدم گیا وہی خوش نصیب ہے۔

یہ اشارہ تھا کہ مولانا محمد یوسف اس دنیا سے ثابت قدم گئے۔ سید صاحب دیر تک مولانا کے اوصاف بیان فرماتے رہے۔ اہل پھنتت میں سے شیخ ضیاء الدین، شیخ صلاح الدین، شیخ عبدالحکیم، شیخ ناصر الدین اور حافظ عبدالرحمٰن کو میت لانے کیلئے بھیج دیا۔ اہل سرحد مردوں کو عموماً ان قبرستانوں میں دفن کرنا افضل سمجھتے تھے، جہاں کسی مشہور بزرگ کی قبر ہوتی۔ جس گاؤں میں مولانا فوت ہوئے، وہاں بھی ایک بزرگ دفن تھے، اس لئے اہل دہ نے عرض کیا کہ مولانا کو یہیں دفن کرنے کی اجازت دیجیے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ہمارے مولوی صاحب خود ولی اللہ تھے، ان کی میت یہاں لے آیئے۔

لشکر اسلام کے قطب

قاضی احمد اللہ میرٹھی نے غسل و کفن کا انتظام کیا۔ سید صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ پھر مولانا شاہ اسمٰعیل سے مخاطب ہو کر فرمایا:

> ''یوسف جی اس لشکر اسلام کے قطب تھے۔ آج لشکر قطب سے خالی ہو گیا۔ دہ بڑے قانع، زاہد، متوکل، مستقیم الحال اور مستقل مزاج تھے۔''

یہ الفاظ زبان پر جاری تھے اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ سید صاحب اور شاہ اسمٰعیل نے اس مایہ ناز وجود کی میت لحد میں اتاری۔ مولانا کا انتقال ایک گاؤں میں ہوا جو اوچ اور بھانڈا کے درمیان تھا، نام معلوم نہیں۔

کمال دیانت

نواب وزیر الدولہ نے لکھا ہے کہ غلے اور دوسری چیزوں کی تقسیم مولانا محمد یوسف کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے ایک پیمانہ مقرر کرلیا تھا، سب کو اسی کے مطابق غلہ دیتے۔ سید صاحب بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ کبھی کبھی آپ مولانا سے مزاحاً فرماتے کہ مجھے زیادہ کیوں نہ دیا۔ مولانا ادب سے عرض کرتے، حکم ہو تو پوری جنس خدمت والا میں حاضر کردیتا ہوں، مگر مجھے حضرت نے تقسیم کا حکم دے رکھا ہے، اس میں مساوات کو ترک نہیں کرسکتا۔

نواب موصوف ہی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ سید صاحب عشاء کی نماز ادا کرکے مائل بہ استراحت تھے کہ پینے کیلئے پانی مانگا۔ مولانا یوسف کوزہ بھر کر لائے۔ اس اثناء میں سید صاحب کی آنکھ لگ گئی۔ مولانا کوزہ ہاتھ میں لیے چپ چاپ کھڑے رہے کہ جب بیدار ہوں گے، پانی پیش کروں گا۔ آخر شب سید صاحب بیدار ہوئے تو پانی حاضر کیا۔ رات بھر کھڑے رہ کر ارادت کا جو شاندار نمونہ پیش کیا تھا، سید صاحب نے اس کی تحسین فرمائی اور مولانا کیلئے دعاء کی۔

''وصایا'' میں ایک جگہ مرقوم ہے کہ مولانا محمد یوسف اشرفِ رفقاء اور اکرمِ خدما سے تھے۔ امانت میں بے مثل اور دیانت میں بے بدل۔ (۱)

---

(۱) زیادہ تر حالات نواب وزیر الدولہ کے وصایا سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ ہو حصہ دوم ص ۱۱۰، ۱۲۳۔

پانچواں باب:

سید ابومحمد اور سید ابوالحسن

سید ابومحمد نصیر آبادی سید صاحب کی زوجہ اولیٰ بی بی زہرہ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ بڑے خوب صورت اور خوش رو جوان تھے۔ لباس بھی بہت عمدہ پہنتے تھے۔ برسوں لکھنؤ میں ملازم رہے۔ اہل اللہ کمیدان میں بٹالین میں جمعدار تھے۔ سپہ گری کے علاوہ مختلف فنون میں طاق تھے۔ گھوڑے کی سواری میں مہارت تامہ حاصل تھی، کھانا بہت اچھا پکاتے تھے۔ آئینہ سامنے رکھ کر اپنا خط خود بنالیتے۔ کپڑے قطع کرنے اور سینے میں بھی کمال حاصل تھا۔ ہمیشہ پرتکلف لباس پہنتے تھے، اس لئے ہر مجمع میں ممتاز ہوتے۔ سید صاحب سے ملنے کیلئے تکیہ شریف میں آتے تو لوگ ان کا پرتکلف لباس دیکھ کر پوچھتے، حضرت! یہ کون ہیں؟ سید صاحب جواب دیتے، یہ ہمارے بھائی ہیں۔ عادت شریف کے مطابق انہیں ٹوکنے میں عجلت کبھی نہ کی۔ گویا اصلاح اخلاق وعادات کے ایک حاذق طبیب کی طرح معلوم تھا کہ سید ابومحمد کی طبیعت کس نہج پر چل رہی ہے اور وہ کہاں پہنچ کر اصلاح کی تمام منزلیں طے کرلے گی۔

ہجرت

سید صاحب نے ہجرت میں قدم رکھا تو دوسرے عزیزوں کی طرح یہ بھی رخصتی ملاقات کیلئے تکیہ شریف پہنچے اور رائے بریلی سے دلمؤ تک ساتھ گئے۔ لوگوں نے پوچھا، سید ابومحمد! کیا آپ بھی جہاد کیلئے جارہے ہیں؟ جواب دیا نہیں، ہم تو صرف میاں

صاحب(۱) کو چھوڑنے آئے ہیں۔ دلموٴ سے ایک دو منزل آگے چل کر پوچھا تو پھر یہی جواب دیا۔ ٹونک میں یہ سوال دہرایا گیا تو فرمایا: اجمیر قریب ہے، خیال ہے کہ اسے بھی دیکھتے چلیں۔ اجمیر سے بھی واپس نہ ہوئے تو سب پر آشکارا ہوا کہ گھر سے معیت کا پختہ ارادہ کر کے آئے تھے۔

بیعتِ رضا

مختلف جنگوں میں شریک رہے۔ سرحد پہنچنے کے بعد تمام تکلفات چھوڑ دیے تھے۔ بالکل معمولی لباس پہنتے اور مجاہدین میں جو رسد تقسیم ہوتی اسی پر قناعت کرتے۔ جنگ مایار کیلیے تورو سے روانہ ہونے لگے تو گھوڑا تھان پر چھوڑ کر سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

> ”میاں صاحب! جس روز سے میں آپ کے ساتھ گھر سے نکلا ہوں، یہی سمجھتا رہا کہ آپ میرے عزیز اور رشتہ دار ہیں۔ آپ کو عروج ہوگا تو میرے لیے بھی ترقی اور بہبود کی صورت نکلے گی، نہ میری معیت خدا کے واسطے تھی، نہ ثواب جان کر کسی لڑائی میں شامل ہوا۔ اب اس فاسد خیال سے توبہ کرتا ہوں۔ اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ آپ رضائے باری تعالیٰ کے لیے جہاد کی بیعت لیں اور دعاء کریں کہ خدا اس نیت اور ارادے پر ثابت قدم رکھے۔

عزمِ جنگ

سید صاحب نے بیعت لی اور دعاء کی۔ موقع کی نزاکت اور سید ابو محمد کی شانِ اخلاص دیکھ کر حاضرین کی آنکھوں میں آنسو جاری ہو گئے۔ دعاء کے بعد ابو محمد نے سید صاحب سے مصافحہ کیا۔ پلٹ کر گھوڑے کی طرف چلے تو ان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ

---

(۱) خاندان کے تمام لوگ سید صاحب کو میاں صاحب ہی کہتے تھے۔

رہے تھے۔ بسم اللہ کہہ کر دایاں پاؤں رکاب میں رکھا سوار ہوتے ہی پکار کر کہا:

”بھائیو! گواہ رہنا، اب تک ہم شان و شوکت اور خواہش نفس کیلئے گھوڑے پر سوار ہوتے تھے۔ خدا کا اس میں کچھ واسطہ نہ تھا۔ اب ہم محض خدا کی خوشنودی اور رضامندی کیلئے بہ نیتِ جہاد سوار ہوتے ہیں۔“

شہادت

یہ بھی سواروں میں شامل تھے۔ چھیدا ان کے گھر کا آدمی تھا، اس کا بیان ہے کہ جب درانیوں نے ہمارے سواروں پر یورش کی اور غازی پیچھے ہٹے تو سید ابو محمد بھی ان میں شامل تھے۔ وہ کچھ دور جا چکے تھے کہ میں درانی سواروں میں گھر گیا۔ گھبرا کر انہیں مدد کے لئے آواز دی۔ میری آواز سنتے ہی باگ موڑی اور آ کر درانی سواروں سے لڑنے لگے۔ میں موقع پا کر نکل گیا۔ وہ لڑتے رہے، میں نے دور سے دیکھا کہ انہوں نے دو درانی سواروں کو مار گرایا۔ پھر خود بھی زخم کھا کر گھوڑے سے گر گئے۔

قاضی گل احمد الدین پکھوواری شیوہ سے تورو جا رہے تھے۔ مایار میں توپوں کی آواز سنی تو چاہا کہ جنگ میں شریک ہوں۔ میدان میں پہنچے تو درانی شکست کھا کر جا چکے تھے اور مولوی مظہر علی کو شہدا کی لاشیں اور مجروحین اٹھوانے کا حکم ہو چکا تھا۔ سید صاحب نے قاضی گل کو بھی اسی کام پر مامور کر دیا۔ وہ فرماتے ہیں، میں نے ایک جگہ سید ابو محمد کو زخمی پڑے ہوئے دیکھا۔ زخم ایسے کاری تھے کہ ان کے ہوش و حواس بجا نہ تھے۔ میں نے کئی بار ان کے کان میں پکار کر کہا: سید ابو محمد! حضرت امیر المومنین کو فتح حاصل ہوئی۔ وہ ہونٹ چاٹ رہے تھے اور آہستہ آہستہ الحمد للہ الحمد للہ کہہ رہے تھے۔ مجھے کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے ساتھیوں کو آواز دی کہ انہیں اٹھاؤ۔ کمبل میں رکھ کر اٹھایا۔ کچھ دیر بعد جاں بحق ہو گئے۔

اخلاق وعادات اور کمالات

سید ابو محمد کے متعلق ایک خاص ذریعے سے مزید معلومات حاصل ہوئیں جو ذیل میں درج ہیں:

> "آنکھ، ناک، رنگ، روپ میں بہت خوب صورت تھے۔ گھوڑا پھیرنے میں انہیں خاص کمال حاصل تھا۔ اکثر میخ زمین میں گاڑ لیتے۔ اس پر کوڑی رکھ دیتے۔ گھوڑا تیز دوڑاتے ہوئے انگلی سے کوڑی اڑا دیتے اور میخ بدستور گڑی رہتی۔ کیا امکان کہ انگلی میخ میں لگے۔ اپنے گھوڑے کی مالش خود کرتے۔"

اہل اللہ کمیدان ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ خاص کام انہیں سے لیتے۔ انہوں نے ایک نہایت نفیس درباری لباس تیار کرا رکھا تھا، جسے وقتاً فوقتاً پہنتے۔ لوگ سمجھتے کہ سوڈیڑھ سو سے کم کے ملازم نہ ہوں گے۔ عام لباس یہ تھا: سر پر پگڑی، چست انگرکھا، غرارہ دار پاجامہ۔ پندرہ وضع کی پگڑی باندھ سکتے تھے۔ اپنا خط خود بناتے۔ تھوڑی پر سے داڑھی کتر کر صاف کرتے۔ نہ کبھی حقہ پیا، نہ کوئی نشہ استعمال کیا۔ نہ کبھی کسی نامحرم عورت کی طرف نگاہ اٹھائی۔ نہ منہیات شرعیہ کے نزدیک گئے۔ کسی کے ہاتھ کا کھانا پسند نہ تھا۔ خود کھانا پکانے کے ماہر استاد تھے۔ اپنا کپڑا خود قطع کرتے۔ لحاف، رضائی، مرزئی میں روئی ایسی عمدگی سے بھرتے کہ ندافوں کی عقل دنگ رہ جاتی۔ مزاج میں لطافت ونفاست بہت زیادہ تھی۔

جذبۂ خدمت

سید صاحب کی معیت اختیار کرلینے کے بعد یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ غریب امیر، اپنے بیگانے، کسی کی تیمارداری یا خدمت گزاری میں نہ تنگ وعار تھی اور نہ کراہت وکاہلی کے روادار ہوتے۔ اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتے، اپنے ہاتھ سے بول وبراز اٹھاتے۔ بڑے

خوش اخلاق اور بے شر انسان تھے۔ کبھی کسی سے جھگڑا نہ کیا، بے ضرورت کبھی کہیں نہ گئے۔

سید ابوالحسن

سید ابوالحسن بھی نصیر آباد ہی کے تھے۔ جماعت میں انہیں عموماً دادا ابوالحسن کہا جاتا تھا۔ یہ بھی پہلے اہل اللہ کی بٹالین میں جمعدار تھے۔ سید صاحب کے ساتھ ہجرت کی لیکن اجمیر تک کسی کو خبر نہ ہونے دی کہ ہجرت کا پختہ ارادہ کر کے نکلے ہیں۔ یہ جماعتِ خاص کے علمدار تھے۔ نشان صبغۃ اللہ انہیں کے پاس رہتا تھا۔ جنگِ بالاکوٹ میں سید صاحب مسجد بالا سے نکلے تھے تو دادا ابوالحسن اپنے نشان کے ساتھ آگے آگے تھے۔ مسجد زیریں سے نکل کر سید صاحب نے سکھوں پر حملہ کیا تھا تو تھوڑی دور چل کر ایک جگہ توقف فرمایا تھا۔ دادا ابوالحسن اس وقت بھی ساتھ تھے۔ پھر معلوم نہ ہو سکا کہ میدانِ جنگ کے کس حصے میں اور کس حال میں شہادت پائی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بالاکوٹ ہی میں شہید ہوئے۔

چھٹا باب:

قاضی محمد حبان

قاضی سید محمد حبان کا تراغور بند (سرحد آزاد) کے باشندے تھے۔ بہت بڑے عالم، ذکی الطبع، غیور اور خوش تقریر تھے۔ منظورہ میں ہے:

''مرد شجیع واورع صاحب علم ونافع فہم کامل وطبع تیز''

ترجمہ: حد درجہ شجاع و متقی ان کا علم نفع بخش تھا، فہم کامل اور طبیعت تیز۔

غالباً ہندوستان میں رہ کر علم حاصل کیا اور کچھ مدت کلکتہ کے کسی مدرسے میں مدرس بھی رہے۔ سید صاحب خہر میں تھے، جب یہ ملاقات کیلئے آئے۔ سید صاحب سے عرض کیا کہ میں آسودہ حال ہوں۔ روپیہ پیسہ خدا نے دے رکھا ہے۔ کسی دنیوی چیز کی احتیاج نہیں۔ صرف خدا کیلئے آیا ہوں۔ دل پر اثر ہوگا تو بیعت کروں گا ورنہ واپس چلا جاؤں گا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ بیعت کیجیے، اللہ تعالیٰ برکت دے گا۔ بیعت و مراقبہ کے بعد قاضی صاحب نے کہا کہ میں اندھا تھا، آنکھیں کھل گئیں۔ کافر تھا، مسلمان ہوگیا۔ سید صاحب نے فرمایا: یوں نہ کہیے۔ یہ کہیے کہ پہلے ہی سے مسلمان تھا، اب ایمان ترقی کر گیا۔

قاضی القضاۃ

اس وقت سے قاضی صاحب نے وابستگی اختیار کی، پھر آخری دم تک سید صاحب کا ساتھ نہ چھوڑا۔ ساداتِ ستھانہ اور ارباب بہرام خاں تہکالی کے سوا سرحد کے کسی شخص کو سید صاحب کی معیت میں عظمت و رفعت کا وہ مقام نصیب نہ ہوا جس پر قاضی حبان فائز

رہے۔ بیعت اقامتِ شریعت کے بعد سید صاحب نے انہیں قاضی القضاۃ مقرر فرما دیا تھا۔ چنانچہ خود ایک مکتوب میں جو بیعت مذکورہ ہو جانے کے بعد لکھا گیا تھا، فرمایا:

> ”درہمیں مجمع یک فاضل جلیل متدین را منصبِ قضا سپردہ شد و دستارِ قضا بر سرِ او بستہ شد و منشورِ قضا بہ او دادہ شد۔“(۱)
>
> **ترجمہ:** اسی مجمع (مجمع برائے اقامتِ شریعت) میں ایک بلند مرتبہ عالم اور دیندار کو منصبِ قضا سونپ دیا گیا۔ دستارِ قضا اس کے سر پر باندھ دی گئی اور قضا کا فرمان اس کے حوالے کر دیا گیا۔

صلح و جنگ اور اصلاح و ارشاد کے سلسلے میں مختلف تدبیروں پر غور و خوض کیلئے جتنی مجلسیں منعقد ہوئیں، ان سب میں سید حبان شریک ہوتے تھے۔ چوں کہ وہ مقامی آدمی تھے اور اپنے ہاں کے حالات کو بہتر سمجھتے تھے، اس لئے ان کے مشورے بہت مفید و کارآمد سمجھے جاتے تھے۔ سردار پائندہ خاں تنولی کی ضد کے باعث جنگ کی نوبت آئی اور وہ شکست کھا کر دریا کے پار چلا گیا تو قاضی حبان ہی کی کوشش سے صلح ہوئی تھی۔ قاضی صاحب نے پائندہ خاں سے ملاقات کے بعد ایسی بے باکانہ گفتگو کی کہ خان کیلئے فوراً صلح کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

ایک لطیفہ

قاضی صاحب فصلِ خصومات کیلئے علاقے کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ سرحدی لوگ دریا میں ننگے نہانے کے عادی ہو چکے تھے۔ انہیں بہت منع کیا، لیکن حسب دلخواہ اثر نہ ہوا۔ مجبوراً حکم دے دیا گیا کہ جو شخص نہاتا ہوا پکڑا جائے، اسے جرمانے کی سزا دی جائے۔ ایک مرتبہ قاضی صاحب دورہ کرتے ہوئے کھبل پہنچے۔ وہاں ایک شخص نے تواضعاً قاضی صاحب کو تازہ مچھلی کھلائی۔ اتفاق سے دوسرے یا تیسرے روز وہ ننگا نہاتا ہوا پکڑا گیا۔

---

(۱) رائے بریلی والے خطوط کا مجموعہ ص: ۲۱۔

مقدمہ قاضی صاحب کے روبرو پیش ہوا، جرم ثابت ہو گیا اور قاضی صاحب نے حسب ضابطہ آٹھ آنے جرمانہ کر دیا۔ اس نے جوش اور غصے کے عالم میں کہا کہ قاضی صاحب جرمانہ تو کر دیا لیکن مچھلی معاف نہ کروں گا۔ قاضی صاحب نے مسکرا کر فرمایا کہ مچھلی ہضم ہو چکی۔ اب تمہاری معافی کی احتیاج نہیں، جو ضابطہ جاری ہے، وہ ٹل نہیں سکتا۔

اہل رسوم کا معاملہ

ایک مرتبہ قاضی صاحب نے وعظ فرمایا کہ جو اہل رسوم خدا اور رسول کے احکام کے خلاف باپ دادا کی ریت پر چلتے ہیں، شریعت کا حکم سنایا جائے تو نہیں مانتے، وہ لوگ عملاً کافر ہیں، اس لئے کہ اپنی ریت کو خدا اور رسول کے احکام پر ترجیح دیتے ہیں۔ قاضی صاحب کا ایک شاگرد اس پر سخت پابند ہو گیا۔ ایک روز اس نے کسی ملا سے گفتگو کرتے ہوئے یہی بات دہرائی تو اس نے کہا کہ قاضی حبان جھوٹ کہتا ہے۔ یہ بات قاضی صاحب تک پہنچی تو انہوں نے اس شخص کو بلا کر واقعہ دریافت کیا۔ وہ بولا میں نے کسی کتاب میں دیکھا ہے کہ اہل رسوم کافر نہیں۔ پوچھا کس کتاب میں؟ جواب دیا "منیۃ المصلی" میں۔ قاضی صاحب یہ سنتے ہی جوش میں آ گئے۔ اسے زمین پر گرا کر گھونسوں سے مارنے لگے کہ نامعقول! پڑھتا ہے منیۃ المصلی اور مسئلہ بیان کرتا ہے اہل رسوم کا؟ جن کتابوں میں اہل رسوم کے مسائل ہیں وہ تو تیرے استادوں نے بھی نہ پڑھی ہوں گی۔ توبہ کر اور کلمہ پڑھ ورنہ تجھے چھوڑنے کا نہیں۔ چنانچہ کلمہ پڑھوا کر چھوڑا۔

انتظامِ عشر

پائندہ خاں سے سید صاحب کی صلح ہو گئی تو قاضی حبان نے خود یہ تجویز پیش کی کہ پشاور کے میدانی علاقے کے لوگ خود سر سے ہو رہے ہیں، جنہوں نے بہ طیب خاطر ادائے عشر کا اقرار کیا تھا وہ بھی بے پروا نظر آتے ہیں۔ اگر کچھ لشکر میرے ہمراہ کر دیں تو وعظ و نصیحت سے

سارے علاقے کو پابندِ شریعت بنادوں۔ جو نہ مانیں ان سے بزور منواؤں۔ شرط یہ ہے کہ مجھے اس لشکر کا امیر بنا کر پورے اختیارات دے دیجیے۔ اس لیے کہ میں مقامی آدمی ہوں، اپنے ہم وطنوں کی طبیعت و مزاج کو خوب جانتا ہوں۔ ایسا آدمی یہاں اور کوئی نہیں۔ شاہ اسمٰعیل کو میرے ساتھ کر دیجیے تاکہ اگر مجھ سے نادانستہ کوئی فعل خدا اور رسول کی رضا کے خلاف سرزد ہونے لگے تو شاہ صاحب مجھے روک دیں۔ سید صاحب نے یہ رائے قبول فرمائی۔ تقریباً چھ سو سوار اور پیادے قاضی صاحب کے ہمراہ کر دیے۔ ان کے ساتھ نقارہ، شتری اور چھ زنبورکیں بھی تھیں۔ رخصت کرتے وقت نصیحت فرمائی کہ یہ خدا اور رسول کا کام ہے، ایسا نہ ہو کہ اس میں نفس کی خواہش دخیل ہو جائے۔

قاضی صاحب نے پورے علاقے کا دورہ کیا اور ہر جگہ شرعی احکام نافذ کر دیے۔ کھلابٹ کے لوگوں نے مخالفت کا ارادہ کیا، لیکن قاضی صاحب ایسے انداز میں بستی پہنچ گئے کہ کسی کو مخالفت کی جرأت نہ ہوئی۔ اس سلسلے میں جن مقامات کا ذکر آیا ہے، ان کے نام یہ ہیں: توپی، شیخ جانا، نواکلی، کھلابٹ، مرغز، ٹھنڈ کوئی، کدا، پنج پیر، ہنڈ، زیدہ، شیوہ، چارگلئی، سدم، گھڑیالی، اسمٰعیلہ، امان زئی۔

مردان پر یورش

ہوتی اور مردان کے رئیس نے مخالفت کا فیصلہ کر لیا اور وہ اپنے بھائی کو نائب بنا کر خود پشاور چلا گیا تاکہ درانیوں سے مدد لے کر قاضی حبان کا مقابلہ کرے۔ قاضی صاحب کو یہ حالات معلوم ہوئے تو شاہ اسمٰعیل، رسالدار عبدالحمید خاں وغیرہ سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ سب نے رائے دی کہ پیچھے ہٹنا مناسب نہیں، مردان پر یورش کرنی چاہیے۔ جو کچھ پیش آئے گا، دیکھا جائے گا۔ قاضی صاحب اس پر بہت خوش ہوئے اور قصبے پر یورش کا فیصلہ کر لیا۔

شہادت

انہوں نے جنگی مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر اقدام کیا اور قصبہ قبضے میں آ گیا۔ صرف گڑھی میں تھوڑی سی فوج لڑتی رہی۔ قاضی صاحب نے گڑھی پر قبضہ جمانے کی تدبیر یہ سوچی کہ خانہ بہ خانہ ہوتے ہوئے اس کے پاس پہنچ جائیں۔ تھوڑے سے آدمی ان کے ساتھ تھے۔ پیش قدمی کرتے ہوئے ایک گلی سامنے آ گئی۔ گڑھی سے گولیاں بارش کی طرح آ رہی تھیں اور گلی سے گذر کر دوسرے مکان میں پہنچنا مشکل تھا، لیکن قاضی صاحب نے رکنا پسند نہ کیا۔ ان کے چار پانچ ساتھی سلامت نکل گئے۔ پھر ایک شخص کے گولی لگی وہ شہید ہو گیا۔ دوسرے ریلے میں بھی کچھ آدمی بچ نکلے، کچھ شہید ہو گئے۔ آخر قاضی صاحب خود چند آدمیوں کے ساتھ آگے بڑھے۔ تمام ساتھی بچ گئے لیکن قاضی صاحب کے سر میں گولی لگی اور شہادت پائی۔

مدفن

گڑھی کی تسخیر تک یہ خبر مصلحتاً اخفا میں رکھی گئی۔ قاضی حبان علم وفضل، غیرت وحمیت دین اور زہد وتقویٰ میں سرحد کے یگانہ فرد تھے۔ اعلائے کلمۃ اللہ میں ان کی جرأت وبیباکی بے مثل تھی۔ تمام غازیوں کو ان کی شہادت سے سخت صدمہ پہنچا۔ سید صاحب بھی اس واقعے پر بہت متالم ہوئے۔ مولانا شاہ اسمٰعیل چاہتے تھے کہ انہیں مردان ہی میں دفن کر دیں، لیکن قاضی حبان کے بھائی راضی نہ ہوئے اور وہ اپنے قومی دستور کے مطابق میت کو چارپائی پر ڈال کر وطن لے گئے۔

ساتواں باب:

مولوی خیر الدین شیرکوٹی

ان کے ابتدائی حالات معلوم نہ ہو سکے۔ نہ یہ پتا چل سکا کہ مولوی صاحب نے کب سید صاحب سے بیعت کی اور کس قافلے میں سرحد پہنچے۔ ان کا نام پہلے پہل اس فوج کے سلسلے میں مذکور ہے جو مولانا شاہ اسمٰعیل کی سرکردگی میں بکھلی (ہزارہ) بھیجی گئی تھی۔ ڈمگلہ پر شبخون میں یہ میاں محمد مقیم کے نائب و مشیر تھے۔ انہیں کے ایماء پر غازی سکھ لشکرگاہ سے باہر آئے تھے اور مولوی صاحب خود ایک چھوٹی سی جماعت کیساتھ اس وقت تک سکھوں کا مقابلہ کرتے رہے، جب تک غازیوں کا بڑا حصہ باہر نکل کر محفوظ مقام پر نہ پہنچ گیا۔

مختلف خدمات

سید صاحب خبر سے واپس ہو کر پنجتار میں مقیم ہوئے تو مولوی خیر الدین کا ڈیرہ فصیل سے باہر تھا۔ پھر سید صاحب کے حکم سے انہوں نے اور مولوی احمد اللہ ناگپوری نے قاسم خیل میں گولے ڈھالنے کا کارخانہ بنالیا تھا، جہاں ڈیڑھ سیر، تین سیر اور پانچ سیر کے گولے تیار ہوتے تھے۔ خادے خاں جنرل ونتورا کو صوبہ سرحد پر چڑھا لایا تھا اور اس کا ارادہ یہ تھا کہ خود پنجتار پر حملہ کرے۔ پھر واپس ہو گیا اور سید صاحب کو لکھا کہ گفتگو کیلئے اپنا وکیل بھیج دیجئے۔ سید صاحب نے مولوی خیر الدین ہی کو بھیجا تھا۔ موصوف نے ونتورا کے تمام اعتراضات کا شافی جواب دیا۔ ونتورا تلخ ہو کر بولا، مولوی صاحب نے بھی اسی کا انداز اختیار کرلیا۔ آخر میں کہہ دیا، آپ کو اپنے لشکر پر ناز ہوگا، ہمارا بھروسا اللہ پر

ہے۔ اس کا لشکر سب سے زیادہ قوی ہے۔

سفارت

سید صاحب نے ایک مرتبہ پایندہ خاں کی طلب پر بھی کچھ آدمی گفتگو کیلئے بھیجے تھے ان میں بھی مولوی صاحب شامل تھے۔ پھر سکھوں کی طرف سے پیغامِ مصالحت موصول ہونے پر مولوی صاحب موصوف اور حاجی بہادر شاہ خاں کو بھیجا تھا۔ انہوں نے دوبارہ ونتورا اور ایلارڈ سے مفصل بات چیت کی۔

اس سلسلے میں علمی اور مذہبی مسئلے بھی زیر بحث آئے۔ مولوی صاحب نے نہایت اچھے انداز میں مسائل کی توضیح فرمائی اور تاریخی حوالوں سے اپنے موقف کو درست ثابت کیا۔ سکھ سرحدی رؤسا سے عموماً گھوڑے اور باز خراج میں وصول کیا کرتے تھے۔ ونتورا نے حسنِ تدبیر سے کام لیتے ہوئے کہا کہ ہم خلیفہ صاحب(۱) کو تحفہ بھیجتے ہیں، خلیفہ صاحب بھی ہمیں تحفہ بھیجیں۔ مثلاً گھوڑا مرحمت فرمائیں۔ مولوی صاحب نے فی الفور جواب دیا کہ گھوڑا تو کیا، ہم گدھا بھی نہیں دے سکتے۔ فقیر عزیز الدین بھی اس موقع پر موجود تھے، انہوں نے بھی کہا کہ جرنیل صاحب کی تجویز مان لینے میں مضائقہ نہیں۔

مولوی صاحب نے جواب دیا:

> ”جو شخص ملک و جاگیر کا طلب گار ہو، اس کیلئے یہ چیز اچھی ہوگی، جس کی نیت اعلاءِ کلمۃ اللہ ہے، اس کیلئے یہ بہت بری ہے۔ دوسری نیکیوں کی طرح جہاد بھی فسادِ نیت سے باعث وبال بن جاتا ہے۔ اس نیت میں ہم اور حضرت یکساں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہم نے انہیں امام بنایا ہے اور امام کے بغیر جہاد ہو نہیں سکتا، لیکن جو شئے ثواب جہاد میں افساد کا باعث ہے، اس کے انکار

---

(۱) جماعت مجاہدین میں سید صاحب ”امیر المومنین“ کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ سکھ انہیں ”خلیفہ“ کہہ کر پکارتے تھے اور سرحدی باشندے عموماً ”سید بادشاہ“ کہتے تھے۔

میں ہم اور حضرت برابر ہیں۔"

مولوی صاحب کی واپسی پر سید صاحب نے جب یہ سنا کہ ہم گھوڑا کیا گدھا بھی نہ دیں گے تو خوش ہو کر فرمایا: اسی غرض سے میں نے آپ کو بھیجا تھا۔ دوسرے شخص سے ایسی صاف گوئی ممکن نہ تھی۔

چھتر بائی اور لوند خوڑ

فتح امب کے بعد مولوی صاحب کو چھتر بائی کی حکومت دے دی گئی تھی اور وہ غازیوں کی ایک جماعت کے ساتھ گڑھی میں رہتے تھے۔ سفارت کے سلسلے میں وہ پنجتار پہنچے۔ فتح پشاور کے بعد سید صاحب انہیں قاضی القضاۃ بنانا چاہتے تھے۔ مولوی صاحب نے معذرت کر دی۔ سید صاحب نے اصرار فرمایا تو عرض کیا: مجھے گنہگار نہ بنائیں۔ میں یہ خدمت قبول نہ کروں گا۔ عدالتی اور مالی کاموں میں اکثر لوگوں کے پاؤں پھسل جاتے ہیں۔ سید صاحب نے انہیں لوند خوڑ، کاٹلنگ اور ڈاگئی کے انتظامات سونپ دیے۔ وہ قندھاری اور ہندوستانی غازیوں کی ایک جماعت کے ساتھ لوند خوڑ میں مقیم ہوئے۔

دانش و تدبر

سلطان محمد خاں اور بعض دوسرے خوانین کی سازش سے بکھرے ہوئے مجاہدین پر بے خبری میں حملے ہوئے اور وہ جابجا شہید کر دیے گئے تو مولوی خیر الدین کو بھی اپنے ہاں دفاعی انتظامات کرنے پڑے۔ انہوں نے لوند خوڑ کے تمام خوانین کو اکٹھا کیا اور کہا کہ میں حضرت کے حکم سے جا رہا ہوں۔ اپنے میں سے ایک شخص کو میرے ساتھ بھیج دیجیے۔ بڑے اطمینان سے روانہ ہوئے۔ ابتدا میں رخ پنجتار کی طرف تھا۔ پھر اس لیے پڑان غار پہنچ گئے کہ پورے میدانی علاقے میں سے صحیح سلامت گزر کر پنجتار پہنچنا ممکن نہ تھا اور خان پڑان غار کے اخلاص پر اعتماد تھا۔ کچھ مدت وہاں گزاری۔ پھر سید صاحب کے حکم سے راستے کے

بعض خوانین نے مہمان داری اور حفاظت کا ذمہ اٹھایا۔ یوں مولوی صاحب اپنے غازیوں کے ساتھ پنجتار پہنچے۔ مخالفت کی آگ اس طرح یکا یک جا بجا بھڑک اٹھی تھی کہ کسی غازی کا زندہ رہنا ایک غیر معمولی واقعہ سمجھا جاتا تھا۔ مولوی صاحب لمبی مدت تک مرکز مجاہدین سے منقطع رہنے کے باوجود سلامت رہے، اس لئے جب وہ پنجتار آئے تو انہیں اور ان کی جماعت کے لوگوں کو "زندہ شہید" کا لقب ملا۔

ہجرتِ ثانیہ سے اختلاف

سید صاحب نے سلطان محمد خاں اور خوانین کی خوفناک سازش کے درد انگیز نتائج دیکھ کر پنجتار کو چھوڑ جانے کا فیصلہ کر لیا تو مختلف اصحاب نے اختلاف کیا تھا۔ ان میں ایک مولوی خیر الدین شیرکوٹی بھی تھے۔ مولوی صاحب نے عرض کیا کہ موجودہ مرکز چھوڑنا قرین مصلحت نہیں۔ کسی دوسرے علاقے میں جائیں گے تو پہلے یہی امر مشتبہ ہے کہ وہاں کے لوگ ہمارے قیام پر راضی ہوں گے۔ پھر انہیں وعظ و نصیحت سے قیامِ جہاد پر آمادہ کرنے میں عمر بسر ہو جائے گی۔ سید صاحب نے ترکِ پنجتار کے اسباب میں گردو پیش کی مخالفت کے علاوہ یہ بھی فرمایا کہ فتح خاں پنجتاری کے متعلق بھی تو اطمینان نہیں، جس کی زمین میں ہم بیٹھے ہیں۔ مولوی صاحب نے عرض کیا، فتح خاں یا اس کے پنجتار کے ہم محتاج نہیں۔ مجھے سدّم کا علاقہ مرحمت فرمائیں تو میں اس سے لشکر کا سروسامان کر لوں گا اور میدانی علاقے کے تمام مخالفوں کو راہِ راست پر لے آؤں گا۔ سید صاحب نے بعض قوی تر دلائل کی بناء پر یہ رائے قبول نہ فرمائی۔

تنخواہ دار سپاہ کی تجویز

بعض دوسرے اصحاب کی طرح مولوی خیر الدین کی بھی رائے تھی کہ رضا کارانہ جہاد پر انحصار کے بجائے سپاہی ملازم رکھے جائیں، کیوں کہ اس طرح بظاہر جہاد کے کامیاب

ہونے کی امید نہیں۔ سید صاحب بوجوہ اس کے بھی خلاف تھے، کیوں کہ تنخواہ دار سپاہ کے لیے وسیع مصارف درکار تھے، جو بڑے علاقے پر قبضہ جمائے بغیر مہیا نہ ہو سکتے تھے۔ اوائل حال میں سید صاحب یہ طریقہ اختیار نہ کر سکتے تھے۔ نیز ان کی خواہش تھی کہ مسلمانوں میں دنیوی فوائد سے قطع نظر کرتے ہوئے جہاد کا جذبہ عام ہو جائے اور وہ رضا کارانہ تمام واجبات ادا کریں، جو شریعت کی طرف سے ان پر عائد ہیں۔

بھوگڑ منگ اور بالاکوٹ

سید صاحب پنجتار سے راج دواری پہنچے تو دوسرے امور کے علاوہ درہ بھوگڑ منگ کی حفاظت ضروری تھی، جہاں سے سکھ اندر آ کر مختلف وادیوں پر ترکتازیں کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے چار سو غازیوں کی ایک جماعت شاہ اسمٰعیل کی سرکردگی میں درے کی حفاظت کیلئے مامور کر دی۔ مولوی خیر الدین کو شاہ صاحب کا نائب بنایا۔ شاہ صاحب خود پچاس غازیوں کے ساتھ بچوں میں ٹھہر گئے جو درے سے چند میل شمال میں ہے۔ مولوی خیر الدین کو ساڑھے تین سو غازیوں کے ساتھ بھوگڑ منگ بھیج دیا۔ مولوی صاحب نے حفاظت کا انتظام اس اعلیٰ پیمانے پر پہنچا دیا کہ سکھوں کو شنکیاری کی گڑھی سے جو درے کے باہر قریب ہی واقع ہے، نکلنے کا حوصلہ نہ رہا۔ درے کے اندر کی تمام بستیاں مطمئن ہو گئیں۔

سکھوں پر ہیبت

ایک روز قندھاریوں کی ایک مختصر سی جماعت درے سے باہر میدان میں نکل گئی۔ اتفاقیہ ان کی مڈبھیڑ سکھوں سے ہو گئی۔ سکھ اگرچہ غازیوں سے دوچند تھے لیکن رو در رو مقابلے کا حوصلہ نہ ہوا اور وہ آس پاس کے ٹیلوں پر چڑھ گئے۔ قندھاریوں نے احتیاطاً مولوی صاحب کو خبر بھی دی۔ عصر کا وقت تھا، مولوی صاحب فوراً تین چالیس

غازیوں کے ساتھ درے پر پہنچ گئے۔ اس اثناء میں سکھ چھپ چھپا کر گڑھی کے اندر چلے گئے۔ خوب اندھیرا ہو گیا تو مولوی صاحب واپس ہوئے۔

مظفر آباد

جب کشمیر کی طرف بڑھنے کا فیصلہ ہوا تو سید صاحب نے مختلف خوانین کی درخواست پر مولانا شاہ اسمٰعیل کو حکم دیا کہ آپ بالاکوٹ چلے جائیں۔ مولوی خیر الدین نے ۲۷ رشعبان ۱۲۴۶ھ (۱۰ رفروری ۱۸۳۱ء) کو ظہر کے وقت بھوگڑ منگ سے کوچ کیا اور پہاڑی راستے سے بالاکوٹ پہنچ گئے۔ دو روز بعد مولانا وارد ہوئے تو خوانین نے اصرار کیا کہ مظفر آباد لشکر بھیجا جائے۔ مولانا نے مولوی خیر الدین کو بھیجنا چاہا۔ انہوں نے معذرت کر دی اور عرض کیا کہ ان خوانین کا کچھ اعتبار نہیں، خدا جانے کہاں مصیبت میں الجھا کر الگ ہو جائیں، البتہ مظفر آباد کا خان زبردست خاں مجھے پانچ ہزار روپے نقد دے تو اپنے جیش کا ساز و سامان درست کر کے یہ خدمت انجام دوں گا۔ مولانا نے تین سو غازیوں کا لشکر تین آدمیوں کی مشترکہ سالاری میں بھیج دیا۔ سید صاحب کو یہ حالات معلوم ہوئے تو مولوی خیر الدین کو لکھا کہ آپ کا عذر معقول تھا، لیکن اب ضرور جانا چاہیے، اس لئے کہ جو لوگ گئے ہیں مبادا اُن کی ناواقفی کے باعث نقصان پہنچے اور کاروبار جہاد میں خلل پڑے۔ چنانچہ مولوی خیر الدین بھی دس آدمی لے کر مظفر آباد پہنچ گئے۔

عزمِ بالاکوٹ

مظفر آباد پہنچ کر مولوی صاحب نے زبردست خاں سے ضروری ساز و سامان کا مطالبہ کیا۔ اس اثناء میں غازیوں نے چھاؤنی پر قبضہ کر لیا اور صرف گڑھی سکھوں کے قبضے میں رہ گئی۔ زبردست خاں نے خفیہ سکھوں سے جوڑ توڑ شروع کر دیے اور کام کا بہترین وقت تذبذب میں ضائع کر دیا۔ اس اثناء میں مظفر آباد کی گڑھی کی سکھ فوج کیلئے بہت بڑی

کمک کی آمد کا حال معلوم ہوا۔ زبردست خاں یہ سنتے ہی ضروری سامان لے کر بھاگنے کیلئے تیار ہو گیا۔ مولوی صاحب کو بھی لوٹنا پڑا۔ وہ پہاڑوں کے بیچ میں سے روانہ ہوئے۔ راستہ بہت دشوار گزار تھا، اسی حالت میں مولوی صاحب کو سخت بخار آ گیا۔ ساتھ ہی خبر ملی کہ بالاکوٹ میں سید صاحب اور سکھ فوج کے درمیان جنگ ہونے والی ہے۔ ہر غازی چاہتا تھا کہ جلد سے جلد بالاکوٹ پہنچ جائے۔ مولوی صاحب چل نہ سکتے تھے۔ انہیں چارپائی پر لٹا کر چار آدمیوں نے اٹھا لیا۔ لڑائی کی صبح کو وہ اس جگہ دریا کے مشرقی کنارے پر نمودار ہوئے، جہاں بالاکوٹ جانے آنے کیلئے پل بنا ہوا تھا۔ یہ پل ایک رات پہلے سید صاحب کے حکم سے توڑ دیا گیا تھا۔ غازی درہ کاغان کی طرف چلے کہ کسی گھاٹ سے دریا عبور کریں۔ جب وہ ان پہاڑوں پر پہنچے جو قصبہ بالاکوٹ کے شمال میں ہیں تو معلوم ہوا کہ جنگ ختم ہو گئی، بہت سے غازی شہادت پا گئے، جو باقی بچے وہ واپس جا رہے تھے۔

بھٹکول میں قیام

مولوی صاحب باقی غازیوں کے ہمراہ ستھیاڑ پہنچے، جہاں سید صاحب کی اہلیہ اور بعض دوسری خواتین تھیں، بھٹکول کے اخوند محمد ارم قسم کھا کر کہہ رہے تھے کہ میں نے سید صاحب کو زندہ دیکھا ہے۔ جس زمانے میں شیخ ولی محمد ایک جماعت کے ساتھ خونہ (سوات) چلے گئے تھے تاکہ سید صاحب کی اہلیہ کو سندھ بھیجنے کی کوئی تدبیر کریں، مولوی خیرالدین اور بعض دوسرے مجاہدین ستھیاڑ ہی میں رہے۔ پھر شیخ ولی محمد کو فتح خاں پنجتاری بہ اصرار اپنے ہاں لے گیا۔ کچھ مدت بعد شیخ موصوف نے مولوی خیرالدین اور دوسرے اصحاب کو بھی بلا لیا۔ مولوی صاحب ستھیاڑ سے روانہ ہو گئے لیکن بھٹکول پر پہنچ کر اخوند محمد ارم کے پاس ٹھہر گئے اور پنجتار جانے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتے تھے کہ جہاں سے امیرالمومنین نے ہجرت کی میں وہاں نہ جاؤں گا۔ دوسرے اخوند محمد ارم کے بیانات

سے انہیں یقین ہو گیا تھا کہ سید صاحب زندہ ہیں۔ تین تو مسلم ان کے ساتھ تھے: عبداللہ، عبدالکریم اور عبدالرحیم۔ بعد کے حالات معلوم نہ ہو سکے، نہ مولوی صاحب کا ذکر کسی سلسلے میں آیا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وطن واپس آ گئے تھے۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ مولوی صاحب کا علم و فضل، جنگ و تدبیر اور سیاست و ملک داری میں بہت بلند پایہ تھا۔ علم دین میں بھی ان کا رتبہ بہت اونچا تھا۔ راویوں نے لکھا ہے کہ بہت ہی متین، دوراندیش اور حلیم تھے۔

میں نے مولانا مظہرالدین شیرکوٹی مرحوم ایڈیٹر "الامان" کی زندگی میں مولوی خیرالدین کے خاندان کے حالات دریافت کرنے میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا، لیکن افسوس کہ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ مولانا مظہرالدین کی وفات کے بعد تفحص و دریافت کا کوئی ذریعہ ہی باقی نہ رہا۔

مظفر آباد سے واپسی کا راستہ

مظفر آباد سے واپسی کا راستہ سید غلام حسن شاہ کاظمی کی تحقیق کے مطابق یہ تھا: مظفر آباد سے گجو سیداں اور کنڈا ہوتے ہوئے تور سیری، وہاں سے دریائے کشن گنگا کو عبور کر کے گھنڈی پیراں، بچر سچا اور کھوڑی، کھوڑی سے سید پور، پھر نور گلی جہاں سے بالاکوٹ دس گیارہ میل تھا۔ گڑھی حبیب اللہ خاں کا راستہ سہل تھا، جو اس لئے اختیار نہ کیا کہ ادھر سکھوں کا لشکر موجود تھا۔

آٹھواں باب:

شیخ بلند بخت اور شیخ علی محمد

شیخ بلند بخت سردھنہ میں سید صاحب سے ملے تھے۔ جب آپ نے میرٹھ، مظفر نگر اور سہارنپور کا دورہ کیا تھا۔ یہ غالباً سردھنہ میں ملازم تھے۔ وہیں بیعت کی۔ بیعت کے بعد ہمہ تن تحریک جہاد کیلئے وقف ہو گئے اور مجاہدین کی جماعت میں شامل ہو کر سرحد پہنچے۔ اپنے اوصاف ومحاسن اور فنون سپہ گری میں مہارت کے باعث ابتدا ہی سے ممتاز اصحاب میں محسوب تھے۔ سید صاحب نے قیام خمر کے زمانے میں غازیوں سے قواعد اور چاند ماری کرانی شروع کی تھی تو مختلف جیشوں کو مختلف اصحاب کی تربیت میں دے دیا تھا۔ ان اصحاب میں سے ایک شیخ بلند بخت بھی تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہم کام بھی انہیں سونپے جاتے تھے، جس سے ان کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ جب اطلاع ملی کہ پائندہ خاں تنولی فرار کے اضطراب میں زنبورکیں چھوڑ گیا ہے اور انہیں لانے کیلئے ایک تجربہ کار آدمی کو بھیجنا ضروری ہو گیا تو یہ کام شیخ بلند بخت ہی کے حوالے ہوا۔ انہوں نے شیخ محمد اسحاق گورکھپوری کو اس مہم پر بھیجنا چاہا تو سید جعفر علی نقوی نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا۔ کوہ کنیر زی کی جنگ میں بھی شریک تھے۔ امب کے محصورین نے جب حوالگی کا فیصلہ کیا تو ان سے گفتگو کیلئے بھی شیخ موصوف ہی کو بھیجا گیا تھا۔

صبر واستقامت

فتح امب کے بعد چھتر بائی کا محاصرہ طول پکڑ گیا اور اس غرض کیلئے توپوں کی

ضرورت پیش آئی تو سید صاحب نے شیخ موصوف ہی کو پچیس تیس غازیوں کے ساتھ پنجتار بھیجا تھا کہ وہاں سے بہ حفاظت توپیں لے آئیں۔ غیر حاضری میں ان کے چھوٹے بھائی شیخ علی محمد شہید ہو گئے۔ شیخ بلند بخت کو سفر مراجعت میں بمقام ستھانہ یہ غم انگیز خبر ملی تو اس پیکر صبر نے فرمایا: الحمد للہ ہمارا بھائی جو مراد لے کر آیا تھا وہ پوری ہو گئی۔ ہم سب کو اللہ تعالیٰ شہادت نصیب کرے۔

قلعہ دار امب

ہزارہ کی جانب پیش قدمی کا معاملہ التوا میں پڑ گیا تو سید صاحب شاہ اسمٰعیل کو امب میں چھوڑ کر خود پنجتار چلے آئے تھے اور آس پاس کے میدانی علاقے کا دورہ شروع کر دیا تھا۔ گڑھی امان زئی میں معلوم ہوا کہ سردار پشاور اور احمد خاں کمال زئی بہت بڑی فوج لے کر جنگ کیلئے آ رہے ہیں، سید صاحب گڑھی امان زئی سے تورو تشریف لے گئے اور مولانا کو بھی امب سے بلا لیا۔ شاہ صاحب نے محاذ امب کے تمام انتظامات شیخ بلند بخت کے حوالے کر دیے۔ ہجرت ثانیہ تک شیخ کا پورا وقت امب ہی میں گذرا اور وہ جنگ مایار یا فتح پشاور میں شریک نہ ہوئے۔

شانِ عزیمت

سلطان محمد خاں اور بعض دوسرے خوانین کی سازش سے مجاہدین میدانی علاقے کے مختلف دیہات میں شہید کیے جا چکے تو سید صاحب نے پنجتار کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت تک شیخ بلند بخت غازیوں کی ایک جماعت کے ساتھ امب ہی میں مقیم تھے اور ان کے ماتحت حافظ مصطفیٰ کاندھلوی کو چھتر بائی میں متعین کر دیا گیا تھا۔ مجاہدین کی دردناک شہادت نے مفسدوں کے حوصلے بہت بڑھا دیے تھے، اس لئے کہ انہیں یقین تھا، مجاہدین کو امداد نہ مل سکے گی۔ چنانچہ ایک مرتبہ سردار پائندہ خاں نے شیخ بلند بخت

کو پیغام بھیجا کہ ہمارے تمام مقامات خالی کر دو، ورنہ جنگ کیلئے تیار ہو جاؤ۔ شیخ کے پاس اگر چہ بہت کم غازی تھے، لیکن بے توقف جواب دیا: ہم امیر المومنین کے حکم کے بغیر ایک انچ زمین بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ جنگ کرنا چاہتے ہو تو شوق سے کر دیکھو۔

جب شیخ کو اطلاع ملی کہ پائندہ خاں کھبل بائی کے گھاٹ سے اپنا لشکر دریا کے غربی کنارے پر پہنچا رہا ہے اور وہ ضرور امب پر حملہ کرے گا تو انہوں نے غازیوں کو حکم دیدیا کہ بستی کے جو مکانات منہدم ہیں، ان میں سے لکڑیاں نکال کر گڑھی میں لے آؤ تاکہ لکڑی کیلئے باہر جانے کی ضرورت نہ رہے۔ دو توپیں گڑھی کے اس طرف گاڑ دیں، جدھر سے حملے کا خطرہ تھا۔ ایک توپ مشرق میں اور دوسری مغرب میں نصب کرا دی۔ پائندہ خاں نے حملہ کیا، لیکن وہ مشرقی سمت کی خار بندی کے بیرونی حلقے میں ایک مرتبہ آگ لگانے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ بیس پچیس روز کی کش مکش کے بعد ناکام لوٹ گیا۔

نصب العین

ایک روز کرپلیاں کی جانب سے جو سکھوں کے زیر اقتدار تھا، آواز آئی کہ کسی معتبر آدمی کو دریا پر بھیجو، ایک ضروری پیغام پہنچانا ہے۔ شیخ بلند بخت نے الٰہی بخش رام پوری، حسن خاں ساکن زمانیہ اور ایک اور آدمی کو بھیجا۔ معلوم ہوا کہ سکھ سردار کی طرف سے ایک خط آیا ہے۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ غازی بہت بہادر، امانت دار اور نمک حلال ہیں۔ انہوں نے شجاعت کا حق ادا کر دیا۔ گڑھی میں پائندہ خاں کا جو سامان ہے، وہ اسے دے دیا جائے اور غازی ہمارے پاس چلے آئیں۔ ہم انہیں عزت کی ملازمتیں دیں گے۔ شیخ نے جواب میں کہلا بھیجا:

> "اپنے سردار سے کہہ دو کہ ہم امیر المومنین کے تابع فرمان ہیں۔ حضرت کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ اپنے وطنوں سے اس لئے آئے ہیں کہ کافروں سے جنگ کریں، نہ ملک چاہتے ہیں نہ مال۔ ہمیں نوکری سے کیا

> غرض۔ ہماری موت اور زندگی امیر المومنین کے ساتھ ہے۔ قادر ذوالجلال کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ پائندہ خاں اور اس کے لشکر کی کیا حقیقت ہے؟ اگر رنجیت سنگھ بھی اپنا لشکر لے کر آئے تو نہ ڈریں گے، ڈر خوف مرگ سے پیدا ہوتا ہے، ہم اپنی جانیں خدا کے راستے میں قربان کر چکے ہیں۔ پس ہمیں کیا ڈر ہے؟ ہماری طرف سے کہہ دینا کہ پھر ہمیں ایسا پیغام نہ بھیجا جائے۔"

سید صاحب نے ہجرت ثانیہ کا فیصلہ کر لیا تو سید اکبر شاہ ستھانوی کو لکھا کہ ہمارے غازیوں کو امب اور چھتر بائی سے نکال کر ہمارے پاس پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ سید اکبر شاہ نے دونوں گڑھیاں خالی کرائیں اور پورا مال و اسباب نکال کر ستھانہ لے گئے۔ جب سے پائندہ خاں نے حملہ کیا تھا۔ غازیوں میں سے صرف ایک آدمی شہید ہوا اور تین آدمیوں کے خفیف زخم لگے۔ اس اثنا میں پائندہ خاں کے ساٹھ آدمی مقتول اور پینتالیس مجروح ہوئے۔

شہادت

شیخ بلند بخت نے عشرہ میں ٹھہر کر اپنے تمام غازیوں کو اکٹھا کیا، پھر برڈھیری (وادیٔ کہملہ) میں سید صاحب سے جا ملے۔ بعد کے حالات تفصیلاً معلوم نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ بالاکوٹ میں شہادت پائی۔ سید جعفر علی نقوی نے شہادت کی کیفیت یہ بتائی ہے کہ میدانِ جنگ میں پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھ سے تقریباً آٹھ قدم کے فاصلے پر ابراہیم خاں تھے۔ میں ان کی طرف جانے لگا تو دائیں جانب سے شیخ بلند بخت آتے ہوئے ملے مجھ سے پوچھا کہاں جاتے ہو؟ عرض کیا، ابراہیم خاں کے پاس۔ وہ چپ چاپ بائیں طرف چلے گئے اور وہیں گولی کھا کر جامِ شہادت نوش کیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب میدانِ جنگ میں سید صاحب کی گمشدگی کا آوازہ بلند ہوا اور فدائی ان کی تلاش میں سراسیمہ وار پھرنے لگے تو شیخ بلند بخت اپنی حفاظت سے بالکل بے پروا ہو کر تلاش میں نکل پڑے۔ اسی حالت میں گولی لگی۔

شیخ علی محمد

یہ شیخ بلند بخت کے حقیقی بھائی تھے۔ غالباً مجاہدین کے پہلے قافلے میں شریک نہ تھے، اس لئے کہ ابتدائی فہرست میں ان کا نام نظر نہیں آتا، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اپنے بھائی کی طرح بہت محتاط، دور اندیش اور ہمت ور تھے۔ چنانچہ سید صاحب نے جب سرداران پشاور کے آخری فیصلے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ اور اس سلسلے میں خمر سے اوتمان زئی پر حملے کا منصوبہ تیار ہوگیا تو ایک جماعت درۂ خیبر کی سمت بھیجی گئی تھی تاکہ وہاں کے لوگوں کو اٹھا کر پشاور پر اقدام کیلئے آمادہ کر دیا جائے۔ اس جماعت میں سید احمد علی، مولوی مظہر علی عظیم آبادی، شیخ ولی محمد پھلتی وغیرہ اکابر کے علاوہ شیخ علی محمد بھی شریک تھے۔

عام خدمات

معلوم ہوتا ہے کہ شیخ موصوف پشتو بے تکلف بولتے تھے۔ چنانچہ جب غازی زیدہ میں رات کے وقت یار محمد خاں درانی کے لشکر پر حملے کیلئے نکلے تھے اور راستے میں انھیں یار محمد خاں کے سوار مل گئے تھے تو ان کے تمام سوالات کا جواب پشتو میں شیخ علی محمد ہی نے دیا تھا۔ شیخ موصوف ان منتخب سواروں میں بھی شریک تھے، جنھیں مولانا شاہ اسمٰعیل نے سید صاحب اور پاینده خاں کی ملاقات کے وقت مقامِ ملاقات سے قریب ایک خفیہ جگہ کھڑا کر دیا تھا۔

شہادت

فتح امب کے بعد پاینده خاں کا ایک لشکر چھتر بائی کی گڑھی میں محصور ہو گیا تھا جو امب سے تقریباً چھ میل شمال میں دریا کے کنارے واقع تھی۔ غازیوں نے گڑھی کا محاصرہ کر لیا تھا، لیکن توپوں کے بغیر اس کی تسخیر مشکل نظر آتی تھی۔ مولانا شاہ اسمٰعیل محاصر فوج

کے سالار تھے۔ انھوں نے گڑھی کی دیواروں پر چڑھنے کیلئے سیڑھیاں بنوائی تھیں اور دریا کی سمت چھوڑ کر گڑھی کے اردگرد اپنے مختلف جیش مورچوں میں بٹھا دیے تھے۔ توپیں لانے کیلئے آدمی پنجتار چلے گئے تھے۔ ان کے انتظار میں حملہ ملتوی ہو چکا تھا۔ اس اثناء میں حافظ عبداللطیف کو خدا جانے کیا سوجھی کہ مولانا کو اطلاع دیے بغیر بطور خود مورچوں میں پھر پھر کر غازیوں سے کہہ دیا، عصر کے بعد گڑھی پر حملہ ہوگا۔ انھیں غالباً خیال تھا کہ ایک مجاہدانہ اقدام سے گڑھی فتح ہو سکتی ہے اور توپوں کے انتظار میں معطل بیٹھ رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

غازیوں نے سمجھا کہ پیغام خود مولانا شاہ اسمٰعیل نے دیا ہوگا۔ چنانچہ وہ عصر کی نماز سے فارغ ہوتے ہی اچانک گڑھی پر حملہ آور ہوئے۔ حافظ عبداللطیف خود تکبیر کہتے ہوئے سب سے آگے تھے۔ حملہ آور کانٹوں اور خار بندیوں سے گزرتے ہوئے گڑھی کی دیواروں کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت سیڑھیوں کی ضرورت پڑی جو مولانا کے خیمے میں تھیں۔ سیڑھیاں مانگی گئیں تو مولانا حیران کہ حملہ کس کے حکم سے ہوا۔ موقع بحث کا نہ تھا۔ مولانا نے سیڑھیاں دے دیں انھیں دیواروں سے لگایا گیا تو چھوٹی نکلیں اور غازی اوپر نہ پہنچ سکے۔ تاریکی پھیلی تو سب کو مورچوں میں واپس ہونا پڑا۔ اس یورش میں جو چند غازی شہید ہوئے، ان میں سے ایک شیخ علی محمد تھے۔

للّٰہیت

شیخ بلند بخت اس وقت توپیں لانے پنجتار گئے ہوئے تھے۔ واپسی میں ستھانہ پہنچ کر بھائی کی شہادت کی خبر ملی۔ اب پہنچے تو سید صاحب نے حسب معمول محبت سے پاس بٹھایا۔ کچھ دیر خاموش رہے، پھر شہید کی تعزیت کرتے ہوئے تسلی دی:

آپ کے بھائی جو مراد لے کر اللہ کے راستے میں نکلے تھے، وہ پوری

ہوئی۔ ہم سب کو اللہ اپنی رضامندی کی راہ میں صرف کردے اور ہم سب سے
راضی ہو۔ ہم سب بھائیوں کی یہی مراد ہے۔

بھائی کسے عزیز نہیں ہوتا، پھر ایسا بھائی جو دنیا میں خیر وسعادت کا قابل فخر پیکر تھا، وطن سے دوری عزیزوں سے علیحدگی اور اقربا سے مفارقت کی حالت میں موت آئی۔ ہم لوگوں نے زندگی کے جو تصورات قائم کر رکھے ہیں، شیخ بلند بخت ان سے فارغ نہ تھے۔ انھیں بھی ہر رشتہ ویسا ہی عزیز تھا، جیسا ہمیں عزیز ہے، لیکن ایک بلند تر جذبے اور رفیع تر نصب العین نے ان کی تمام محبتوں اور علاقہ مندیوں کو دوسرے ہی سانچے میں ڈھال دیا تھا۔

نواں باب:

مولوی مظہر علی عظیم آبادی

یہ غالباً اسی زمانے میں سید صاحب سے بیعت کر چکے تھے جب آپ کی دعوتِ اصلاح کا شہرہ ہوا تھا۔ سفرِ حج کے سلسلے میں سید صاحب عظیم آباد پہنچے تو اس حیثیت میں مولوی مظہر علی کے مکان پر گئے، گویا ان سے دیرینہ مراسم تھے۔ نیز اس موقع پر روایات میں مولوی صاحب کے اہل وعیال اور اہل محلہ کی بیعت کا ذکر ہے۔ خود مولوی صاحب کی بیعت کا ذکر نہیں۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ مولوی صاحب سفرِ حج سے پیشتر بیعت کر چکے تھے۔ موصوف نسباً سید تھے اور لودھی کڑہ میں رہتے تھے۔

دعوت وارشاد

اونچے درجے کے عالم ہونے کے علاوہ مولوی صاحب بڑے غیور شخص تھے۔ بیعت کے ساتھ ہی دعوتِ اصلاح شروع کر دی۔ بعض اوقات جوش کے عالم میں منکر چیزوں کو بزور مٹا دینے پر بھی آمادہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر تعزیے کو نقصان پہنچایا، اس بناء پر مولوی صاحب کے خلاف مقدمہ قائم ہو گیا۔ ایک شخص نے ضمانت دیکر انہیں گرفتاری سے بچایا۔ مولوی صاحب ضمانت پر رہا ہوتے ہی وطن چھوڑ کر گورکھپور جا پہنچے۔ وہاں بھی دعوتِ اصلاح جاری رکھی۔ چنانچہ مولوی جعفر علی نقوی نے اپنے والد ماجد سید قطب کے حوالے سے لکھا ہے کہ مولوی مظہر علی کے وعظ وارشاد سے اکثر لوگوں نے ہدایت پائی۔ ایک مسلمان زمیندار نے دو سگی بہنوں سے بیک وقت نکاح کر رکھا تھا،

سید قطب علی نے بار بار اسے منع کیا، شرعی مسئلہ بتایا، لیکن وہ جواب دیتا کہ ہماری برادری میں یہ دستور پہلے سے چلا آرہا ہے، ہم کیوں چھوڑیں؟ سید قطب علی نے مجبور ہوکر اس سے سلام کلام بند کردیا۔ مولوی مظہر علی ان اطراف میں پہنچے اور انہوں نے تلقین کی تو اس نے معاً ایک بیوی کو طلاق دے دی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کے بیان میں خدا نے خاص تاثیر ودیعت کردی تھی۔

تعلیم عزیمت

اسی زمانے میں سید صاحب سے ملنے کیلئے رائے بریلی پہنچے کہ آپ نے فرار کے حالات سنے تو بہت ناراض ہوئے۔ پھر مولوی صاحب سے مخاطب ہوکر فرمایا: آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا، حالاں کہ آپ نے سخت غلطی کی۔ خود بچ کر نکل آئے اور ایک نیک دل مسلمان (ضامن) کو پھنسا دیا۔ آپ میں نتائج کی برداشت کا حوصلہ نہ تھا تو اصلاح شروع کیوں کی تھی؟ آپ کی تو بیعت بھی قائم نہیں رہی۔ نئے سرے سے بیعت کیجئے، وطن جایئے اور جو کچھ پیش آئے اسے صبر سے برداشت کیجئے۔

مولوی صاحب نے بے چون وچرا اس حکم کی تعمیل کی، لیکن خدا کی رحمت دیکھئے کہ ان کے جاتے ہی مقدمہ ختم ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب اپنے تمام خلفاء اور داعیوں سے شانِ عزیمت کے متقاضی تھے۔ اس کے بغیر اصلاح کا کام پورا نہ ہوسکتا تھا۔ مولوی مظہر علی پر ناراض ہونے کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ مقامِ عزیمت میں ثابت قدم نہ رہے اور مقدمہ قائم ہوتے ہی بچ کر نکل گئے۔

قافلہ مجاہدین

سید صاحب کی طرف سے بلاوے کے خطوط پہنچے تو مولوی صاحب مجاہدوں کا

قافلہ لے کر سرحد گئے تھے یا کم سے کم وہ بالکل ابتدائی قافلوں میں مقامِ جہاد پر پہنچ گئے تھے، اس لئے کہ جنگِ شیدو کے بعد جو غازی چنگلئی پہنچے تھے، ان میں مولوی صاحب کا نام موجود ہے۔

جنگِ مردان

اغلب ہے، مختلف لڑائیوں میں شریک رہے ہوں، جنگِ مردان میں ان کا ذکر بالتصریح آیا ہے۔ اس جنگ میں سید محمد حبان قاضی القضاۃ سپہ سالار تھے۔ انہوں نے شہر پہنچ کر حملے کیلئے غازیوں کی فوج کو مختلف جیشوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ مولوی مظہر علی کو ہدایت فرمائی تھی کہ اپنا جیش لے کر کھلیانوں کی طرف جائیں۔ اُدھر سے بندوقوں کی آواز آئے تو نقارہ بجاتے ہوئے شہر پر حملہ کر دیں۔ مولوی صاحب نے حرفاً حرفاً اس ہدایت پر عمل کیا۔ کھلیانوں والے بندوقچی بھاگے اور مولوی صاحب اپنا جیش لیکر آگے بڑھے۔ ان کی ران کے بالائی حصے میں گولی لگی اور وہ زمین پر گر پڑے، لیکن عزیمت، ہمت اور عشقِ مقصد کی شان ملاحظہ ہو کہ گولی لگنے کا معاملہ کسی پر ظاہر نہ کیا تاکہ کوئی ساتھی ان کی دیکھ بھال میں یورش سے باز نہ رہے، گرتے ہی زمین پر بیٹھ گئے، جو غازی پاس سے گذرتا اور حال پوچھتا تو بلند آواز سے فرماتے: تم چلو، میں ابھی آتا ہوں۔ ہر شخص یہی سمجھتا کہ پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہوگا، جسے نکالنے کیلئے دم بھر کیلئے بیٹھ گئے ہوں گے۔ شاہ اسمٰعیل ان کے پاس پہنچے تو حقیقتِ حال بتائی۔ ساتھ ہی کہا، آپ میرا خیال نہ فرمائیں۔ پہلے گڑھی کا فیصلہ کر لیجئے۔ فتح کے بعد دیکھ لیجیے گا، میں کس حال میں ہوں۔

پشاور میں منصبِ قضا

پشاور فتح ہوا اور سید صاحب اپنے غازیوں کے ساتھ وہاں پہنچے تو مولوی مظہر علی صاحب نے مہابت خاں کی مسجد میں خطبے دینے شروع کیے، جس میں سورہ صف کی تفسیر

نہایت دل پسند الفاظ میں پیش کی۔ اس وجہ سے وہ اہل پشاور میں بہت ہر دل عزیز ہو گئے۔ چنانچہ سلطان محمد خاں درانی سے معاہدۂ صلح کے بعد پشاور ان کے حوالے کیا اور وہاں قاضی کے تقرر کا سوال سامنے آیا تو مولوی مظہر علی ہی اس عہدے کیلئے منتخب ہوئے۔ علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر تھی کہ اہل پشاور انھیں بہت پسند کرتے ہیں۔ سید صاحب پشاور سے پنجتار کی طرف روانہ ہوئے تو مولوی مظہر علی چمکنی تک ساتھ گئے، وہاں سے پشاور لوٹے۔ پھر عالم ناسوت میں ملاقات مقدر نہ تھی۔

درّانیوں کی بدعہدی

سلطان محمد خاں نے پشاور پر دوبارہ قابض ہوتے ہی سازش کا جال بچھانا شروع کر دیا تھا۔ جب اس نے اندازہ کر لیا کہ میدانی علاقے کے اکابر اس کے ہم نوا بن گئے ہیں تو مولوی مظہر علی سے کھلم کھلا نزاع پر آمادہ ہو گیا۔ ایک روز مولوی صاحب اس کے پاس پہنچے تو فوراً سوال کیا کہ میرے بھائی یار محمد خاں کو کیوں قتل کیا گیا؟ ساتھیوں نے ایک ہنگامہ سا برپا کر دیا۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ شور مچانے سے کچھ فائدہ نہیں، باری باری ایک ایک سوال کرو اور جواب سنتے جاؤ۔ پھر تمام تفصیلات کھول کر بیان کیں اور ثابت کر دیا کہ خادے خاں اور یار محمد خاں سے جو سلوک ہوا، وہ شرعاً بالکل جائز تھا۔ مولوی صاحب نے یہ حالات سید صاحب کو لکھ بھیجے۔ آپ کے حکم سے شاہ اسمٰعیل نے ایک مفصل خط لکھا، جس میں سلطان محمد خاں کے تمام اعتراضات کا جواب درج تھا۔ یہ خط مولوی مظہر علی کے پاس بھیج کر تاکید کر دی کہ کوئی شخص اطمینانِ قلب کیلئے سوال کرے تو نرمی سے جواب دیدیں۔ بحث کی نوبت آئے تو یہ تحریر حوالے کر کے آپ چلے آئیں۔

شانِ احتیاط

سید صاحب سے سلطان محمد خاں کی صلح ارباب فیض اللہ خاں نے کرائی تھی

۱۰، عہد کیا تھا کہ اگر سلطان محمد خاں نے دوبارہ خیانت کی تو میں اس کا ساتھ چھوڑ دوں گا۔ پشاور کے حالات بگڑتے دیکھے تو ارباب نے مولوی مظہر علی کو اطلاع دے دی تھی کہ مجھے سلطان محمد خاں پر اطمینان نہیں رہا، آپ امیر المومنین سے واپسی کی اجازت لے لیں۔ مولوی صاحب بڑے محتاط اور حد درجہ فرض شناس بزرگ تھے۔ انھوں نے مناسب نہ سمجھا کہ تمام حالات کا اندازہ کیے بغیر کوئی بات لکھیں اور عجلت میں غیر محقق امور سید صاحب تک پہنچانے کے مرتکب ہوں۔

شہادت

انھیں حالات میں سلطان محمد خاں اور اس کے درباریوں نے مولوی مظہر علی کو پشاور میں شہید کر دیا۔ شہادت کی تفصیل صرف اس قدر معلوم ہو سکی کہ ایک روز سلطان محمد خاں نے ضروری مشورے کے بہانے سے مولوی صاحب کو ایک خاص کمرے میں بلوایا۔ وہ پہنچے تو ہر طرف سے ان پر تلواریں پڑنے لگیں۔ اسی حالت میں وہ واصل بحق ہوئے۔ راویوں کا بیان ہے کہ مولوی صاحب بہت بڑے عالم، متقی، ذکی الطبع، صاحب اخلاق پسندیدہ و اوصاف حمیدہ، سید صاحب کے مخلص معتقد اور محب راسخ تھے۔ موصوف سپہ گری میں یکتائے زمانہ اور شجاعت و بہادری میں یگانہ مانے جاتے تھے۔

دسواں باب:

شیخ محمد اسحٰق گورکھپوری

نسبتِ مقام سے ظاہر ہے کہ یہ گورکھپور کے باشندے تھے۔ معمولی تعلیم پائی تھی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے کسبِ فیض کے شوق میں اپنے وطن مالوف سے پیدل دہلی پہنچے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جب سید صاحب ایک بڑے قافلے کے ساتھ حج کیلئے گئے ہوئے تھے۔ شیخ اسحٰق نے شاہ صاحب سے بیعت کی درخواست کی تو جواب میں ارشاد ہوا کہ میں گوناگوں عوارض میں مبتلا ہوں، میرا نواسہ درس وتدریس میں مشغول ہے، میرے خلیفہ سید احمد واپس آئیں گے تو ان سے بیعت کر لینا۔ شیخ اسحٰق نے عرض کیا کہ میں آپ سے بیعت کا آرزو مند ہوں، صرف دس روز دہلی میں ٹھہروں گا، پھر واپس چلا جاؤں گا، اس لئے کہ میرے چھوٹے بچے ہیں اور ان کے گزارے کی کوئی سبیل نہیں۔

بیعت

سید صاحب حج سے واپس آئے تو شاہ عبدالعزیز کا انتقال ہو چکا تھا۔ شیخ اسحاق بیعت کے شوق میں سید صاحب کے پاس رائے بریلی پہنچ گئے اور بیعت کر لی۔ چند روز کے بعد سید صاحب نے خانوادہ ہائے فیضِ روحانی کے معمول کے مطابق منصبِ خلافت دینا چاہا تو شیخ اسحاق نے یہ عذر پیش کیا کہ میں قرآن مجید اور چند ضروری مسائلِ دین کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ منصبِ خلافت اسے ملنا چاہیے جسے دین کا وسیع علم حاصل ہو۔ سید

صاحب نے بے تکلف فرمایا کہ میرا علم بھی اسی قدر ہے۔ شیخ اسحاق نے عرض کیا کہ ہمارے وطن میں ایک بزرگ عالم دین ہیں جو ہر وقت یادِ خدا میں مصروف رہتے ہیں۔ انہیں خلافت عطا فرمانا مناسب ہوگا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ میں آپ کو بھی خلیفہ بناتا ہوں اور اس بزرگ کو ساتھ لائیں گے تو انہیں بھی خلافت دے دوں گا۔ شیخ کا اشارہ سید قطب علی کی طرف تھا، جنہیں منصبِ خلافت ملنے کی کیفیت ان کے حالات میں درج ہے۔

ہجرت

سید صاحب مجاہدین کی پہلی جماعت کو لے کر جہاد کیلئے سرحد تشریف لے گئے تو شیخ اسحاق کا دل بھی اس کارِ خیر میں شرکت کے ولولوں سے بے تاب ہوگیا۔ چنانچہ وہ بال بچوں کو خدا کے حوالے کر کے گھر سے نکل پڑے۔ کچھ مدت عظیم آباد میں ٹھہرے رہے جو مجاہدین کا ایک بڑا مرکز تھا۔ پھر ایک قافلے میں شریک ہوکر دہلی پہنچے اور شاہ محمد اسحاق کے پاس مقیم رہے۔ اس زمانے میں سید محبوب علی اپنے قافلے کے ساتھ سرحد سے واپس آچکے تھے۔ اس وجہ سے عازمین جہاد پر اک گونہ افسردگی طاری ہوگئی تھی اور قافلوں کے جانے کا سلسلہ معرضِ تعطل میں پڑچکا تھا۔ شیخ محمد اسحاق اربابِ عزیمت میں سے تھے۔ عام افسردگی ان کے عزم وہمت پر قطعاً اثر انداز نہ ہوسکی۔ وہ صرف چار رفیقوں کو لے کر فقیرانہ لباس میں نکل پڑے اور سکھوں کی حکومت سے گذرتے ہوئے سید صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ چوں کہ یہ کل پانچ آدمی تھے، اس لئے جماعت مجاہدین میں ''پنج تن'' کے لقب سے مشہور ہوگئے۔

جنگِ مایار

شیخ صاحب تمام لڑائیوں میں شریک رہے۔ مایار کی جنگ میں انہوں نے مردانگی

اورعزیمت کا جو نقشہ پیش کیا، اس کی صحیح کیفیت الفاظ میں نہیں سما سکتی۔ سید صاحب کے حالات میں بیان ہو چکا ہے کہ سواروں کا جیش ایک اتفاقی غلطی کے باعث غنیم کی ترکتاز کا ہدف بن کر منتشر ہو گیا تھا۔ شیخ اسحاق جوشِ شجاعت میں گھوڑا لے کر سواروں میں شامل ہو گئے تھے۔ ایک درانی سوار نے نیزے سے ان پر حملہ کیا۔ وہ وار بچانے کیلئے دائیں جانب جھکے۔ نیزے کی انی سینے کے بجائے بائیں کندھے میں گھس گئی۔ پھر اور درانی سوار ان پر ٹوٹ پڑے۔ شیخ نے مقابلہ جاری رکھا لیکن بری طرح زخمی ہو گئے۔ دائیں ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئیں۔ تلوار کی ایک ضرب سر پر پڑی۔ بائیں کندھے پر نیزے کے زخم کے بعد تلوار کا بھی ایک شدید زخم لگا۔

زخموں سے چور ہو جانے کے باعث لڑنے کی سکت باقی نہ رہی تو شیخ نے اپنی رائفل ایک غازی کے حوالے کی، تلوار دوسرے غازی کو دے دی، جس کے پاس تبر کے سوا کوئی ہتھیار نہ تھا اور ان دونوں سے کہا کہ یہ خدا کا مال ہے، میں آپ کو امین سمجھ کر دیتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ ان کا حق ادا کرنے میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھیں گے۔ پھر آہستہ آہستہ میدانِ جنگ سے مایار کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں میاں جی محی الدین ملے، جن کا پاؤں سخت زخمی ہو چکا تھا اور وہ سہارے کے بغیر چلنے سے عاجز تھے۔ شیخ اسحاق کے ہاتھ اگرچہ بری طرح زخمی ہو چکے تھے، لیکن انہوں نے میاں جی محی الدین کو سہارا دے کر اٹھایا اور ساتھ لے کر آہستہ آہستہ چلے۔ تھوڑی دور جا کر دونوں کو غش آ گیا اور زمین پر گر پڑے۔ پھر ہوش آیا تو ایک درخت کے سائے میں جا کر لیٹ گئے۔

درانیوں کی شکست کے بعد مولوی سید جعفر علی نقوی مؤلف ''منظورۃ السعداء'' شیخ کے پاس پہنچے تو انہوں نے سب سے پہلے لڑائی کا حال پوچھا۔ فتح کی خبر سن کر جوشِ مسرت سے فرمایا کہ آؤ بھائی گلے سے لگ جاؤ، پھر کہا: یہ حدیث سچی ہے کہ شہیدوں کی سکراتِ موت کی کیفیت ویسی ہی ہوتی ہے، جیسے کسی کو چیونٹی کاٹے۔ (۱) میرا جسم زخموں

---

(۱) ما یجد الشہید من مس القتل الا کما یجد احدکم من مس الفرصۃ۔

سے چور ہو گیا، لیکن کانٹا چبھنے سے زیادہ تکلیف نہیں ہوئی۔

دیوانہ شاہ

علاج سے تمام زخم اچھے ہو گئے لیکن انگلیاں کٹ جانے کے باعث ان کا دایاں ہاتھ بندوق یا تلوار چلانے کے قابل نہ رہا تھا۔ تاہم انہوں نے مجاہدین کا ساتھ نہ چھوڑا۔ کچھ مدت تک فروسہ (تزد اسب) میں تھانیدار رہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دل پر بہت غالب تھی۔ ایک مرتبہ مولانا شاہ اسمٰعیل نے وعظ میں "وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ" کی تفسیر بڑے پرتاثیر انداز میں فرمائی۔ شیخ محمد اسحاق پر اس وعظ کا اتنا اثر ہوا کہ بے اختیار رونے لگے اور کھانا پینا ترک کر دیا۔ مولانا کو اس واقعے کا علم ہوا تو بلا کر وجہ پوچھی۔ شیخ نے کہا کہ مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے اور ہر وقت اس کا خیال رہتا ہے۔ یہ صورت "وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ" کے منافی ہے۔ مولانا نے پوچھا کہ کیا اس وقت بھی یہی کیفیت تھی جب آپ وطن میں تھے؟ جواب دیا کہ اس وقت تو یہ کیفیت نہ تھی، لیکن اب یہ خیال دل سے زائل ہی نہیں ہوتا۔ مولانا نے پھر پوچھا؟ کیا آپ بیوی کی محبت کے جوش میں لشکر اسلام کو چھوڑ کر وطن جا سکتے ہیں؟ جواب دیا ہرگز نہیں۔ مجھے دل پر اتنا قابو حاصل ہے کہ یہاں اگر ہزاروں تکلیفیں بھی پیش آ جائیں تو خوشی خوشی جھیل لوں گا اور وطن کا قصد نہ کروں گا۔ مولانا نے فرمایا: پھر اطمینان رکھیے کہ آپ اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ کے گروہ میں شامل ہیں۔ اس کے بعد کھانا کھایا۔

ایک مرتبہ سید صاحب کا وعظ سن کر شیخ محمد اسحاق کے دل میں یہ وسوسہ بیٹھ گیا کہ ان کا ایمان لوثِ خلل سے پاک نہیں۔ چنانچہ شدتِ رنج و غم میں خورونوش سے ہاتھ اٹھا لیا۔ سید صاحب نے بلا کر تسلی دی تو مطمئن ہوئے۔ شیخ صاحب کی اس والہانہ کیفیت کو دیکھ کر سید صاحب انہیں محبت سے "دیوانہ شاہ" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

بالاکوٹ

بالاکوٹ کی لڑائی میں شریک تھے، لیکن مایار کی جنگ میں دائیں ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئی تھیں، اس لئے بندوق نہ چلا سکتے تھے اور انہیں گنڈاسا دے دیا گیا تھا۔ وہ مولانا احمد اللہ ناگپوری کی جماعت میں شریک تھے۔ مولانا احمد اللہ میدانِ جنگ میں سید صاحب کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر چکے تھے، انہوں نے اپنے بعد کسی کو جماعت کا امیر بنا دینا ضروری سمجھا۔ مولوی سید جعفر علی نقوی کو یہ منصب پیش کیا تو موصوف نے جماعت میں سے جن اصحاب کو اہل تر بتایا، ان میں حافظ مصطفیٰ کاندھلوی اور مولوی محمد حسن بنارسی کے علاوہ شیخ محمد اسحاق گورکھپوری بھی تھے۔

سکھوں نے مٹی کوٹ کے ٹیلے سے اتر کر بالاکوٹ پر پیش قدمی شروع کی تو مجاہدین قصبے کی مسجد کلاں میں اور اس کے آس پاس جمع تھے۔ سکھوں کی طرف سے گولے اور گولیاں اولوں کی طرح برس رہی تھیں۔ مولوی سید جعفر علی نقوی کے بیان کے مطابق اس وقت شیخ محمد اسحاق نے فرمایا: اب دل میں شہادت کے سوا کوئی خیال باقی نہ رہا۔ مجاہدین نے قصبے سے اتر کر سکھوں پر یورش کی تو ابتدا ہی میں شیخ محمد اسحاق کے بائیں بازو پر گولی لگی۔ دایاں بازو پہلے بیکار تھا، بایاں بھی بیکار ہو گیا تو وہ یہ کہتے ہوئے قصبے میں واپس آ گئے کہ میں اب صرف دعا کے قابل رہ گیا ہوں۔

شہادت

یقینی طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ جنگِ بالاکوٹ میں ان پر کیا گذری۔ حاجی غریب اللہ گورکھپوری ان مجاہدین میں سے تھے جو مٹی کوٹ کے دامن میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے سکھوں سے ہجوم کے باعث قصبے میں پہنچ گئے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ شیخ محمد اسحاق

بالاکوٹ میں بیہوش پڑے تھے۔ سکھوں کی فوج نے قصبے کی جنوبی سمت سے پیش قدمی کی تو **شیخ غریب اللہ** ست بنے کے راستے چلے گئے۔ **شیخ محمد اسحاق** چونکہ بے ہوش تھے، اس لیے انہیں اٹھا کر نہ لے جا سکے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جتنے مجاہدین قصبے میں زخموں کے باعث معذور پڑے تھے، سکھوں نے ان سب کو شہید کر ڈالا اور قصبے کو آگ لگا دی۔ شیخ محمد اسحاق بھی انہیں میں شامل تھے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

گیارہواں باب:

ارباب بہرام خاں

یہ تہکال کے رئیس تھے جو پشاور کے قریب ایک مشہور مقام ہے اور خلیل خیل قبیلے میں سے تھے۔ اہل وعیال کے ساتھ سید صاحب کے خمر جانے سے پیشتر آپ کے پاس پہنچے۔ اسباب، ہتھیار، گھوڑے جو کچھ پاس تھا آپ کی خدمت میں بہ طور نذرانہ پیش کر دیا، یہاں تک کہ اہلیہ کے بعض قیمتی پارچے بھی گھر نہ رکھے۔ سید صاحب نے دو گھوڑے اور دو تلواریں رکھ لیں، باقی ہر چیز واپس کر دی اور فرمایا کہ ہتھیار وغیرہ اپنے ساتھیوں میں بانٹ دیجیے۔ ایک تلوار بہ طور تبرک اپنے پاس سے دی۔

اژدر

انہیں دو گھوڑوں میں سے ایک کا نام اژدر تھا جو سید صاحب نے اپنی سواری کے لیے رکھ لیا تھا۔ پھولڑہ پر یورش کے سلسلے میں سید احمد علی رائے بریلوی کو امیر لشکر بنا کر بھیجا تو سواری کیلئے انہیں اژدر گھوڑا دے دیا۔ پھولڑہ کی جنگ میں سکھ اسے پکڑ کر لے چلے تو محمد خاں خیر آبادی نے پکار کر کہا: بھائیو! یہ امیر المومنین کی سواری کا گھوڑا ہے، اسے دشمن کے قبضے میں نہ جانے دو۔ پھر تنہا سکھوں کے اس گروہ پر حملہ کر دیا جس کے پاس اژدر تھا اور تھوڑی دیر میں اسے چھڑا لیا۔ سکھوں نے دوبارہ حملہ کیا، اس میں اژدر بھی مارا گیا اور محمد خاں بھی شہید ہو گئے۔

کارنامے

غرض ارباب موصوف سید صاحب سے وابستگی کے بعد ایک لمحے کیلئے بھی الگ نہ ہوئے اور اکثر معرکوں میں شریک رہے۔ پشاور کے درانی سرداروں نے ہندوستان سے آنے والے مجاہدین کے قافلوں کو کنڈوہ میں روک دیا تھا تو سید صاحب نے ملا قطب الدین ننگرہاری کے علاوہ ارباب موصوف کو بھیجا تھا کہ قافلوں کو ساتھ لے آئیں۔ ان کے پاؤں میں اتفاق سے چھالے نکل آئے اور جا نہ سکے۔ اپنے آدمیوں کو بھیج دیا۔

ارباب محترم کی مزید سرگرمیوں کا اجمالی مرقع ذیل میں درج ہے:

۱۔ قیامِ خمر کے دوران میں اتمان زئی اور پشاور میں پیش قدمی کی تجویز ہوئی تھی تو سید صاحب نے خیبر کی سمت کے قبیلوں کو بھی امداد پر آمادہ کرنا چاہا تھا۔ اس سلسلے میں بعض ہندوستانی مجاہدوں کے علاوہ ارباب بہرام خاں اور ان کے بھائی ارباب جمعہ خاں کو بھی بھیجا تھا۔

۲۔ پنجتار میں ارباب موصوف اور ان کے متعلقین شہتوت کے باغ میں رہتے تھے جو آبادی سے ایک تیر کے فاصلے پر جنوب مغرب میں واقع تھا۔

۳۔ اٹک پر یورش کیلئے جو لشکر بھیجا گیا تھا اس کے سالار ارباب بہرام خاں ہی مقرر ہوئے تھے۔

۴۔ ہنگی پر شبخون میں بھی ارباب موصوف شریک تھے۔

۵۔ کوہ کنیر ڑی (نزد عشرہ) کی جنگ میں مجاہدین کے سالار تھے۔

۶۔ قیامِ پنجتار کے دوران سید صاحب کو علاقے کے دورے کا مشورہ ارباب موصوف ہی نے دیا تھا۔

۷۔ پشاور پر پیش قدمی میں بھی ارباب موصوف اور ان کے بھائی جمعہ خاں شامل

تھے، چنانچہ پشاور میں ارباب کو سرائے گورکھتری کے دروازہ کلاں میں ٹھہرایا گیا تھا، جس کے اندر حویلی میں سید صاحب ٹھہرے تھے۔ ارباب جمعہ خاں کابلی دروازہ میں ٹھہرا تھا۔

پشاور اور ہجرتِ ثانیہ

۸۔ جن اصحاب نے سلطان محمد خاں درانی کے ساتھ مصالحت اور پشاور کی حوالگی سے اختلاف کیا تھا، ان میں ارباب بہرام خاں بھی شامل تھے۔ چنانچہ انہوں نے کسی ذریعے سے عرض کرایا کہ یہ علاقہ کسی کو دینا ہی ہے تو مجھے عنایت فرمائیں۔ میں اس کی حفاظت کروں گا اور چار ہزار سپاہی ملازم رکھ کر حضرت کے ہمرکاب کروں گا۔ ان کی تنخواہ وغیرہ کا سارا بوجھ میرے ذمے ہوگا۔ سید صاحب نے یہ سن کر فرمایا کہ ہم اور ارباب میں کوئی مغایرت نہیں۔ علاقے کو ارباب کے حوالے کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اپنا قبضہ بحال رکھا۔ ارباب نے ہمارا مقصد نہیں سمجھا۔

۹۔ سید صاحب نے ہجرتِ ثانیہ کا فیصلہ کیا تو ارباب نے اپنے تمام متعلقین کو اجازت دے دی کہ آپ لوگ چاہیں تو چلے جائیں، میں تو حضرت کے ساتھ رہوں گا۔ ان میں سے بھی کسی نے علیحدگی گوارا نہ کی۔

۱۰۔ سید صاحب راج دواری میں مقیم ہوئے تو ارباب کو شارکول میں اقامت کا حکم دیدیا۔ جب سید صاحب نے پچھوں سے بالاکوٹ جانے کا فیصلہ کیا تو ارباب نے بھی معیت کی درخواست کی۔ اس وقت سے وہ آخری دم تک سید صاحب کے ساتھ رہے۔

بالاکوٹ

سکھوں کا لشکر بسیاں، جابہ وغیرہ ہوتا ہوا اس مقام پر پہنچا جسے آج کل شہید گلی کہتے ہیں تو میرزا احمد بیگ کے دستے سے مقابلہ ہوگیا۔ میرزا نے کمک کیلئے درخواست بھیجی تو جن اصحاب کو جانے کا حکم ملا ان میں ارباب بہرام خاں بھی تھے۔ جب میرزا احمد بیگ

سے معلوم ہوا کہ اب مٹی کوٹ میں سکھوں سے مقابلہ نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ پہاڑ پر پہنچ جانے کے بعد وہ بیسیوں پگڈنڈیوں سے نیچے اتر سکتے ہیں اور ہم ہر پگڈنڈی پر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے، تو اس وقت ارباب نے یہ تجویز پیش کی کہ سکھوں کی لشکرگاہ پر حملہ کرنا مناسب ہوگا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ہم نے دریا کا پل تڑوا دیا ہے اور ہم دریا سے پار اتر کر مشرقی کنارے پر نہیں جا سکتے، جہاں سکھ لشکرگاہ ہے۔ ارباب نے عرض کیا، پل راتوں رات تیار ہو سکتا ہے۔ سید صاحب نے فرمایا: اس بات کو چھوڑیے جو کچھ ہونے والا ہے، یہیں ہو رہے گا۔ جاں نثار ارباب نے انگشتِ شہادت سے اپنی گردن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا:

"ایں سر در راہ خدا تعالیٰ حاضر است"

ترجمہ: یہ سر خدا تعالیٰ کی راہ میں قربانی کے لئے حاضر ہے۔

شہادت

سید صاحب سکھوں پر یورش کیلئے مسجد بالا سے مسجد زیریں میں آئے۔ وہاں سے میدان میں نکلے تو ارباب بہرام خاں ساتھ تھے۔ پھر معلوم نہ ہو سکا کہ ارباب نے کہاں شہادت پائی۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ ارباب کی قبر بالاکوٹ کے شمال مشرق میں ست بنے نالے کے پار شاہ اسمٰعیل کے مرقد سے ملی ہوئی تھی۔ اس بنا پر قیاس یہ ہے کہ ارباب اور شاہ صاحب مٹی کوٹ کے دامن سے لڑتے لڑتے پیچھے ہٹتے ہوئے اس مقام پر پہنچ کر شہید ہوئے، جہاں ان کی قبریں ہیں۔

انتقالِ میت

واقعہ بالاکوٹ سے چھ مہینے بعد ارباب شہید کے بھتیجے اور داماد محمد خاں نے اپنے ہم قوموں سے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ ارباب کی میت بالاکوٹ سے تہکال منتقل کر لیں۔

بعض لوگوں نے کہا بھی کہ اب اس مرحوم کی ہڈیاں کھود کر لانے سے کیا حاصل ہوگا؟ محمد خاں نے جواب دیا، میرے چچا نے خلوصِ نیت سے سید بادشاہ کا ساتھ دیا تھا۔ اپنا پورا مال و اسباب راہِ خدا میں لٹا دیا۔ آخر جان بھی دے دی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی لاش قبر میں سلامت ہوگی۔

غرض محمد خاں نے ایک صندوق بنوایا اور چالیس آدمیوں کے ساتھ بالاکوٹ گیا۔ قبر کھودی گئی تو میت بالکل محفوظ تھی۔ نہ اس کا کوئی حصہ بگڑا تھا، نہ بدبو پیدا ہوئی تھی۔ صرف پاؤں کے ناخنوں میں خفیف سا تغیر معلوم ہوتا تھا۔ میت کو صندوق میں رکھ کر تہکال لائے۔ پوری قوم نے انتہائی احترام سے اسے از سر نو دفن کیا۔ ارباب شہید کا یہ مرقد تہکال کی جنوبی سمت کے قبرستان میں راستے کے قریب واقع ہے۔ مرقد بالکل سادہ ہے، لیکن عام قبروں کے مقابلے میں خاصا بلند ہے، بچہ بچہ جانتا ہے کہ یہ ارباب شہید کی قبر ہے اور اکثر لوگ جاتے آتے فاتحہ پڑھتے ہیں۔

اولاد

ارباب بہرام خاں کے پانچ بیٹے تھے اور ایک بیٹی، جو ان کے بھتیجے محمد خاں کے نکاح میں تھی۔ ارباب کی شہادت کے وقت بیٹوں میں سے دو کم سن تھے۔ سرحد کے اکابر مخلصین میں سے قاضی سید محمد حبان اور سید اکبر شاہ ستھانوی کے سوا کوئی فرد ارباب بہرام خاں کے پائے کا نہ تھا۔

شانِ اخلاص

ارباب شہید حد درجہ مخلص، نیک دل اور صاف گو تھے۔ سید صاحب کی مجلس شوریٰ میں بھی عموماً شریک رہے۔ ایک مرتبہ سوال پیدا ہوا کہ جہاد کا آغاز کس مقام سے ہو۔ اس موقع پر مختلف سرحدی خوانین بھی موجود تھے۔ ارباب نے بے تکلف کہا ہم سب غرض مند

ہیں۔ میں پشاور سے نکلا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ جلد سے جلد پشاور فتح ہو جائے۔ محمد خاں جمعدار اٹک سے نکلا، لہٰذا وہ اٹک کا خواہاں ہے۔ ناصر خاں کو پکھلی کی آرزو ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم سب خاموش رہیں اور فیصلہ ہندوستانی بھائیوں پر چھوڑ دیا جائے۔ جن کی رائے ذاتی خواہش یا طبعی رجحان سے بالکل پاک ہوگی۔ وہ جس جگہ کی تجویز کریں، اسی کے مطابق حملہ کیا جائے۔

ایک سبق آموز واقعہ

سید صاحب کو ارباب سے بڑی محبت تھی، لیکن ایک موقع پر صاف گوئی میں تامل نہ ہوا۔ غالباً ہجرتِ ثانیہ میں سید صاحب کی اہلیہ کیلئے پالکی کا انتظام کیا گیا، اس لئے کہ وہ خاص حالت میں تھیں۔ ارباب کے اہل خانہ کو یہ امر مساوات کے خلاف نظر آیا۔ سید صاحب کو اطلاع ہوئی تو فرمایا: ارباب سے کہہ دیجئے کہ میں آپ کو مومن سمجھتا ہوں اور مومنوں کی خوشامد یا خاطر داری لازم نہیں، کیوں کہ وہ جہاد میں میرا ساتھ نہ چھوڑیں گے، البتہ منافقوں کی دلجوئی کرسکتا ہوں تاکہ وہ ایمان پر پکے ہو جائیں۔ میری اہلیہ حالت خاص میں ہے، ورنہ اس کیلئے بھی گھوڑے ہی کی سواری کا انتظام کیا جاتا۔ ارباب کے اہل خانہ میں سے کسی کو ایسا عذر ہو تو ضرور پالکی کا انتظام کر دیا جائے گا۔

بارہواں باب:

رسالدار عبدالحمید خاں

رسالدار عبدالحمید خاں ٹونک میں ممتاز عہدے پر مامور تھے۔ وقت کے عام خوش حال لوگوں کی طرح ان کی عادتیں بھی بگڑی گئی تھیں۔ اوباش رفیقوں کی صحبت میں فسق وفجور ان کا شیوۂ خاص بن گیا تھا۔ سید صاحب بہ سلسلۂ سفر ہجرت ٹونک سے روانہ ہوئے اور جھلانہ پہنچے تو عبدالحمید خاں اور ان کے رفیق بھی مجاہدین کے اس قافلے کا تماشہ دیکھنے کیلئے راستے پر کھڑے ہوگئے۔ سید صاحب کی نظر عبدالحمید خاں پر پڑی تو مسکرا کر فرمایا: خان جیو! آپ بھی بیعت کر لیجئے۔ عبدالحمید خاں اور ان کے رفیق اس درجہ متاثر ہوئے کہ فوراً بیعت کرلی اور اس لمحے سے ان کی زندگی کا پورا نقشہ بدل گیا۔ قدیم ہم نشینوں نے گمراہ کرنے کی ہرچند کوشش کی، لیکن عبدالحمید خاں راہِ حق پر جمے رہے، اور ملازمت چھوڑ کر سید صاحب کی خدمت میں پہنچنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ چنانچہ ایک قافلے کے ساتھ سرحد پہنچے، جس کے افراد میں سے صرف پانچ کے نام معلوم ہیں: شیر خاں، رستم خاں، مستقیم خاں، شیخ رمضان اور شیخ ممو۔ صاحبزادہ محمد وزیر خاں وزیرالدولہ ولی عہد ٹونک نے انہیں کے ساتھ ایک گھوڑا سید صاحب کیلئے بھیجا تھا، جس کیلئے زرّیں زین پوش تیار کرایا تھا۔

عہدہ رسالداری

تمام لڑائیوں میں شریک رہے جنگ زیدہ کے بعد سید صاحب نے ارادہ فرمایا کہ رسالے کی مستقل کمان کیلئے کسی کو رسالدار بنادیں۔ سید احمد علی نے حمزہ علی خاں ساکن

لوہاری کا نام پیش کیا۔ مولانا شاہ اسمٰعیل نے عرض کیا کہ اس منصب کیلئے عبدالحمید خاں بہت موزوں ہیں۔ ارباب بہرام خاں نے شاہ اسمٰعیل کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ عبدالحمید خاں فن سپاہ گری میں ہوشیار، تجربہ کار اور بہادر ہیں۔ انہیں کو یہ منصب ملنا چاہیے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ یہی تجویز بہتر معلوم ہوتی ہے۔

اگلے روز سید صاحب نے شاہ اسمٰعیل، ارباب بہرام خاں، سید احمد علی، شیخ عبدالحکیم، شیخ ولی محمد اور بعض دوسرے اکابر کو جمع کر کے آخری فیصلہ فرمایا۔ پھر عبدالحمید کو بلا کر کہا: خان بھائی! ہم کئی روز سے کسی کو رسالدار مقرر کرنا چاہتے تھے، سو ہم نے آپ کو یہ عہدہ دیا۔ آپ ان بھائیوں کو سواری اور سپہ گری کی تعلیم دیتے رہیں۔ عبدالحمید خاں نے عرض کیا: حضرت! میں فرمانبردار ہوں، لیکن میرا مزاج ذرا تند ہے اور یہ امر اختیاری نہیں کہ چھوڑ دوں۔ شاید بھائیوں کو میری افسری گراں گذرے۔ یہ کام خدا کے واسطے ہے اور نوابوں رئیسوں کی سی فوج کا نہیں۔ سید صاحب نے سراپا شفقت بن کر فرمایا: خان بھائی! اس کا اندیشہ نہ کریں ہم دعاء کریں گے۔ امید ہے اللہ تعالیٰ آپ کے مزاج کی تیزی کو دور کردے۔

دعاء

غرض آپ نے دست مبارک سے اپنا عمامہ عبدالحمید خاں کے سر پر باندھا اور فرمایا کہ دوشالے اور رومال میں سے جو پسند ہو لے لیجیے۔ خان نے رومال لے لیا۔ سید صاحب نے سنہری قبضے کی ایک سروہی عبدالحمید خاں کے گلے میں ڈال دی جو نواب امیر خاں والی ٹونک نے بطور نذر پیش کی تھی۔ یہ نواب کو راجہ مان سنگھ والیٔ جودھپور نے دی تھی۔ اس کا پرتلا سابری تھا۔ ایک تلوار اور گھوڑا بھی دیا۔ پھر برہنہ سر ہو کر دعاء کی۔ رسالدار نے ایک اشرفی اور پانچ روپے نذر کے طور پر پیش کیے اور معاً مسجد میں جا کر

شکرانے کے دو نفل پڑھے۔ بلاشبہ عبدالحمید خاں کا مزاج بڑا تیز تھا۔ سید احمد علی بھی ان کے محاسن کے معترف تھے۔ صرف یہ کہتے تھے کہ ان کا مزاج تیز ہے اور بات بات پر ناخوش ہو جاتے ہیں، لیکن تمام راوی متفق ہیں کہ رسالدار مقرر ہونے کے بعد عبدالحمید خاں حلم، بردباری اور سلامت مزاج کا پیکر بن گئے تھے۔

جنگِ امب

جب سید صاحب نے پکھلی کے رؤسا و خوانین کی طلب پر اس طرف پیش قدمی کا ارادہ کیا تو ایک لشکر اپنے بھانجے سید احمد علی کی سرکردگی میں بھیج دیا تھا، جو پایندہ خاں کی مخالفت کے باعث ستھانہ میں ٹھہر گیا تھا۔ رسالدار عبدالحمید خاں کو اس لشکر میں نائب سالار بنایا تھا۔ پایندہ خاں سے جنگ کی صورت پیش آگئی تو سید صاحب نے مولانا شاہ اسمٰعیل کو سالارِ اعظم بنا دیا تھا۔ وہ خود فردوسہ میں مقیم ہو گئے تھے اور کچھ جیش انہوں نے جا بجا دوسرے مقامات پر متعین کر دیے تھے۔ پھر حملے کا ایک نہایت عمدہ منصوبہ بنا کر تمام جیشوں کو پیش قدمی کے وقت اور یورش کے مقامات کی نسبت مفصل ہدایات دے دی تھیں۔ پایندہ خاں نے جب دیکھا کہ غازیوں کی یورش کے مقابلے میں کامیابی کی کوئی صورت نہیں تو شاہ اسمٰعیل کے سامنے صلح کی تجویز پیش کر دی اور انہوں نے تمام جیشوں کو پیش قدمی سے روک دیا۔ خود پایندہ خاں خفیہ خفیہ پیش قدمی کی تیاری کرتا رہا۔ سید احمد علی اپنے لشکر کے ساتھ ستھانہ سے روانہ ہو چکے تھے کہ شاہ اسمٰعیل کا امتناعی حکم مل گیا، وہ وہیں سے لوٹ پڑے، لیکن وہ ایسی جگہ تھے، جہاں سے پایندہ خاں کی فوج کی نقل و حرکت صاف صاف نظر آ رہی تھی۔

عبدالحمید خاں نے کہا کہ سید احمد علی صاحب! پایندہ خاں دھوکا دے رہا ہے۔ آپ واپس نہ ہوں اور آگے بڑھیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں سالارِ اعظم کے حکم سے مجبور ہوں۔ اس اثناء میں پایندہ خاں کی فوج نے کوہ کھیرڑی کے غازیوں پر حملہ کر دیا اور

گولیاں چلنے لگیں۔ عبدالحمید خاں نے پھر کہا کہ سید احمد علی! لڑائی شروع ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ چلیں ورنہ مجھے جانے دیں۔ سید احمد علی نے انہیں بھی روک دیا۔ اس اثناء میں لڑائی کی خبر آ پہنچی اور عبدالحمید خاں کی رائے درست ثابت ہوئی۔

انتظامِ عشر

انتظامِ عشر کے سلسلے میں عبدالحمید خاں قاضی سید حبان کے ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ بھی یہ عموماً دیہات کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ اپنے تھوڑے سوار جابجا متعین کر رکھے تھے، لیکن طریقہ یہ تھا کہ آپ کسی سپاہی کو گاؤں کے اندر نہ جانے دیتے تھے۔ سب کو حکم تھا کہ جس چیز کی ضرورت ہو، باہر ٹھہر کر منگوا لیں۔ ایک دفعہ ایک مجاہد سے غلطی سرزد ہوگئی تو رسالدار نے اسے سخت سزا دی۔ ایک مرتبہ پاجی میں دو سواروں نے ایک شخص کے کھیت سے چارا کاٹ لیا، جس کی باری نہ تھی۔ رسالدار تک یہ بات پہنچی تو اس درجہ خفا ہوئے کہ ایک سوار کے کندھے پر الٹی تلوار ماری۔

جنگِ مایار

مایار کی جنگ میں انہیں حکم ملا تھا کہ رسالے کے ساتھ ایک خاص مقام پر ٹھہرے رہیں اور امیر المومنین کے حکم کے بغیر حملہ نہ کریں۔ جنگ نازک صورت اختیار کر گئی اور نظر بہ ظاہر سید صاحب دشمنوں میں گھر گئے تو ایک سوار نے یہ سمجھ کر حملہ کر دیا کہ سید صاحب کا بچانا ہر مصلحت پر مقدم ہے۔ رسالدار نے سمجھا کہ حملے کا حکم آ گیا ہے۔ انہوں نے بھی ہلہ بول دیا۔ ان کے پاس دو گھوڑے تھے، جن پر باری باری سوار ہوتے تھے۔ جنگ مایار کے دن سمند کی باری تھی۔ جس طرف باگ اٹھاتے دشمن کی صفیں چیر کر رکھ دیتے۔ تین چار مرتبہ درانی لشکر میں گھسے اور تلواریں مارتے ہوئے پار نکل گئے۔ ان حملوں میں خود بھی زخموں سے چور ہو گئے۔ آخر گھوڑے سے گر پڑے۔ جسم ذرا فربہ تھا۔

زرہ کی کڑیاں گوشت میں گھس گئیں۔ راوی کا بیان ہے کہ جنگ کے بعد انہیں میدان سے اٹھا کر لائے تو جس کی نظر محبوب رسالدار پر پڑتی بے اختیار اشک بار ہو جاتا۔ خود رسالدار بالکل صابر و شاکر تھے۔ ایک بھی مرتبہ تکلیف کا کوئی کلمہ زبان پر نہ آیا۔ وفات کے متعلق اختلاف ہے۔ ایک بیان ہے کہ تورو پہنچ کر وفات پائی، دوسرا بیان ہے کہ تورو سے انہیں پنجتار لے گئے تھے، وہیں جاں بحق ہوئے۔

شانِ انتظام

راویوں نے بیان کیا ہے کہ ان کا گھوڑا ہر وقت ساز و سامان سے لیس رہتا تھا تاکہ ضرورت کے موقع پر ادائے فرائض میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہ ہو۔ انتظام کی یہ کیفیت تھی کہ کسی شخص کو کسی معاملے میں دخل دینے کی مجال نہ تھی اور کسی کی سفارش نہ سنتے تھے۔

ان کے بعد حمزہ علی خاں رسالدار مقرر ہوئے۔ وہ بڑے عابد و زاہد اور صاحب تاثیر تھے۔ سپہ گری اور نیزہ بازی میں بے نظیر مانے جاتے تھے۔ حمزہ علی خاں حج میں بھی ساتھ تھے۔ انہیں کی یہ روایت ہے کہ سید صاحب کے پاس قیامِ کلکتہ کے دوران میں بے اندازہ شیرینی آتی تھی اور اس میں اکثر بتاشے ہوتے تھے۔ سید صاحب کو ایک آدھ بتاشہ چکھنا پڑتا تھا۔ چکھتے چکھتے زبان مبارک پر آبلے پڑ گئے تھے۔

اہل و عیال

کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ رسالدار عبدالحمید خاں کے متعلقین میں سے کون کون موجود تھے۔ سید صاحب کے ایک مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اہل و عیال سرونج میں تھے۔ ایک مکتوب میں نواب وزیر الدولہ کو لکھتے ہیں کہ اخلاص نشان عبدالحمید خاں خدمت دین میں مستعدی سے مصروف ہیں۔ ان کے متعلقین آپ کے زیر سایہ رہتے ہیں۔ امید ہے کہ ان کی پرورش پر خاص توجہ مبذول رکھیں گے۔

تیرہواں باب:

سید محمد علی رام پوری

معلوم نہیں، سید محمد علی نے کس زمانے میں بیعت کی، البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ مجاہدین کا قافلہ لے کر ابتدائی دور ہی میں سرحد پہنچ گئے تھے۔ جس زمانے میں سید محبوب علی دہلوی کی مراجعت کے باعث قافلوں کی آمد رک گئی تھی، اس زمانے میں جن اصحاب کو بہ غرض دعوت و تبلیغ ہندوستان بھیجا گیا، ان میں سید محمد علی بھی تھے۔

وقائع کا بیان

''وقائع'' میں ان کے ارسال کی کیفیت یوں بیان ہوئی ہے:

> ''مولوی محمد علی رام پوری کو حضرت علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ تم طرف حیدرآباد دکھن کے جاؤ۔ انہوں نے عذر کیا کہ مجھ کو نہ اس قدر علم ہے کہ کسی عالم سے مباحثہ یا مناظرہ کروں اور نہ یہ سلیقہ ہے کہ لوگوں کے انبوہ میں وعظ و درس کہوں۔ مجھ کو تو آپ کسی کام کو وہیں بھیجیں کہ وہ کام کر کے چلا آؤں۔ آپ نے فرمایا کہ خیر، جس بات کا عذر کرتے ہو، اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ عذر دور کر دے۔ پھر آپ نے اپنا کرتا اور پاجامہ اور تاج (ٹوپی) ان کو پہنایا۔ چار پانچ آدمی ان کے ہمراہ کیے۔ ان میں ایک نعیم خاں رام پوری تھے اور دوسرے عنایت اللہ خاں تنالی والے اور تیسرے عبداللہ کہ انہیں کے رفیقوں میں سے تھے اور باقی کے نام یاد نہیں اور فرمایا کہ یہاں سے سندھ کو جانا۔ وہاں پیرکوٹ میں بی بی صاحبہ سے ملتے ہوئے کراچی بندر کو جانا۔ وہاں سے کشتی پر سوار ہو کر

بمبئی میں اترنا پھر وہاں سے حیدر آباد کو جانا۔ (۱)

حیدر آباد

سید محمد علی نے حیدر آباد کا قصد کیا تو وہاں مخالف بھی تھے اور موافق بھی۔ مولوی حیدر لکھنوی دیوان چندولال کے پیشکار تھے، انہوں نے سید محمد علی کی آمد کو دیوان کے سامنے نہایت برے رنگ میں پیش کیا۔ کہا کہ وہ سید احمد کے خلیفہ ہیں، جو انگریزوں سے لڑتے ہیں۔ چندولال بولا کہ پھر تو انہیں قید کرنا چاہیے۔ سید محمد علی پیش آنے والی آفات سے بالکل بے پروا تھے اور چاہتے تھے کہ اپنے مرشد کا حکم پورا کریں خواہ کوئی صورت پیش آئے۔

قاری عبداللہ سید صاحب اور سید محمد علی کے معتقدین میں سے تھے۔ اس وقت حیدر آباد میں دستور تھا کہ باہر سے معززین آتے تو سرکاری طرف سے ان کی سواری کے لئے گھوڑے، ہاتھی اور پالکیاں ملتیں اور حسین شاہ ولی کی درگاہ سے انہیں شہر میں لاتے۔ قاری عبداللہ نے سید محمد علی کیلئے یہی انتظام کرنا چاہا۔ مولوی عبیدالحسن بنگالی شاہ عبدالعزیز کے شاگرد کمپنی کے وکیل تھے۔ ان کی وساطت سے درخواست کی۔ انہوں نے چندولال سے کہا کہ سید محمد علی بن علی فرخ آبادی کے خویش ہیں، ان کا اعزاز ہونا چاہیے۔ چندولال نے کہا: ابن علی میرے محسن ہیں، سید محمد علی کا اعزاز ضرور ہوگا اور میں خود بھی ان کی ملاقات کا آرزومند ہوں۔

غرض سید محمد علی کو بڑے اعزاز سے شہر میں لائے۔ انہیں چندولال سے ملنا پسند نہ تھا، لیکن حالات کی وجہ سے مجبور تھے، ملاقات ہوئی تو چندولال نے اڑھائی سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور دو ہزار کی رقم یک مشت مہمانداری کیلئے دی۔ سید محمد علی کی دعوت تبلیغ سے حیدر آباد میں سنت کا احیاء ہوا۔ مبارز الدولہ اور بڑے بڑے امرا اسی دور میں

---

(۱) "وقائع" ص ۵۰۷، ۵۰۹۔

صراط مستقیم پر قائم ہوئے۔ پھر مولوی صاحب کو مدراس جانے کا حکم ہوا اور مولوی ولایت علی حیدر آباد آ گئے۔

اس زمانے میں چندو لال کے ساتھ تعلق رکھنے والے منیر الملک سے نہ ملتے تھے۔ سید محمد علی نے فرمایا کہ مجھ پر حیف ہے ہندو سے ملوں اور مسلمان سے نہ ملوں، چنانچہ ایک دوست کی وساطت سے ملاقات کا انتظام کیا، ان کے ہاں موت وغیرہ کے تذکرے نہ ہوتے تھے۔ سید محمد علی نے احوال آخرت کے متعلق ایسا وعظ فرمایا کہ سب سننے والوں کے دل دہل گئے۔

مدراس

سید محمد علی حسب الحکم حیدر آباد سے نکلے تو کرنول، کڈپا اور ویلور ہوتے ہوئے محرم ۱۲۴۵ھ (جولائی ۱۸۲۹ء) میں مدراس پہنچے جس کا پرانا نام چینا پٹن تھا اور اسے عام لوگ پٹن بھی کہتے تھے۔ سید محمد علی نے ملا بحر العلوم کے فرزند مولوی عبد الرب کے مدرسے میں ڈیرے ڈالے اور کتاب و سنت کی اشاعت شروع کی۔ آپ کے وعظ سے ہزاروں لوگ راہِ راست پر آ گئے۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر نواب خان عالم خاں بہادر تہور جنگ ہیں، جو مدراس کے معزز رؤسا میں سے تھے اور ان کی صاحبزادی نواب ارکاٹ کی بیگم تھی۔ نواب موصوف نے بیعت کرتے ہی راہِ سنت اختیار کر لی اور اپنے گھر کی وہ تمام چیزیں تڑوا ڈالیں جو شریعت کی رو سے ناجائز تھیں۔

تبلیغ کے نتائج

خود نواب خان عالم نے سید محمد علی کی تبلیغ کے اثرات یوں بیان کیے ہیں:

۱۔ شراب، سیندھی، گانجا پینے والے فاسق اور نرسو (۱) کو پوجنے والے عوام و خواص پنج وقتہ نماز پڑھنے لگے۔

---

(۱) ایک ہندو دیوتا جسے مسلمان بھی پوجتے تھے۔

۲۔ مردوں کے علاوہ بعض عورتیں بھی تہجد گزار ہوگئیں۔

۳۔ تمام غیر شرعی اعمال و رسوم کا خاتمہ ہوگیا۔(۱)

دس مہینے کی تبلیغ کے یہ کرشمے دیکھ کر مخالف بھی جوش میں آگئے اور انہوں نے اعتراضات شروع کردیے۔ سید محمد علی کا طریقہ یہ تھا کہ فضول بحثوں اور مناظروں میں نہ الجھتے، اپنے اصل مقصد سے کام رکھتے اور اصلاحِ عقائد و اعمال پر زور دیتے۔

مدراس کا دوسرا سفر

سید صاحب کی شہادت کے بعد سید محمد علی رام پور چلے گئے۔ ۱۲۵۰ھ میں حج کے ارادے سے کلکتہ پہنچے تو مدراس والوں نے پے در پے درخواستیں بھیجیں کہ یہاں ٹھہرتے ہوئے جائیے بلکہ نواب ارکاٹ کی والدہ نے ایک خاص آدمی کلکتہ روانہ کردیا کہ سید محمد علی کو ہمارے جہاز ”دریا دولت“ پر سوار کر کے لائیے۔ ان کی اولین غرض یہ تھی کہ سید محمد علی صاحب سے اپنے بیٹے کیلئے اولاد کی دعائیں کرائیں۔ سید موصوف مدراس پہنچ کر پہلے تنیال پیٹ میں ٹھہرے وہاں ان کیلئے بڑی حویلی خالی کرادی گئی تھی۔ پھر نواب ارکاٹ کی والدہ نے جعفر علی خاں خانساماں کو بھیج کر سید صاحب کو اپنے ہاں بلالیا اور سید صبغۃ اللہ شاہ کی حویلی میں اتارا۔ سید موصوف کی دعاء سے خدا نے نواب ارکاٹ کو اولاد عطا کی۔

اس موقع پر مخالفوں نے شدید ہنگامے بپا کیے اور ہر ممکن کوشش کی کہ سید محمد علی کی دل آزاری اور اذیت رسانی میں کوئی کسر رہ نہ جائے۔ مخالفوں میں جمال فرنگی محلی، مولوی اسلمی اور ارتضا علی خاں پیش پیش تھے۔ زیادہ تر بحثیں شاہ اسمٰعیل کی کتاب ”تقویۃ الایمان“ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شفاعت کے متعلق ہوتی رہیں۔ ایک موقع پر سید محمد علی کو زہر دینے کی کوشش بھی کی گئی تھی، لیکن آپ اور آپ کے متعلقین خدا

---

(۱) تنبیہ الضالین۔

کے فضل سے محفوظ رہے

خان عالم خاں کی استقامت

نواب خان عالم خاں بہادر پر بھی وار ہوئے۔ چنانچہ نواب سے کہہ کر انکی تنخواہ بند کرادی گئی، جسکی مقدار گیارہ سو روپیہ ماہانہ تھی۔ ان کی صاحبزادی (بیگم نواب ارکاٹ) کو بھی بہت تنگ کیا گیا کہ کسی طرح وہ غیر شرعی مراسم اختیار کر لیے جائیں، جو عام طور پر اس زمانے میں رائج تھے۔ اس حق پرست خاتون کا نواب کو صرف ایک جواب تھا:

> ”میں آپ کی بیوی ہوں اور آپ کے ہر فرمان کو ماننے کیلئے ہمہ تن تیار ہوں، لیکن قبر اور آخرت کے معاملات سب کے الگ الگ ہیں۔ میں آپ کے فرمان سے کسی غیر شرعی امر کی مرتکب نہیں ہو سکتی۔“

سید پر ظلم و جور

سید محمد علی نے بارہا اعلان کیا کہ میرا عقیدہ اور عمل وہی ہے جو جمہور اہل سنت کا ہے اور جو کچھ خلافِ سنت ہے اسے غلط سمجھتا ہوں، خواہ وہ کسی کی طرف سے ہو، لیکن مخالفوں نے انہیں چین نہ لینے دیا۔ سید موصوف کے ایک نیاز مند نے اس ابتلا کی ایک تاریخ کہی جو ذیل میں درج ہے۔

بر محمد علی جفائے چناں   رفت چوں جورِ شام بر حسنینؓ
ہست تاریخ ایں بلائے عظیم   یاد مظلومیِ امام حسینؓ

۱۲۵۱ھ

سید محمد علی نے اس کے بعد حج کیا۔ پھر احیائے دین کے کام میں لگے رہے۔ ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں وفات پائی۔

چودھواں باب:

میاں جی محی الدین چشتی

یہ سید صاحب کے مخلص ارادت مند تھے۔ ان کا ایک قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ انھیں شاہ بخارا کے پاس دعوتِ جہاد کی غرض سے بھیجا گیا۔ جب سفارت کی تجویز پختہ ہو گئی تو سید صاحب نے فرمایا کہ کوئی موزوں آدمی تجویز کیا جائے۔ شاہ اسمٰعیل نے میاں جی چشتی کا نام تجویز کیا۔ سید صاحب نے انھیں تیاری کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ نو آدمی ساتھ لے جائیں، چنانچہ انھوں نے مندرجہ ذیل آدمی تجویز کیے: شیخ محب اللہ ساکن کھڈا شکار پور (ضلع مظفر نگر)، نصیر الدین، رحیم بخش، اسمٰعیل خاں، ہمت خاں، فتح یاب خاں، حکیم عبد الحکیم دہلوی جو حکیم جی اونٹنی والے مشہور تھے۔ دو آدمی قندھاری تھے۔

سید صاحب نے انھیں کئی قلمی قرآن مجید دیے کہ راستے کے رؤسا کو دیتے جائیں۔ ان میں سے ایک قرآن مجید شاہ بخارا کیلئے تھا۔ متعدد اعلام نامے دیے۔ میاں جی صاحب اس لمبے سفر سے جنگ زیدہ کے تین روز بعد واپس آئے۔ سفر کی کیفیت ذیل میں درج ہے، جو میاں جی صاحب کے برادر نسبتی شیخ محب اللہ سے معلوم ہوئی۔ شیخ صاحب سید صاحب کی شہادت کے بعد ٹونک میں آ بسے تھے اور وہاں انھوں نے دکان کھول لی تھی۔

میاں جی صاحب نے خرچ کیلئے نقد روپیہ بھی ساتھ لے لیا تھا، لیکن واقف کار لوگوں نے انھیں مشورہ دیا کہ بعض حصوں میں سکے کا رواج ہی نہیں اور جنس کے بدلے جنس لی جاتی ہے، چنانچہ انھوں نے ایسی چیزوں کی خاصی مقدار ساتھ لے لی، جن کی

طلب راستے کے لوگوں کو رہتی تھی، مثلاً ہلدی، سونٹھ، نمک، سوئیاں، سوتی کپڑا۔

وہ باجوڑ ہوتے ہوئے چترال گئے اور شاہِ چترال سے ملاقات کی۔ سید صاحب کا ایک مکتوب انھیں دیا۔ اس نے قیام وطعام کا اچھا بندوبست کر دیا۔ وہاں میاں جی صاحب کے آدمیوں نے اپنی چیزیں فروخت کیں، مثلاً ایک ایک سوئی کی قیمت پچیس تیس سیب یا ناشپاتیاں مل جاتی تھیں۔ سونٹھ اور ہلدی کی ایک ایک گرہ انگور کے پانچ پانچ خوشے دے کر خریدی جاتی تھی۔ کپڑے کا تھان جو بارہ تیرہ آنے کو خریدا گیا تھا، اس کے بدلے پشمینے کا نہایت عمدہ چوغہ مل جاتا تھا۔ حکومت کا کاروبار بہت سادہ تھا۔ وہاں مشعلیں بھی ناپید تھیں۔ لوگ چیڑ کی لکڑیاں جلا کر مشعلوں کا کام لیتے تھے۔

چترال سے بدخشاں کی سرحد تک رہبروں کا انتظام شاہ چترال نے کر دیا۔ پھر یہ قافلہ فیض آباد پہنچا۔ وہاں کے حاکم سے میاں جی نے قلعے میں ملاقات کی۔ اس نے بھی قافلے کو عزت سے ٹھہرایا اور مہمانداری کا انتظام کر دیا۔ پانچ دن فیض آباد میں گزار کر قندز روانہ ہوئے، جہاں کا حاکم محمد مراد بیگ تھا۔(۱)

وہاں بھی قافلے کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ عام لوگوں کی زبان ترکی تھی۔ شہر کے لوگ فارسی اور ترکی دونوں بولتے تھے۔ میاں جی نے محمد مراد بیگ کو بھی ایک قرآن اور ایک اعلام نامہ دیا۔ اس نے ایک درباری کو قافلے کی مہمانداری کا حکم دے دیا۔ ایک مہینہ وہاں ٹھہرے رہے۔ اس اثناء میں مراد بیگ سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ وہاں پلنگ پر سونے کا دستور نہ تھا۔ عام لوگ فرش پر قالین بچھا کر سوتے تھے۔ غیر مسلموں کو حکم تھا کہ مسلمان سامنے آ جائے تو گھوڑے سے اتر پڑیں۔ شلوار یا سفید پگڑی نہ باندھیں۔ صرف ایک ہندو آتمارام ان پابندیوں سے آزاد تھا۔ وہ پشاور کا باشندہ تھا اور اس نے ایک نہایت

---

(۱) موہن لال دہلوی عرف حسن جان نے اپنے سفرنامے میں مراد بیگ کا حلیہ یوں بیان کیا ہے: قد چھوٹا، جسم دبلا پتلا، آنکھیں بہت چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی، ڈاڑھی کے چند بال صرف ٹھوڑی پر، رحم و انصاف سے ناآشنا، معمولی جرموں پر سخت سزائیں دیتا۔

نازک موقع پر مراد بیگ کیلئے رسد کا انتظام کر دیا تھا، مراد بیگ نے اس کی خواہش کے مطابق تمام پابندیاں اٹھادیں اور اسی کو اپنے عام کاروبار کا مختار بنادیا۔

قندز کی ایک خصوصیت یہ بتائی گئی کہ ہفتے میں دوبار ایک کھلی جگہ بازار لگتا تھا، جس میں شام تک خرید وفروخت جاری رہتی تھی۔ دوکاندار ہلکی چیز تو گھر اٹھا لے جاتے تھے، باقی سب چیزیں میدان ہی میں چھوڑ جاتے اور کسی کا ذرا سا بھی نقصان نہ ہوتا۔

میاں جی صاحب نے اپنے چھ ساتھی قندز میں چھوڑے اور تین کو ہمراہ لے کر بخارا پہنچے۔ شاہ بخارا نے عزت وتکریم سے اتارا۔ مہمانداری کا عمدہ انتظام کر دیا۔ ابتدا میں بڑی گرم جوشی سے ملتا رہا، پھر ملاقات میں پہلی سی گرم جوشی باقی نہ رہی۔ معلوم ہوا کہ وہاں کے درباریوں نے غلط بیانی کے ذریعے سے شاہ کو بدظن کر دیا ہے۔ غلط بیانی یہ تھی کہ سید صاحب جہاد کیلئے نہیں آئے بلکہ انگریزوں نے اپنا جال وسط ایشیاء میں پھیلانے کی غرض سے انھیں بھیجا ہے، لہٰذا ان کی امداد نہ کرنی چاہئے۔

میاں جی چشتی پانچ مہینے وہاں ٹھہرے رہے۔ جب دیکھا کہ مزید قیام بالکل فضول ہے تو واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ شاہ نے انھیں ایک ترکی گھوڑا، تین یابو، تین تھان کتان کے اور پچاس اشرفیاں دیں۔ چنانچہ وہ ایک قافلہ کے ساتھ قندز پہنچے وہاں سے بدخشاں آئے، جہاں حکیم عبدالحکیم نے وفات پائی۔ پھر چترال، سوات اور بنیر ہوتے ہوئے پنجتار پہنچے۔ اس سفر میں تقریباً دو سال صرف ہوئے۔

میاں جی صاحب کا ذکر جنگ مایار میں بھی آیا ہے، جس میں ان کی ایڑی پر ایسا سخت زخم لگا تھا کہ چلنے سے معذور ہو گئے تھے۔ جنگ بالاکوٹ میں شریک نہ تھے غالباً معذوری کے باعث انہیں وہیں چھوڑ دیا تھا جہاں بی بی صاحب مقیم تھیں۔

پندرہواں باب:

نواب وزیر الدولہ

آپ امیر الدولہ امیر الملک نواب محمد امیر خاں بہادر شمشیر جنگ والی ٹونک کے فرزند ارجمند تھے۔ ۲۷ر جمادی الاخریٰ ۱۲۵۰ھ (۳۱ر اکتوبر ۱۸۳۴ء) کو مسند نشین ہوئے۔ اکبر شاہ ثانی مغل شہنشاہ ہند کی طرف سے وزیر الدولہ امیر الملک بہادر نصرت جنگ کا خطاب ولی عہدی کے زمانے ہی میں عطا ہو چکا تھا۔ باپ بیٹا دونوں سید صاحب کے مخلص ارادت مند تھے۔ بیٹے نے باقاعدہ بیعت کر کے منصب خلافت حاصل کیا تھا۔

ایک نیاز مند نے لکھا ہے:

امیر المومنین را نائب خاص ❁ مجسم ذات او از صدق و اخلاص
وزیر الدولہ آں ذوالفیض والجود ❁ ببیں در کنیتش "بوالفیض" موجود
ز نقد معرفت گنجینۂ اوست ❁ کہ سر احمدی در سینۂ اوست
چو وے دیگر کریم ار دیدہ باشم ❁ بہ ایزد دیگرے بگزیدہ باشم(۱)

نواب وزیر الدولہ نے کم و بیش تیس سال عدل و داد سے حکومت کی۔ ۱۴ر محرم الحرام ۱۲۸۱ھ (۱۸ر جون ۱۸۶۴ء) کو نماز ظہر کے وقت نظر باغ کی کوٹھی میں انتقال کیا۔

روزانہ زندگی

ان کی زندگی اسلامیت کا نہایت پاکیزہ نمونہ تھی۔ تہجد اور ظہر کے سوا تمام نماز دن

---

(۱) کیا عظمت ہے کہ میں نے نواب جیسا دوسرا نہیں دیکھا۔ اگر یہ بات جھوٹی ہو تو مجھے شرک کا مجرم سمجھو۔

کیلئے گرمی ہو یا سردی پیدل مسجد میں جاتے، بارش میں بھی یہ پروگرام بدستور قائم رہتا۔ مستغیث راستے میں مل جاتا تو ساتھ لے آتے اور اس کا بیان سنتے۔ روزانہ مشاغل کی کیفیت یہ تھی: صبح کی نماز مسجد میں ادا کرتے اور اوراد و وظائف کا سلسلہ طلوع کے بعد تک جاری رہتا۔ نماز اشراق کے بعد تھوڑی دیر کیلئے دیوان خانے میں جاتے۔ پھر کبھی پالکی میں بیٹھ کر اور کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کرتے۔ بعد ازاں فنونِ سپہ گری کے استاد آجاتے۔ مثلاً بانک، پٹا، پھینک، رستم خانی، علی مدد، مگدر، نیزہ بازی، تیراندازی وغیرہ اور تھوڑی دیر تک ان فنون کی مشق جاری رہتی۔ مشق سے فارغ ہو کر خاصہ تناول فرماتے اور سپاہ کے متعلق رپورٹیں سنتے۔ دوپہر کے بعد قیلولہ کرتے۔ ظہر کی نماز ادا کر کے قرآن پڑھتے۔ سہ پہر کے وقت اہل کار طلب کر لیے جاتے اور خزانے کے کاغذات دیکھتے۔ رات کا کھانا کبھی نماز مغرب کے بعد اور کبھی نماز عشاء کے بعد کھاتے۔ نماز عشاء کے بعد حافظ کریم اللہ سے قرآن سنتے۔ پھر شاہنامہ پڑھا جاتا۔

شانِ عقیدت

سید صاحب سے عقیدت کے جو عملی ثبوت نواب وزیرالدولہ نے پیش کیے، کم از کم امراء کی صف میں اس کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ جہاد میں ہر ممکن امداد کی۔ سفر ہجرت میں ٹونک سے اجمیر تک سید صاحب کے ہم رکاب رہے۔ جب سنا کہ سرحد میں سید صاحب کو امامِ جہاد بنالیا گیا ہے تو نواب مرحوم نے معاً بیعت نامہ سید صاحب کی خدمت میں بھیج دیا اور عرض کیا کہ حکم ہو تو وہاں حاضر ہو جاؤں۔ سید صاحب نے روک دیا کہ تھوڑی دیر انتظار کیجئے۔ شہادت کے بعد سید صاحب کے اہل وعیال اور متعلقین کو باصرار ٹونک میں بلوالیا اور سید صاحب کی اہلیہ کی پالکی ایک میل کے فاصلے سے اپنے کندھے پر اٹھا کر لائے۔ تمام متعلقین کیلئے وظیفے مقرر کیے۔ سید صاحب کی بڑی صاحبزادی سیدہ

سائرہ کیلئے گیارہ ہزار کی جاگیر مقرر فرمائی۔ جماعت مجاہدین سے جتنے اصحاب ٹونک پہنچے ان سب کیلئے موزوں عہدے تجویز فرمادیے۔ جن اصحاب نے عہدے قبول نہ کیے، ان کیلئے وظیفے مقرر کردیے۔ جماعت مجاہدین کیلئے ایک الگ محلہ آباد کردیا، جو اَب تک ''محلہ قافلہ'' کے نام سے مشہور ہے۔

سید صاحب کے حالات

اس سے بھی قابل ستائش کارنامہ یہ ہے کہ جماعت مجاہدین میں سے جتنے اصحاب اپنے اپنے وطنوں میں واپس آگئے تھے، پے درپے قاصد بھیج کر انہیں ٹونک بلوایا اور اس کام پر مامور کردیا کہ سید صاحب کے متعلق تمام مستند حالات جمع ہوجائیں، چنانچہ سید صاحب کے بڑے بھانجے سید محمد علی سے ''مخزنِ احمدی'' مرتب کرائی، جو سفرحج کے اختتام تک سید صاحب کے حالات میں ایک مستند کتاب ہے۔ یہ کتاب ایک مرتبہ مطبع مفید عام آگرہ میں چھپ بھی گئی تھی۔ سید جعفرعلی نقوی نے ''منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء'' فارسی میں مرتب کردی، جو کم وبیش بارہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ علاوہ بریں مختلف مجاہدین روزانہ قافلے کی مسجد میں بیٹھ جاتے اور جس شخص کو جو حالات معلوم ہوتے، وہ بطور روایت بیان کرتا اور یہ روایت نقل کرلی جاتی۔ کسی کو اس روایت کے کسی حصے سے اختلاف ہوتا تو اس کا اختلاف الگ بطور روایت لکھ لیا جاتا۔ سید صاحب کے حالات کے متعلق مستند روایات کا یہ نہایت بیش بہا ذخیرہ ہے۔

خدمتِ حق

سید صاحب کی شہادت سے کچھ مدت بعد مولوی سید نصیرالدین دہلوی نے احیاءِ تحریک جہاد کی کوشش کی تھی اور مولوی صاحب موصوف بھی سید صاحب کی طرح مجاہدین کی ایک جماعت کے بعد دہلی سے سندھ پہنچ گئے تھے۔ وہاں کچھ مدت سندھ میں رہے۔ پھر

امیر دوست محمد خاں کی حمایت میں انگریزی فوج سے جنگ کی، جس نے شاہ شجاع کو تخت کابل پر بٹھانے کیلئے پیش قدمی کی تھی۔ بعد ازاں مولوی صاحب ستھانہ پہنچ گئے اور جماعت مجاہدین کی قیادت سنبھال لی۔ نواب وزیر الدولہ نے ان کی امداد میں بھی کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا تھا۔

وصایا

نواب وزیر الدولہ کے فرزند ارجمند یمین الدولہ وزیر الملک نواب محمد علی خاں بہادر صولت جنگ بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انگریزوں نے انہیں تین سال بعد مسند حکومت سے اتار کر بنارس بھیج دیا، اگرچہ اس عزل کے وجوہ بظاہر کچھ اور بتائے گئے۔ نواب وزیر الدولہ بڑے جید عالم تھے، اس کا اندازہ ان کی ضخیم کتاب ''وصایا الوزیر علی طریق البشیر والنذیر'' سے ہو سکتا ہے۔

اس کتاب میں سید صاحب اور جماعت مجاہدین کے بعض دوسرے اکابر کے متعلق بہت سی حکایتیں درج کی ہیں جو کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتیں۔ اگرچہ ملک کے سیاسی حالات نے انہیں اور بعض دوسرے مخلصین کو بے بس کر دیا تھا، لیکن دلی جذبات بعض اوقات بے اختیار زبان پر آجاتے تھے۔ ''وصایا'' میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ میرے والد (نواب امیر خاں) اور انگریزوں کے درمیان صلح کی گفتگو ہو رہی تھی تو سید صاحب نے پیشتر بتا دیا تھا کہ فلاں فلاں علاقے نواب کو ملیں گے، چنانچہ وہی علاقے ملے۔ اس حکایت میں لکھتے ہیں:

> ''درہنگامے کہ انگریز کفر انگیز و شرک ریز، یا بارِ خدایا بہ خدائی تو کہ سر و پایش ریزہ ریزہ، آمین بر پدرم لشکر کشی نمود۔(۱) الخ

---

(۱) ''وصایا'' حصہ دوم ص: ۱۲۹۔

پیکر اتباع

بہر حال نواب وزیر الدولہ بڑے ہی بلند پایہ بزرگ تھے۔ سید محمد علی نے ایک حکایت کے سلسلے میں چند شعر لکھے ہیں، جن میں نواب کے اخلاق کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ فرماتے ہیں:

زیں دو سہ ابیات کہ بنوشتہ ام ❁ مژدہ دہ احمدیاں گشتہ ام
خاصہ بہ نواب ملائک مآب ❁ بر فلکِ شرعِ نبیؐ آفتاب
شمعِ ہدیٰ زو شدہ افروختہ ❁ خرمنِ بدعت شد ازو سوختہ
سنتِ احمد شدہ زو مستقیم ❁ بدعت ازو شد بہ جہنم مقیم
سایۂ او تا بہ دمِ نفخِ صور ❁ یارب ازیں خاک نہ سازی تو دور

مختلف بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب ممدوح بہت کثیر الدعاء تھے۔ ہر کام کے آغاز وانجام پر دعاء کرتے۔ بعض اوقات دربار میں دعاء کی ضرورت پیش آجاتی، خود اٹھتے "دوگانہ" ادا کر کے دعاء کرتے یا قبلہ رخ کھڑے ہو کر مصروف دعاء ہو جاتے، اس موقع پر درباریوں کو تاکید تھی کہ قواعد دربار کے مطابق کوئی جگہ سے نہ اٹھے اور جہاں بیٹھا ہے، بیٹھا رہے۔

سولہواں باب:

سید قطب علی اور سید جعفر علی

مجھوا میر ضلع بستی (یوپی) وطن، متوسط درجے کے زمیندار تھے۔ شیخ محمد اسحاق گورکھپوری کے بیان کے مطابق علم وفضل اور زہد وتقویٰ میں ان کا پایہ بلند تھا۔ سید صاحب نے شیخ اسحاق کو خلافت دینی چاہی تو انہوں نے قلتِ علم کے عذر کی بنا پر سید قطب علی ہی کا نام لیا تھا۔ اس دریائے فیض نے بے تکلف فرمایا کہ سید موصوف کو بھی لے آؤ۔

قطب علی سترہ آدمیوں کو لے کر سید صاحب کے پاس اس زمانے میں تکیہ شریف پہنچے جب آپ حج سے واپس آئے تھے۔ اس قافلے میں ان کے چھوٹے بیٹے سید حسن علی بھی شامل تھے۔ بڑے بیٹے سید جعفر علی، صاحب ''منظورۃ السعداء'' اس وقت لکھنؤ میں تعلیم پارہے تھے، وہ علالت کے باعث ساتھ نہ جاسکے۔ سید قطب علی بہت کبیر السن تھے۔ رائے بریلی سے ایک کوس کے فاصلے پر زحمتِ سفر کے باعث بیمار پڑ گئے۔ تکیہ شریف پہنچے تو ان کی مہمان داری سید صاحب کے بھتیجے سید محمد یعقوب کے سپرد ہوئی۔ ایک مہینہ ٹھہرے رہے، پھر سید صاحب نے مولانا عبدالحئی سے خلافت کی سند لکھوادی۔

سید صاحب کی شہادت کا غم

قصد ہجرت کی شہرت ہوئی تو سید قطب علی بھی معیت کیلئے تیار ہوگئے۔ سید صاحب نے ضعیفی کے پیش نظر انہیں روک دیا اور فرمایا کہ دعاء کرتے رہیے اور ہمارے بلاوے کا انتظار کیجئے۔ امتثالِ امر میں وہ رک گئے۔ سید صاحب کی شہادت کی خبر سن کر بہت

روئے۔ مولوی جعفر علی نقوی کا بیان ہے کہ بار بار فرماتے تھے: کاش میرا بیٹا (سید جعفر علی) مر جاتا اور سید صاحب زندہ رہتے۔ نیز فرماتے تھے کہ سید صاحب کے ہاتھوں غلبۂ اسلام دیکھنے کی آرزو تھی، اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ مولوی سید جعفر علی کے بیان کے مطابق انہوں نے فرمایا:

> ”تمنا بود کہ اللہ تعالیٰ از دست حضرت امیر المومنین کفار نگونسار را از یں دیار پاک کردہ شوکتِ اسلام معائنہ نماید۔ چوں جناب ممدوح در دنیا نہ ماندند، ما ہم اگر مردیم چہ غم است۔“

ترجمہ: آرزو تھی کہ اللہ تعالیٰ حضرت امیر المومنین کے ہاتھوں اس سرزمین کو کافروں سے پاک کرے اور اسلام کا غلبہ دکھائے۔ امیر المومنین زندہ نہ رہے، مجھے بھی موت آ جائے تو کیا غم ہے۔

وفات

غالباً ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۳ء) میں وفات پائی۔ آخری وقت میں متعلقین کو جو وصیتیں کیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ توحید پر قائم رہو اور سنت کا اتباع کبھی نہ چھوڑو۔

۲۔ میرے بعد کسی بدعت کا ارتکاب نہ ہونے پائے، ورنہ قیامت کے دن تم سے مواخذہ کروں گا۔

۳۔ میرے مرنے پر نہ نوحہ کیا جائے، نہ سوم یا کوئی دوسری رسم منائی جائے۔

سید جعفر علی

مولوی سید قطب علی کے فرزند اکبر تھے۔ ۱۲۱۰ھ میں بمقام مجھوا میر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں پائی۔ لکھنؤ جا کر علوم کی تکمیل کی۔ والد ماجد اور چھوٹا بھائی سید

حسن علی تکیہ شریف جا کر بیعت کر چکے تھے۔ سید جعفر علی بوجہ علالت نہ جا سکے۔ کچھ مدت بعد سید صاحب بغرض جہاد رائے بریلی سے سرحد چلے گئے اور سید جعفر علی کو شرف لقاء بھی حاصل نہ ہوا۔

باپ اور بھائی کی محبت میں ان پر بھی سید صاحب کا رنگ چڑھ گیا۔ اس کے بعد دونوں بھائیوں میں سبقت بالخیر کیلئے کشاکش شروع ہوگئی۔ والدین کبیر السن تھے، دو بھائیوں کے سوا گھر میں کوئی نہ تھا جو اُن کی خبر گیری کرتا۔ بڑے کا اصرار تھا کہ چھوٹا گھر پر خبر گیری کیلئے موجود رہے اور میں جہاد کیلئے جاؤں۔ چھوٹا بار بار کہتا تھا کہ بڑے کو والدین کی خدمت میں رہنا چاہیے اور مجھے جہاد کیلئے جانے کی اجازت دی جائے۔ آخر چھوٹے بھائی نے یہ معاملہ آخری فیصلے کی غرض سے بوڑھی والدہ کے سامنے پیش کر دیا۔ اس خدا دوست خاتون نے کہا جو جانا چاہے اسے روکا نہیں جا سکتا، جو نہ جائے وہ گناہ گار ہوگا۔ تم دونوں بھائی آپس میں فیصلہ کر دو، ہم اپنی عاقبت کیوں خراب کریں۔

قطعی فیصلہ

اس اثناء میں سید جعفر علی کو ایک مقدمے کے سلسلے میں گورکھپور جانا پڑا۔ وہاں سے لوٹے تو ان کے استاد مولوی حیدر علی کا خط آیا پڑا تھا کہ فقیر محمد خاں رسالدار کو ردِ روافض میں بعض رسائل و کتب کی تصحیح کیلئے ایک آدمی کی ضرورت ہے۔ یہ خدمت قبول کر لو۔ لیکن سید جعفر علی سید صاحب کی خدمت میں پہنچنے کا عزم صمیم کر چکے تھے، اس لئے مولوی حیدر علی کو معذرت لکھ بھیجی پھر منت سماجت سے چھوٹے بھائی کو خدمت والدین کے لئے ٹھہرے رہنے پر راضی کر لیا اور خود جانے کیلئے تیار ہو گئے۔ گھر میں غلہ بہت تھا، لیکن نقد روپے زیادہ نہ تھے۔

انکی شادی ہو چکی تھی۔ گویا والدین کے علاوہ عیالداری کی زنجیر بھی انکے پاؤں میں پڑ چکی تھی، لیکن سلطانِ فرض کے حکم کی بجا آوری میں انہوں نے علائق کے تمام رشتوں

سے بے تکلف انقطاع اختیار کر لیا۔ بھائی کے سوا کسی کو ان کے حقیقی ارادے کا علم نہ تھا۔

روانگی

گورکھپور میں مقدمے کی پیروی کیلئے انھیں وقتاً فوقتاً جانا پڑتا تھا، دل میں طے کر لیا کہ وہیں سے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ گھر میں صرف ایک گھوڑا تھا، اسی پر حسب ضرورت والد یا دونوں بھائی سوار ہوتے تھے، چنانچہ بظاہر مقدمے کی پیروی کے لئے گورکھپور روانہ ہوئے، گھوڑے کی دیکھ بھال کیلئے ایک ملازم کو ساتھ لے لیا، رخصت ہوتے وقت والد ماجد سے عرض کیا کہ ''دعاء فرمایئے اللہ تعالیٰ مجھے فتح و نصرت سے واپس لائے''۔ انھوں نے سمجھا کہ مقدمے میں کامیابی کیلئے دعا کے طلب گار ہیں، چنانچہ انھوں نے دعاء کی۔ یوں صاحب عزم بیٹا والدین اور گھربار سے رخصت ہوا اور اس منزلِ دشوار میں اس نے قدم رکھا جہاں سے زندہ آنے کی امید موہوم تھی، بھائی چھ کوس تک گیا، اپنی بندوق پیش کی، سید جعفر علی نے کہا اسے اپنے پاس رکھو، مجھے خدا اور دیدے گا، بھائی نے روتے ہوئے کہا کہ جب آپ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جدا ہو رہے ہیں تو دنیا کی دولت میرے لئے کیا حقیقت رکھتی ہے؟ سید جعفر علی نے اسے تسلی دی اور وصیت فرمائی کہ والدین کی خدمت میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھنا۔

سید جعفر علی نے اپنے بعض ہم مشرب دوستوں کو پہلے سے اطلاع دے رکھی تھی اور فیصلہ یہ ہوا تھا کہ تمام دوست مقررہ تاریخ پر ایک خاص جگہ جمع ہو جائیں۔ سید جعفر علی کا بھائی چلا گیا تو ان کے ایک دوست شیخ داراب مل گئے اور دوسرے دوستوں کے انتظار میں دونوں نے اکٹھے سفر شروع کیا۔

راہِ حق میں پہلا قدم

عجیب بات یہ ہے کہ انسان راہِ خدا میں قدم اٹھاتا ہے تو اکثر ابتدا ہی میں امتحان کی

سختیاں پیش آجاتی ہیں، یہ غالباً قدرت کی طرف سے تربیت کا ساز و سامان ہوتا ہے۔ سید جعفر علی گھر سے نکلے تھے تو برسات کا موسم تھا، دریا اور ندی نالے طغیانی پر تھے، اس وجہ سے مرور و عبور سخت مشکل تھا، طرفہ یہ کہ سفر کی پہلی ہی رات آشوب چشم کا عارضہ شروع ہو گیا اور اتنا شدید درد ہوا کہ رات بھر ایک لمحے کیلئے سو نہ سکے۔ رات موضع میر گنج میں گزاری، صبح اٹھے تو گھوڑا نوکر کو دے کر واپس کر دیا تاکہ والد اور بھائی کو تکلیف نہ ہو، خود گورکھپور پہنچ گئے۔

دعوت و ایثار

اتفاق سے اسی زمانے میں انگریزوں نے ایک رسالے کو چھ مہینے کی تنخواہ انعام میں دے کر توڑ دیا تھا اور اس کے سوار نوکری سے فارغ ہو کر گورکھپور میں جمع تھے۔ ان میں سے بعض سید جعفر علی کے دوست تھے۔ سید موصوف نے معاً انھیں راہِ حق کی دعوت دی اور کہا کہ تم لوگ دنیا کی نوکری سے الگ ہو گئے ہو، آؤ اب گھوڑے اور ہتھیار لے کر اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔

ان میں سے نجیب خاں نام ایک شخص کے پاس چار گھوڑے تھے، اس نے ایک گھوڑا فی سبیل اللہ سید جعفر علی کے حوالے کر دیا، دو گھوڑے بیچ کر ان کی رقم ضروری مصارف کے لئے گھر میں دیدی، چوتھا گھوڑا اپنی سواری کیلئے رکھ لیا اور بولا کہ چند ضروری کام کر کے میں بھی روانہ ہو جاؤں گا، اگر آپ پہلے پہنچے تو سید صاحب کو میرا سلام پہنچا دینا، اگر میں پہلے پہنچا تو آپ کا سلام پہنچا دوں گا۔

سید جعفر علی نے اپنی کچھ چیزیں پانچ روپے میں فروخت کیں، ایک اور شخص رفاقت کے لئے تیار ہو گیا، لیکن بولا میرے پاس سواری نہیں اور پیدل چل نہیں سکتا، سید جعفر علی نے نجیب خاں کا دیا ہوا گھوڑا اس کے حوالے کر دیا۔

سترہواں باب:

سید جعفر علی اور سفر کی صعوبتیں

غازی پور اور جون پور

ایک چھوٹی سی کشتی میں دریا عبور کر کے گوپال پور پہنچے، جہاں تمام دوستوں کو جمع ہونا تھا اور پانچ روز وہاں ٹھہرے رہے، پھر دریائے گھاگرا سے پار اتر کر مبارک پور ہوتے ہوئے محمد آباد مئو گئے، وہاں سے قریب ہی سید جعفر علی کے خالو تھانیداری کے عہدے پر مامور تھے، انھیں خبر نہ ہونے دی کہ مبادا رکاوٹ پیدا کریں۔ بہادر گنج اور قاسم آباد کے راستے غازی پور پہنچ کر شیخ فرزند علی کی مسجد میں مقیم ہو گئے جو سید صاحب کے خلیفہ تھے۔ شیخ صاحب انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے، دو ہفتے اپنے پاس ٹھہرائے رکھا، روانگی کے وقت ایک سو روپے نقد اور ایک یابو پیش کیا، نیز چودہ آدمیوں کیلئے ہتھیاروں کا انتظام فرما دیا، شیخ صاحب کے بیٹے شیخ امجد علی پہلے سے سید صاحب کے ساتھ تھے، ان کے لئے کپڑے، بانات کی ایک چادر اور ایک خط دیا۔

غازی پور سے بھیتری اور کراکت کے راستے جونپور پہنچے۔ شہر سے باہر تھانیدار نے روک لیا اور پوچھا کہ ہتھیار لگا کر جا رہے ہو، ضامن کے بغیر جانے نہ دوں گا۔ سید جعفر علی نے کہا کہ شہر میں جا کر شیخ کرامت علی کی ضمانت دیدیں گے۔ شیخ کا نام سن کر تھانیدار نے اجازت دیدی۔ وہ شیخ کرامت علی کی مسجد میں ٹھہرے۔ شیخ نے موضع منڈیاہو سے ایک اونٹ منگوا کر قافلۂ مجاہدین کی نذر کر دیا، وہاں دو تین اور غازی مل گئے۔ اس اثناء میں سید

جعفر علی کے والد کو اطلاع مل چکی تھی کہ ان کا بیٹا گورکھپور نہیں گیا، بلکہ جہاد کیلئے سید صاحب کے پاس جا رہا ہے۔ وہ بعض دوسرے عزیزوں کو ساتھ لے کر پیچھے نکل پڑے اور جونپور میں ان سے آ ملے۔ اصرار کیا کہ واپس چلو، پھر ہم سب مع قبائل سید صاحب کے پاس جانے کیلئے تیار ہو جائیں گے، لیکن سید جعفر علی نے یہ تجویز نہ مانی اور کہا کہ مع قبائل اس وقت جانا مناسب ہوگا جب امیرالمومنین مع قبائل طلب فرمائیں گے۔ غرض سید صاحب موصوف نے منت سماجت سے والد اور دوسرے عزیزوں کو راضی کر کے واپس بھیج دیا۔

شیخ غلام علی الٰہ آبادی

جون پور سے یہ قافلہ مچھلی شہر اور مئو ہوتا ہوا مہروڑا پہنچا جو شیخ غلام علی الٰہ آبادی کا وطن تھا۔ شیخ نے معمول کے مطابق خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ رخصت کے وقت مجاہدین کی خدمت میں مختلف قسم کے ہتھیار مثلاً تلواریں، کٹاریں اور ڈھالیں، ان کے علاوہ جاجم، دیگچے، طباق، پیالے وغیرہ پیش کیے۔ نقد رقم بھی دی ہوگی جس کی مقدار معلوم نہ ہو سکی۔ شیخ صاحب ان دنوں سخت پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ مہاراجہ بنارس نے ان پر گرانقدر رقم بطور تاوان ڈال دی تھی اور ان کا بڑا لڑکا اس عہد کے نوجوان امیروں کی طرح آزادانہ روش اختیار کر چکا تھا۔

گتنی، کان پور اور قنوج

مہروڑا سے یہ لوگ گتنی پہنچے، جہاں امجد خاں سے ملاقات ہوئی۔ وہ مستورات کے قافلے کو ٹونک پہنچا کر واپس آئے تھے۔ سید صاحب کے عزیز سید محمد ظاہر بھی تکیہ شریف سے امجد خاں کی ملاقات کیلئے آئے ہوئے تھے۔ خان نے اپنا یابو مجاہدین کی خدمت میں

پیش کر دیا۔ پالان شتر کی درستی کیلئے ایک دن گنی میں گزار کر یہ لوگ کڑا اور فتح پور ہوتے ہوئے کان پور میں وارد ہوئے۔ وہاں چنگی کے دو مسلمان کارکنوں نے قافلے کا سامان روک لیا۔ ایک ہندو کارکن مصری لال نے جو سید جعفر علی کے چچا سید احمد علی کا دوست تھا، سامان چھڑا لیا۔

کان پور میں یہ قافلہ چار روز مقیم رہا۔ سید جعفر علی اس شخص کو ساتھ لے لیتے تھے جو جہاد کیلئے آمادگی ظاہر کرتا تھا۔ کان پور میں الٰہی بخش نام کا ایک شخص ساتھ ہو گیا۔ اس نے اہل قافلہ کو بڑی پریشانیوں میں مبتلا کیا۔ یہ لوگ قنوج پہنچ کر سید اولاد حسن سے ملے، جو اسی زمانے میں سرحد سے واپس آئے تھے۔ میر احمد علی رئیس قنوج نے سید صاحب کے لئے ایک نہایت عمدہ تلوار سید جعفر علی کے حوالے کی۔ ان سے الٰہی بخش کے حالات پوچھے تو جواب ملا کہ یہ شخص مفسد ہے اور ضرور کوئی فتنہ برپا کرے گا۔

سید جعفر علی نیک طبعی کے باعث گھوڑا اس کے حوالے کر چکے تھے۔ سردی کا موسم شروع ہو گیا تھا، اس لئے قنوج میں مولوی صاحب نے اپنے ساتھیوں کیلئے لحاف بنوائے۔ قنوج سے مین پوری ہوتے ہوئے محمود گنج پہنچے۔ سید جعفر علی نے لکھا ہے کہ بہت سے ساتھی بیمار ہو گئے تھے اور ان میں سے بعض ساتھ نہ چل سکتے تھے۔ ایک بیمار کو قنوج میں چھوڑا، دوسرے کو یابو پر سوار کر کے مین پوری پہنچایا۔ جن بیماروں کو ساتھ لے لیا تھا وہ بھی زیادہ دور چلنے سے معذور تھے۔ سید جعفر علی نے ایک شخص کو یہ پیغام دے کر مین پوری بھیج دیا کہ وہاں کے بیمار کی بخوبی دیکھ بھال کی جائے۔ خود یابو لے کر لوٹے کہ قنوج والے بیمار کو سوار کرا لائیں۔ عین اس موقع پر الٰہی بخش نے آنکھیں پھیر لیں اور بولا: تمہارے ساتھی بہت برے ہیں۔ میں الگ ہوتا ہوں۔ میری آرزو تھی کہ ایک ہزار کا قافلہ تیار کرتا۔ ان لوگوں کے ساتھ گھوڑے، اونٹ اور قیمتی اسلحہ ہوتے، لیکن تمہیں منظور نہیں۔ سید جعفر علی کے رفیقوں میں سے منصور خاں بہت قوی تھا، اس نے کہا کہ اگرچہ

بیمار ہوں، لیکن اسے پکڑ لوں تو ہڈیاں توڑ ڈالوں۔ سید صاحب نے ہاتھا پائی سے روک دیا، لیکن رفیقوں نے کہہ دیا یہ ہمارا ساتھی نہیں، خواہ مخواہ ہمیں ایذا پہنچاتا ہے۔

غرض سید صاحب رفیقوں کی بیماری کے باعث آہستہ آہستہ چلے۔ الٰہی بخش گھوڑا دوڑاتا ہوا آگے نکل گیا اور محمود گنج کی مسجد میں جا اترا۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ میں قافلہ مجاہدین کا سالار ہوں۔ پیچھے ایک مولوی آ رہا ہے، اسکے ساتھی بیمار ہیں۔ انہیں مسجد میں نہ ٹھہرنے دینا۔ چنانچہ سید جعفر علی بیماروں کے ساتھ محمود گنج پہنچے تو لوگوں نے مسجد میں اترنے سے روک دیا اور انہیں چھ آنے یومیہ کرائے پر سرائے میں حجرے لینے پڑے۔

آزمائش در آزمائش

سید جعفر علی کا گھوڑا اور میر احمد علی رئیس قنوج کی دی ہوئی تلوار الٰہی بخش کے پاس تھی۔ اب مولوی صاحب نے تلوار مانگی تو اس نے جھگڑا شروع کر دیا۔ آخر میں پھر بولا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جاتا۔ میں چاہتا تھا کہ کم از کم ایک ہزار جوانوں کا قافلہ تیار ہو جائے۔ سب کے پاس قیمتی ہتھیار، گھوڑے اور اونٹ ہوں، لیکن تمہیں یہ منظور نہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے کوئی ہتھیار دے دو تو چلا جاؤں۔ دو تلواریں تھیں۔ ان میں سے ایک اس کے حوالے کر دی۔ وہ بھری ہوئی بندوق کا منہ سید جعفر کی طرف کر کے لڑنے کے لئے تیار ہو گیا۔ بڑی مشکل سے یہ مصیبت ختم ہوئی۔

ساتھیوں کی بیماری کم پریشانی کا باعث نہ تھی۔ محمود گنج پہنچ کر رکن الدین کو سرسام ہو گیا۔ سید جعفر علی رات دن اسکی خدمت کرتے تھے، ایک رات وہ اچانک اٹھ کر باہر نکل گیا۔ بہتیرا تلاش کیا، کچھ پتا نہ چلا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایک کنوئیں میں جاں بحق ہو گیا۔

یہ سکیت ہوتے ہوئے بھیکم پور پہنچے تو وہاں کے رئیس داؤد خاں نے دو گھوڑے اور پچیس روپے بطور نذر پیش کیے۔ ایک یابو اُن کی ہمشیر نے دیا۔ وہاں سے چلے تو خورجہ

کے قریب ایک ویرانے میں ٹھہرے جہاں مسجد اور کنواں تھا۔ اشیائے خوردنی کیلئے آدمی بازار بھیجا تو وہاں کا ایک زمیندار دوست خاں آگیا اور پورے قافلے کو ساتھ لے گیا۔ بڑی تواضع سے پیش آیا، وہاں سے چند منزل طے کر کے دہلی پہنچے۔

قیامِ دہلی

دہلی میں خاصی دیر ٹھہرے رہے۔ شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب سے ملاقات کی تو معلوم ہوا کہ ایک قاصد جنگ زیدہ میں سید صاحب کی کامیابی کی خبر لایا ہے۔ قافلے کے پاس نقد روپے کم تھے، اسلئے دو یابو فروخت کیے۔ ان کی قیمت سے کچھ قرابینیں بنوالیں۔ وہاں ایک جوان نے آکر کہا کہ میں سیٹھ کا بیٹا ہوں اور شاہ اسحاق کے ہاتھ پر مسلمان ہو کر جہاد کیلئے جانا چاہتا ہوں۔ سید جعفر علی نے اسکی خوب خاطر داری کی۔ اپنی دُلائی اوڑھنے کیلئے اسے دیدی۔ وہ دلائی لیکر بھاگ گیا اور اسے بیچ کر پیسے جوے میں ہار دیے۔

دہلی سے نوروز بیگ نام ایک شخص کو پندرہ روپے پر رہبری کیلئے ساتھ لے لیا۔ وہاں سے سونی پت، پانی پت اور انبالہ کا راستہ اختیار کیا۔ سونی پت میں ایک شخص بندوق، تلوار اور کچھ سامان لے کر بھاگ گیا۔ سردھنہ میں وہ پکڑا گیا۔ چوری ثابت ہوگئی، لیکن مال نہ ملا۔

انبالہ

انبالہ میں سید جعفر علی نے وہاں کے ایک رئیس شمس الدین سے ملاقات کی تاکہ محفوظ راستے کے بندوبست میں مدد مل سکے۔ مولوی صاحب نے انگرکی دگلا اور سبز دستار پہن رکھی تھی۔ کمر میں تلوار لٹک رہی تھی۔ شمس الدین شطرنج کھیل رہا تھا۔ مولوی صاحب کی ظاہری وضع دیکھ کر سمجھا کہ کوئی ان پڑھ آدمی ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ شطرنج جائز نہیں۔ شمس الدین نے جواب دیا کہ امام شافعی کے نزدیک جائز ہے:

مولوی صاحب: چاروں ائمہ کے نزدیک ناجائز ہے۔ امام شافعی نے پہلے جواز کا فتویٰ دیا تھا، پھر اس سے رجوع کیا۔

شمس الدین: تم حنفی ہو یا شافعی؟

مولوی صاحب: آپ کو اس سے کیا غرض؟ مسئلے کی صحیح صورت میں نے عرض کردی۔

شمس الدین: میرے مکان سے نکل جاؤ۔

مولوی صاحب: بہتر! میں نے تو خیر خواہی سے ایک شرعی بات بتائی تھی۔

غرض مولوی صاحب لوٹ گئے۔ دوسرے روز مسجد میں دوبارہ ملاقات ہوئی اور شمس الدین مولوی صاحب کے ایک ساتھی منصور خاں کی طرف متوجہ ہوا، جو بہت وجیہ تھا۔ اس نے کہا کہ مولوی صاحب سے بات کیجئے۔ اس وقت شمس الدین نے اپنے سابقہ طرز عمل پر معذرت کی اور غور و مشورہ کے بعد تجویز کیا کہ پٹیالہ، مالیر کوٹلہ، جگراؤں اور ممدوٹ کا راستہ اختیار کیا جائے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے اپنے قافلے کے ساتھ یہی راستہ اختیار کیا۔

اٹھارہواں باب:

پٹیالہ سے سرحد

پٹیالہ اور ممدوٹ

ریاست پٹیالہ کے ایک گاؤں میں قافلے کے ایک آدمی نے بندوق سے مور شکار کیا۔ گاؤں کے لوگ لاٹھیاں لے کر نکل آئے اور بڑا ہنگامہ بپا ہوا۔ اہل قافلہ کو علم نہ تھا کہ ریاست کے حدود میں مور کا شکار ممنوع ہے۔ بڑی مشکل سے یہ مصیبت ختم ہوئی۔ ممدوٹ پہنچے تو وہاں نواب قطب الدین اس زمانے میں رئیس تھا۔ اس کے بھائی شمس الدین کی معرفت درخواست کی گئی کہ دریائے ستلج سے پار اترنے کا بندوبست کر دیجئے۔ تیسرے روز نواب سے ملاقات ہوئی تو اس نے صاف جواب دے دیا اور بولا کہ اس طرح میں سکھوں کی سرکار میں بدنام ہو جاؤں گا۔ ناچار سید جعفر علی نے ممدوٹ سے بہاول پور کا قصد کر لیا۔ راستے میں تبارک اللہ نام ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی جو رئیس ممدوٹ سے ناراض ہو کر ریاست بہاول پور کے حدود میں جا بیٹھا تھا۔

بہاول پور

بہاول پور میں مولانا عبدالحیؒ کے ایک شاگرد مولانا محمد کامل تھے، جنہیں اس بنا پر ہندستانیوں سے ملاقات کی ممانعت کر دی گئی تھی کہ حیات انبیاء کے مسئلے پر وہ عام بہاول پوری علماء سے مختلف الرائے تھے اور کہتے تھے کہ انبیاء اور علماء یقیناً عنداللہ زندہ ہیں، لیکن ان کیلئے حیات دنیا ثابت کرنا محال ہے۔

سید جعفر علی کو اتفاقیہ ان سے ملاقات کا موقع مل گیا۔ نیز ان کے بیٹے محمد اکمل سے ملاقات کی۔ انہیں کے مشورے سے یہ قرار پایا کہ احمد پور شرقیہ ہوتے ہوئے تونسہ جانا چاہیے۔ احمد پور شرقیہ میں امین شاہ اور احمد شاہ سے بھی ملاقات کی تاکید کی۔ سید جعفر علی نے لکھا ہے کہ بہاول پور میں ہر جگہ گیارھویں شریف اور دوسرے محدثات کا دور دورہ تھا، لیکن تمام پڑھے لکھے آدمی محمد کامل کا نام احترام سے لیتے تھے۔ بہاول پور سے تین منزل پر نور پور میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جنکی داڑھی اور موچھیں وزیر ریاست نے اس وجہ سے منڈوادی تھیں کہ وہ اتباع سنت پر زور دیتے تھے۔

تونسہ

غرض قافلے نے بھکر پہنچ کر دریا عبور کیا۔ ڈیرہ غازی خاں میں شیخ نور علی جون پوری سے ملاقات ہوئی۔ وہاں سے براہ بادیہ تونسہ پہنچے اور وقت کے عظیم المرتبت شیخ خواجہ سلیمان تونسوی سے ملاقات کی۔ سید جعفر علی لکھتے ہیں:

> خواجہ صاحب فرش پر بیٹھے تھے۔ چاروں طرف لوگوں نے حلقہ باندھ رکھا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ کسی واقف کار رہبر کے ذریعے سے آگے پہنچا دیجیے۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ ارادہ ٹھیک نہیں۔ راستہ خطرناک ہے، سکھوں کی فوج کے آدمی چھاپے مار رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں پڑنا منع ہے۔

خواجہ سلیمان سے گفتگو

ساتھ ہی فرمایا: لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ۔ میں نے عرض کیا کہ اس آیت کا مضمون میں خوب سمجھتا ہوں۔ یہ راہ خدا میں خرچ کرنے کے متعلق آئی ہے۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ میں نے اجیر کی درخواست کی تو خواجہ صاحب نے فرمایا:

> اجیر نایاب ہے۔ لوگ پریشان حال ہیں۔ دشمنوں کے ہاتھ سے بچ نہیں

سکتے۔ نہ آگے جانے کی صورت ہے، نہ پیچھے ہٹنے کی اور نہ ٹھہرنے میں محفوظ رہنے کی کوئی امید ہے۔

سید جعفر علی: آپ کیا کریں گے؟

خواجہ صاحب: میں پہاڑوں میں چلا جاؤں گا۔

سید جعفر علی: ہمیں بھی ساتھ لے لیجئے۔

خواجہ صاحب: بلوچ تمہیں مار ڈالیں گے۔

سید جعفر علی: جنگل کا راستہ بتا دیجئے۔

خواجہ صاحب: جنگل میں پانی نہ ملے گا اور ہلاک ہو جاؤ گے۔

پھر فرمایا: بہتر یہ ہے کہ بہاول خاں رئیس بہاول پور کی نوکری کر لو۔ راستہ صاف ہو جائے گا تو آگے چلے جانا۔ ساتھیوں میں سے نوروز بیگ اس کیلئے تیار ہو گیا، لیکن سید جعفر علی نے صاف صاف عرض کر دیا کہ ہم لوگ نوکری کیلئے نہیں، جہاد فی سبیل اللہ کے لئے آئے ہیں۔ ہمیں راستہ بتا دیجئے اور رہبر دے دیجئے۔ ہم رات کے وقت نکل جائیں گے۔ فرمایا: اس کا انتظام نہیں ہو سکتا۔

رہبر اور سامانِ سفر

مایوسی کے بعد سید جعفر علی نے بطور خود آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ تونسہ سے پانچ کوس آگے موضع کسرانی میں پہنچے تو ایک سید سے ملاقات ہوئی۔ وہ قافلے کو اپنی مسجد میں لے گیا۔ خاطر تواضع کی۔ پھر دو بلوچوں کو لایا۔ اپنی ڈاڑھی ان کے ہاتھ میں دے کر سید جعفر علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: یہ سید ہے، اسے اور اس کے ساتھیوں کو بحفاظت منزلِ مقصود پر پہنچانے کا حلف اٹھاؤ۔ گویا اس سید کی مہربانی سے قدم آگے بڑھانے کا انتظام ہوا۔

رہبروں کا انتظام ہو گیا تو سفر کی تیاری شروع کر دی۔ قافلے میں روزانہ سولہ سیر آٹا خرچ ہوتا تھا۔ سید جعفر علی نے بیس سیر آٹا خریدنے کیلئے رقم آدمی کے حوالے کر دی۔ اس لیے کہ دو بلوچ رہبروں کے اضافے کے باعث خرچ بڑھ گیا تھا۔ وہاں اتفاقیہ نزاع کی صورت پیدا ہو گئی اور پانچ سیر سے زیادہ آٹا نہ مل سکا۔ سید جعفر علی زاد راہ سے بالکل بے پرواہ ہو کر چلنے کیلئے تیار ہو گئے۔ ایک گھوڑے اور ایک یابو پر سامان رکھا، ایک گھوڑا اور ساتھ تھا۔ لکھتے ہیں: میں نے نیت کر لی تھی کہ ساتھیوں میں سے جو تھک جائے گا اسے سوار کرادوں گا۔ خود پیدل چلوں گا۔

کمال ہمت وعزیمت

اب راہ حق کے ان مسافروں کی حالت کا تصور کیجئے۔ کھانے پینے کو کوئی چیز ساتھ نہیں، منزل نہایت کٹھن، راستہ کوہستانی یا صحرائی، جہاں دور دور تک کھانے پینے کو کچھ نہ ملتا تھا۔ ہر وقت سکھوں کے حملے کا خطرہ تھا، جن کے جیش گھاس چارے کیلئے مسلسل ان حصوں میں گردش کرتے رہتے تھے۔ سید جعفر علی بار بار اپنے ساتھیوں سے کہتے کہ بھائیو! ہمت کرو۔ ہم انیس آدمی ہیں اور مسلح ہیں۔ سکھوں سے مڈبھیڑ ہو جائے گی تو انہیں مار کر گھوڑے اور اونٹ لے لیں گے پھر دو دو منزلیں ایک ایک دن میں طے کر کے امیر المومنین کے پاس پہنچ جائیں گے۔

سفر کی صعوبتیں

چلے تو مطلع ابر آلود تھا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں راستے میں ادا کیں۔ پھر بادل چھٹ گئے اور چاند نکل آیا۔ ایک جگہ بیریوں کے درخت تھے۔ وہاں سے پکے ہوئے بیر چنے۔ کچھ کھا لیے اور کچھ ساتھ لے لیے۔ رات باقی ہی تھی کہ ایک گاؤں میں پہنچے، جسے سکھ جلا کر راکھ بنا چکے تھے۔ مسجد کے صحن میں ایک بے آب حوض

پر ٹھہرے۔ تیمم سے صبح کی نماز ادا کی۔ رہبروں نے اِدھر اُدھر پھر کر دو تین گڈریوں سے تھوڑا سا پانی لیا، کھانا تیار کیا اور کھا کر تھوڑی دیر کیلئے سو گئے۔ اسی دوران میں بارش شروع ہوگئی۔ برتنوں میں بارش کا جو پانی جمع ہوا تھا، وہ ساتھ لے لیا، اور مزید بارہ کوس کی مسافت طے کر کے ظہر کے وقت ایک دریا پر پہنچے۔ (۱)

وہاں سے رہبر ایک پہاڑی راستہ بتا کر واپس چلے گئے۔ مجاہدین نے کچھ منزل طے کر لی تو راستے کا نشان گم ہوگیا۔ ایک جگہ دیکھا کہ کوئی شخص جانور چرا رہا ہے۔ راستہ پوچھنے کیلئے اس کی طرف پلٹے تو وہ اس خیال سے ریوڑ چھوڑ کر بھاگ گیا کہ یہ لٹیرے ہیں۔ پھر ایک گائے کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے اور ایک آبادی میں پہنچے۔

اس سلسلے میں سید جعفر علی نے اپنے سفرنامے میں جن مقامات کا ذکر کیا ہے، یہ ہیں:

اوچھ کوہی، مروت، چوڑواں (۲)، درہ بند، لونی، کوٹلہ مریز خاں، عیسیٰ خیل، کالا باغ۔

اوچھ کوہی سے سولہ سیر آٹا، بارہ سیر دانہ اور گھاس خریدنی چاہی، وہاں کے ملا نے گھاس مہیا کر دی اور کھانا بھی کھلایا، نیز نصیحت کی کہ آگے رہزن ملیں گے، ان سے کہنا کہ ہم سید ہیں۔ چنانچہ راستے میں کئی جگہ مشتبہ آدمیوں سے سابقہ پڑا۔ ایک رات چوڑواں میں بسر کی۔ درہ بند میں ایک ملا نے بڑی تواضع کی۔ اس مقام اور کوٹلہ مریز خاں کے درمیان لونی کے علاوہ دو منزلوں کا ذکر آیا ہے۔ لونی سے جو رہبر ساتھ لیا تھا، اس کا نام ابوبکر صدیق تھا۔ اس سے اگلے دو مقاموں کے رہبروں کے نام بالترتیب عمر خطاب اور عثمان غنی تھے۔ عیسیٰ خیل کے رئیس احمد خاں نے بڑی خاطر تواضع کی۔ ایک رات راستے میں گذار کر کالا باغ پہنچ گئے، جہاں کا نواب اللہ یار خاں سکھوں کی تابعیت قبول کر چکا تھا۔

---

(۱) تونسہ سے ڈیرہ اسمٰعیل خاں اور اس کے بعد عیسیٰ خیل کی طرف جائیں تو چھوٹی بڑی کئی ندیاں ہیں جو کوہستان سلیمان سے نکل کر دریائے سندھ میں ملتی ہیں۔ جس دریا کا ذکر ہے اس سے مراد غالباً "وہوا" ہے۔ اس سے آگے بڑا دریا لونی ہے جو ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے قریب ہے۔

(۲) چوڑواں سے مراد غالباً چھنڈواں ہے جو کوہ سلیمان کے نزدیک ہے۔

یہیں دس اور اصحاب ملے، جو سید صاحب کے پاس جارہے تھے۔ وزیر خاں پانی پتی، غلام رسول خاں ملتانی، مولا بخش گولہ انداز ٹونک، احمد خاں قاصد، علیم الدین بنگالی، (برادرزادہ مولوی امام الدین) نیز پانچ اور اصحاب تھے۔

منزلِ مقصود

سید جعفر علی اور وزیر خاں پانی پتی نے نواب سے ملاقات کی تا کہ کسی اچھے رہبر کا بندوبست ہو جائے۔ اس کی مجلس میں سکھوں کی کثرت تھی۔ لہٰذا یہ مدعا بیان کیے بغیر لوٹ آئے۔ تخلیے میں ملاقات کر کے رہبر کا انتظام کرایا۔ اس نے ایک دو کوس چل کر اجرت مانگی۔ چونکہ وہ ہر قدم پر شر پیدا کرتا تھا، اس لئے اجرت دیکر اسے واپس کر دیا۔

آگے صرف دو منزلوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔ ایک ٹولہ جہاں سید جعفر علی نے دو گھوڑوں کے نعل بندھوائے تھے، دوسرا استرغی۔ لنڈے دریا کو عبور کر کے انتیس آدمیوں کا یہ قافلہ ۹؍ رمضان المبارک ۱۲۴۵ھ (۴ مارچ ۱۸۳۰ء) کو پنجتار پہنچا۔ سید صاحب اس زمانے میں بمقام امب تشریف فرما تھے۔ ان کے بھانجے سید احمد علی کسی کام کے سلسلے میں پنجتار آئے ہوئے تھے۔ ان سے ملاقات کی۔ ایک روز وہاں ٹھہرے، ایک رات گندف میں گزاری، ۱۲؍ رمضان کو عصر کے وقت تھانہ پہنچے۔ سید اکبر شاہ نے ٹھہرانا چاہا، جعفر علی نے عرض کیا کہ اب امیر المومنین سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ عشرہ میں حافظ عبداللطیف اور مولانا مظہر علی سے بھی نہ ملے اور سیدھے امب گئے۔

سید صاحب کو آمد کی اطلاع پہلے مل چکی تھی اور دو مرتبہ استقبال کی غرض سے باہر آ کر واپس چلے گئے تھے۔ ایک آدمی بھاگا بھاگا راستے میں ملا کہ جلد بندوق سر کرو تا کہ آمد کا حال معلوم ہو جائے۔ سید صاحب اژدر پر سوار ہو کر پچاس سواروں کے ساتھ آم کے درخت تک آئے۔ بہ آوازِ بلند السلام علیکم کہا، پھر مجاہدین کو دو صفیں بنا لینے کا حکم دیا اور فرمایا کہ جب میں کہوں بسم اللہ اللہ اکبر، سب بندوقیں سر کریں۔ سید جعفر علی کے قافلے

سے کہا کہ آہستہ آئیں۔ خود تیز چلے گئے اس لئے کہ افطار کا وقت قریب تھا، راستے میں افطار کا سامان آ گیا، دال مونگ میں نمک مرچ ڈال کر لائے۔ افطار کے بعد جلد از جلد مسجد میں پہنچ کر سید صاحب کی امامت میں نماز ادا کی۔

ذکر و موعظت

یہ حالات میں نے اس خیال سے تفصیلاً بیان کیے کہ سید صاحب کی شانِ مردم گری کا ایک حد تک اندازہ ہو جائے۔ سید جعفر علی نے سید صاحب کو دیکھا نہ تھا اور براہِ راست ان سے بیعت بھی نہ کی تھی۔ صرف اپنے والد اور بھائی کے واسطے سے کسبِ فیض کیا تھا، لیکن غور فرمایئے کہ اس بالواسطہ فیض نے بھی انہیں عزیمت کا کیسا عجیب و غریب پیکر بنا دیا۔ ذرا تصور کیجئے کہ کہاں گورکھپور ہے اور کہاں پنجتار، راستہ سراسر صعوبتوں سے لبریز، قدم قدم پر ندیاں اور دریا یا صحرا اور پہاڑ، سواریاں مفقود، ہر جگہ جان کا خطرہ، اکثر مقامات پر لوگ غیر ہمدرد جو معاون بننے کے بجائے مزاحم ہوتے رہے۔ اور یہ لوگ نوکری یا تجارت کیلئے نہ نکلے تھے کہ شدائد و صعب کی برداشت تحصیل زر کا ایک لازمہ سمجھی جاتی۔ وہ راحت بھری زندگیاں چھوڑ کر ایک بلند اسلامی نصب العین کی تکمیل اور ثواب اخروی کی تحصیل کیلئے نکلے تھے۔ آج کتنے مسلمان ہیں جو ان کی طرح خدا کی راہ میں صرف خدا کی خوشنودی کیلئے ایسے چند دن بھی بسر کر سکیں، جیسے سید جعفر علی اور ان کے ساتھیوں نے کم و بیش دس مہینے بسر کیے۔

کاروبارِ جہاد

سید جعفر علی نقوی تقریباً ایک سال مصروفِ جہاد رہے۔ پھر بالاکوٹ کا واقعہ پیش آ گیا۔ ان کی تحریر بہت اچھی تھی، اس لئے انہیں منشی خانے میں لے لیا گیا تھا یعنی وہ کاروبارِ جہاد کے علاوہ منشی گری کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ اس سلسلے میں بعض واقعات

صاف طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً:

۱- ایک موقع پر شیخ بلند بخت دیوبندی کو ایک معتمد علیہ آدمی کی ضرورت پڑی جسے پائندہ خاں تنولی کی زنبورکیں لانے کیلئے بھیجنا تھا۔ وہ شیخ محمد اسحٰق گورکھپوری کی تلاش میں آئے جو دن بھر پھرتے پھراتے واپس آ کر سو گئے تھے۔ سید جعفر علی خود اس کام کے لئے تیار ہو گئے۔ راتوں رات عمب سے چھتر بائی پہنچے۔ عبورِ دریا کے بعد اس مقام پر گئے جہاں زنبورکیں پڑی تھیں۔ چار سلامت مل گئیں، پانچویں ایک گاؤں میں زیرِ مرمت تھی۔ سید جعفر علی نے پانچوں بحفاظت اونٹوں پر بار کرائیں اور سکھوں کی چوکی کے پاس سے گذرتے ہوئے انھیں لے آئے۔ اگرچہ مشقت کے باعث بخار آ گیا تھا، لیکن جب تک زنبورکیں منزلِ مقصود پر نہ پہنچا لیں ایک لمحے کے لئے بھی آرام نہ کیا۔

۲- وہ شاہ اسمٰعیل کے ساتھ ستھوں سے بالاکوٹ جا رہے تھے۔ برف باری کا زمانہ تھا۔ پہاڑ کی چڑھائی پر سردی کے باعث بے بس ہو گئے۔ اپنے ہتھیار اور دوسری ضروری چیزیں ایک شخص کے حوالے کر دیں کہ میں مر جاؤں تو یہ چیزیں بیت المال میں دے دینا۔ پھر ایک گوجر سے کہا کہ میری دستار لے لو اور کسی طرح مجھے گاؤں پہنچا دو۔ صرف دستار کی پیش کش اس لئے کی کہ جو سامان وہ گھر سے لائے تھے اس میں سے صرف دستار رہ گئی تھی، باقی کپڑے بیت المال کے تھے اور ان کی شانِ اتقاء اس امر کی روادار نہ تھی کہ بیت المال کی کوئی چیز ذاتی کام کے معاوضے میں کسی کو دیں۔

غرض انھیں چارپائی پر ڈال کر گاؤں پہنچایا گیا اور کئی روز کے بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوئے۔ بالاکوٹ کے میدان میں وہ سید صاحب سے قریب تھے۔ جب افواہ پھیلی کہ سید صاحب کو گوجر پہاڑوں میں لے گئے ہیں تو دوسرے مجاہدین کے ساتھ سید جعفر علی بھی پہاڑ پر چلے گئے۔ پھر ناصر خاں بھٹ گرامی کی معیت میں شملئی پہنچے جہاں سید صاحب کی اہلیہ اور دوسری مستورات تھیں۔

انیسواں باب:

سفر مراجعت

قصدِ مراجعت

جب سید صاحب کی شہادت میں کوئی شبہ نہ رہا تو وطن واپس آنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس وقت تک شیخ ولی محمد پھلتی جماعت میں سب سے بڑھ کر معزز اور بزرگ مانے جاتے تھے اور انھیں باقاعدہ امیر بنا لیا گیا تھا۔ بیشک جماعت کے نزدیک وہی امیری کے اہل تھے۔ سید جعفر علی ان کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ آپ کو ہمیشہ شفیق اور بزرگ بھائی سمجھا، اب گھر جانا چاہتا ہوں۔ اگر کچھ نقد ہو تو راستے کے خرچ کے لئے عنایت فرمائیں۔ نقد نہ ہو تو میرے اچھے ہتھیار لے لیں اور ناقص ہتھیار دیدیں تا کہ میں ضرورت پیش آنے پر انہیں بیچ کر زادِراہ کا انتظام کراوں۔ شیخ ولی محمد نے کچھ ہتھیار دیدیے۔ ان کے علاوہ سید جعفر علی نے شیخ کی اجازت سے ایک قلمدان، ایک قینچی، چند خطوط جن پر سید صاحب کی مہریں اور دستخط تھے اور شاہ اسمٰعیل کی چند تحریرات لے لیں۔ ۲۷ رذی الحجہ ۱۲۴۶ھ (۸رجون ۱۸۳۱ء) کو روانہ ہوئے۔ اس وقت سید صاحب کی شہادت پر ایک مہینہ اور تین دن گذر چکے تھے اور سید جعفر علی صاحب کو سرحد پہنچے ہوئے سوا سال ہو چکا تھا۔ مجاہدین میں سے رجب خاں خان پوری، حاجی سکندر ساکن مئو اور چند اصحاب ہمراہ تھے۔ سب نے شیخ ولی محمد اور دوسرے اصحاب سے سوئے ادب وغیرہ کی تقصیریں معاف کرائیں۔

سفر

راستے میں سید جعفر علی کا قلمدان چرایا گیا۔ اس میں سید صاحب کے خطوط اور شاہ اسمٰعیل کی تحریریں بھی گئیں۔ سید جعفر علی نے ہر چند اعلان کیا کہ قلمدان معاف کرتا ہوں، تحریریں واپس دے دی جائیں، لیکن کچھ نہ بنا۔ حاجی سکندر کی سپر ایک جگہ نو روپے میں بکی تھی، وہ بھی کوئی چرا لے گیا۔

مداخیل میں سید غلام خاں اور فتو خاں کے پاس ٹھہرے۔ انہیں کے آدمیوں نے چنتی کے راستے ستھانہ پہنچایا۔ اس سفر میں میرزا خان اخوند زادہ اور اخوند محتشم سے بھی ملاقات کی۔

ستھانہ میں سید اکبر شاہ نے بہت مدارات فرمائی۔ ہر وقت ساتھ رکھتے تھے اور گھر جانے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ سید اکبر شاہ کے ایک عزیز نے اجازت لے دی۔ وہاں سے خان زمان خاں کے پاس کنگر پہنچے۔ وہ بھی اصرار کر رہے تھے کہ ملازمت کرلو۔ جتنے روپے کہو گھر بھیج دیتا ہوں۔ سواری کے لئے گھوڑا دوں گا اور آپ کی خدمت الگ کروں گا۔ سید جعفر علی نے معذرت کی۔ خان پور، راولپنڈی اور رہتاس ہوتے ہوئے کھاریاں (ضلع گجرات) پہنچے، وہاں بخار آ گیا، جس نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ سرسام ہو گیا۔ گاؤں کے رئیس نے بڑے اہتمام سے علاج کرایا۔ تندرست ہوئے تو لاہور اور امرتسر ہوتے ہوئے جالندھر پہنچے۔ خود فرماتے ہیں کہ سکھ حکومت میں مسلمانوں کی حالت بہت خراب تھی، یہاں تک کہ اقامت کی طرح اذان ”بہ خفض صوت“ دیتے تھے اور بحالت آزردگی دعائیں مانگتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جلد اس ملک سے باہر لیجائے۔

ایک عجیب واقعہ

سید جعفر علی نے جالندھر کا ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ کہتے ہیں: میں جس مسجد

میں ٹھہرا ہوا تھا، وہاں سو گیا۔ اسی حالت میں ایک شخص میرے پاؤں دابنے لگا۔ میں جاگا تو اس نے بے توقف کچھ روپے پیش کیے۔ میرے استفسار پر بتایا کہ میں صنعت جانتا ہوں، بال بچے ہیں نہیں۔ جو کچھ کماتا ہوں، اس میں سے کھا پی کر خاصی رقم بچ رہتی ہے وہ مسافروں کی خدمت میں صرف کرتا ہوں۔

لدھیانہ

جالندھر سے پھلور پہنچے اور دریائے ستلج کو عبور کیا۔ اس حصۂ ملک کی امتیازی خصوصیت سید جعفر علی نے یہ لکھی ہے کہ وہاں اذان اور گاؤ کشی بخوبی ہوتی تھی۔ لدھیانہ پہنچ کر شاہ شجاع کی مسجد میں قیام کیا۔ لکھتے ہیں کہ حافظ عبداللطیف نیوتنوی بھی مجھ سے پہلے اسی مسجد میں ٹھہرے تھے۔ امام مسجد مجاہدین کی تکفیر کرتا تھا، اس سے لڑ کر حافظ صاحب دہلی چلے گئے۔ میری صورت دیکھ کر امام نے برا بھلا کہنا شروع کیا۔ میں چپ بیٹھا رہا۔ دوسرے روز احمد خاں سے ملاقات ہوئی، جسے مولوی سید محمد علی رام پوری نے تحقیقِ احوال کے لیے بالاکوٹ بھیجا تھا۔ سید جعفر علی نے اسے اپنے چشم دید حالات سنا دیے، پھر شاہ شجاع کے وزیر ملا کشور سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا کہ نمک حرام ہمارے ملک پر قابض ہیں۔ ساتھ ہو جاؤ اور ہمارا حق دلاؤ۔ سید جعفر علی نے جواب دیا کہ ہم خدا کے لیے جنگ کرنے گئے تھے، کسی بادشاہ یا دعویدار شاہی کے حق کے لیے نہیں۔ امیر المومنین کا حق کسی نے نہ چھینا تھا۔ ملا شکور نے جواب دیا کہ یہ تو ارفع و اعلیٰ مرتبہ ہے، لیکن حقدار کا حق دلانا بھی نیکی کا کام ہے۔

پھر زمان شاہ کا وکیل جمال الدین آ کر ساتھ لے گیا۔ ایک حویلی میں ٹھہرایا اور شاہ کی طرف سے کھانا مقرر کر دیا۔ شاہ سے ملاقات ہوئی تو بڑی عزت سے پیش آیا۔ اس کے پاس ایک حکیم موجود تھا۔ پوچھا یہ عالم آدمی ہیں؟ جواب اثبات میں ملنے پر کھڑے

ہو کر مصافحہ کیا اور برابر بٹھایا۔ پھر کہا کہ جب امیر المومنین نے نمک حراموں کو پشاور واپس کر دیا تو ہمیں بہت دکھ ہوا۔ ہم جانتے تھے کہ جن منافقوں نے ہم سے وفا نہ کی وہ امیر المومنین سے کیا وفا کریں گے؟ ہمارا وکیل بھی نہ تھا، جو امیر المومنین کو ہماری یاد دلاتا۔

غرض زمان شاہ نے سید جعفر علی کو سات روز اپنے پاس ٹھہرائے رکھا۔ ایک روز طعامِ خاص بھیجا جس کے ساتھ قسم قسم کے آم تھے۔ جو شخص کھانا لایا تھا، اس نے کہا کہ شاہ کے طعامِ خاص کی تعظیم کے لئے اٹھیے۔ سید جعفر علی نے جواب دیا کہ میں آپ کی تعظیم کرتا ہوں اور یہ کافی ہے۔ طعام کی تعظیم اس کے سوا کچھ نہیں کہ ضائع نہ ہو۔

دہلی

لدھیانہ سے سید جعفر علی انبالہ، کرنال، پانی پت ہوتے ہوئے دہلی پہنچے۔ راستے میں محمد سعید خاں رسالدار گنج پوری سے ملاقات ہوئی، جو سکھوں کے پاس ملازم تھا اور ملازمت چھوڑ کر سید صاحب کی خدمت میں پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ بیس سوار اور پیادہ تھے۔ سید صاحب کے حالات سن کر ان کی صحت پر یقین نہ کیا اور سمجھا کہ سید جعفر علی وہاں سے بھاگ آئے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ آپ نے پوچھا تو جو کچھ مجھے معلوم تھا، بتا دیا۔ آپ میرا بیان صحیح نہیں سمجھتے تو خود چھان بین فرما لیجیے۔

دہلی پہنچ کر مسجد نہر میں ٹھہرے جو لاہوری دروازے کے قریب تھی۔ اگرچہ رات کا وقت تھا، لیکن لوگوں نے پہچان لیا۔ وہ بہت افسوس کرتے تھے۔ ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ یہ شخص پانچ گھوڑے، ایک اونٹ اور قافلہ لے کر گیا تھا۔ اب اس حال میں واپس آیا ہے۔ کھانا کھلایا، خود بخود نئے کپڑے بنوا دیے۔ مولانا سید محمد علی ان دنوں اکبر آبادی مسجد میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا تو آدمی بھیج کر بلوایا۔ تمام حالات سنے، لیکن شہادت کی تصدیق نہ کی۔ چودہ روز دہلی میں مقیم رہے۔ شاہ اسحاق، شاہ یعقوب اور

دوسرے اکابر سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ سید جعفر علی سے پیشتر مولوی امام الدین اور حافظ عبداللطیف پہنچ چکے تھے اور وہ بے تکلف شاہ اسمٰعیل کی شہادت کا واقعہ بیان کر رہے تھے۔ شاہ اسحاق، شاہ یعقوب اور دوسرے متعلقین کے نزدیک یہ بات مستحسن نہ تھی۔ ایک روز شاہ اسماعیل کی ہمشیر نے سید جعفر علی، حافظ عبداللطیف، مولوی امام الدین کو جمع کیا اور فرمایا:

> "وہ میرے بھائی تھے۔ اس انتہائی قریبی رشتے کے علاوہ انھوں نے مجھ پر ایسے احسان کیے جو کم بھائیوں نے بہنوں پر کیے ہوں گے۔ میری حالت یہ ہے کہ اگر مر جاؤں تو اسحاق اور یعقوب کے سوا دفن کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ اگر ہمارے بھائی نے شہادت پائی تو ہم اپنے پروردگار سے راضی ہیں۔ جزع فزع نہیں کرتے۔ جانتے ہیں کہ وہ بڑوں کے طریقوں پر چلے۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ آپ نے ہمارے بھائی کو شہید ہوتے دیکھا؟ میں نے نفی میں جواب دیا تو بی بی رقیہ نے فرمایا: بہتر یہی ہے کہ آپ شہادت کی خبر بیان نہ کریں، اظہار میں دو قباحتیں ہیں، ایک یہ کہ لوگ طعنے دیتے ہیں، دوسرے یہ کہ یہاں جانشینی اور دستار بندی کا معاملہ شروع ہو جائے گا۔"

لکھنؤ اور وطن

دہلی سے سید جعفر علی مولانا سید محمد علی کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ بھیکم پور، قنوج اور نیوتنہ میں بھی ٹھہرے۔ لکھنؤ پہنچ کر جوہری محلے کی مسجد میں قیام کیا۔ وہاں اپنے استاد مولوی حیدر علی، سید ابوالقاسم بن سید احمد علی شہید (خواہر زادۂ سید صاحب) اور سید محمد سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان سب کو واقعۂ شہادت کی تفصیلات سنائیں۔ مولوی حیدر علی سید صاحب کی شہادت کی خبر سن کر بہت روئے۔ انھیں نے فقیر محمد خاں رسالدار تک یہ خبر پہنچائی۔ اس وقت سے انھیں سید صاحب کی شہادت کا یقین ہوا۔

لکھنؤ سے سید جعفر علی فیض آباد گئے اور شاہ ٹاٹ کی مسجد میں قیام کیا۔ وہیں ان کے ماموں استقبال کے لئے آ گئے۔ گورکھپور میں ان کے بھائی اور دوسرے عزیزوں نے استقبال کیا۔ وہاں سے اپنے وطن مجھوا میر پہنچے۔

دو قابل قدر خدمتیں

جنگ بالاکوٹ سے واپسی کے بعد سید صاحب جعفر علی کی دو خدمتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں: اول یہ کہ آپ نے اپنی بستی سے چھ میل کے فاصلے پر کرھی میں "ہدایت المسلمین" کے نام سے دینی درسگاہ قائم کی جو اب تک جاری ہے۔ دوسرے نواب وزیرالدولہ والیٔ ٹونک اور آپ کے صاحبزادے نواب محمد علی خاں کی فرمائش پر سید صاحب اور جماعت مجاہدین کے حالات میں ایک مفصل کتاب بزبان فارسی لکھی۔ جس کا ایک نام "منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء" اور دوسرا "تاریخ احمدی" ہے۔ اس میں ابتدائی حالات سید صاحب کے نیاز مندوں سے حاصل کردہ معلومات پر مبنی ہیں۔ جنگوں کے متعلق کچھ حالات انہوں نے مستند ذرائع سے سنے، باقی ان کے چشم دید تھے۔ یہ کتاب بڑی ہی قیمتی معلومات سے لبریز ہے، افسوس کہ اب تک چھپ نہ سکی۔

وفات

سید جعفر علی صاحب نے رمضان المبارک ۱۲۸۸ھ (نومبر ۱۸۷۱ء) میں وفات پائی۔ تاریخ پیدائش ۱۲۱۸ھ تھی۔ ستر برس کی عمر ہوئی۔ وفات سے پیشتر ایک خواب دیکھا تھا کہ ایک آراستہ مقام ہے، وہاں شاہ عبدالعزیز، سید احمد شہید، شاہ اسمٰعیل اور کچھ دوسرے اصحاب کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ ایک کرسی خالی ہے۔ کسی نے پوچھا کہ یہ کس کے لئے ہے؟ جواب ملا، جعفر علی کے لئے۔

اولاد میں صرف ایک صاحبزادی تھی، بی بی زینب۔ ان کے کوئی اولاد نہ ہوئی،

چھوٹے بھائی سید حسن علی کے صاحبزادے محمد زکریا کی اولاد میں سے سید محمد مصطفیٰ، سید محمد احمد اور سید محمد صالح ۱۹۴۱ء تک زندہ رہے۔

''منظورہ'' کی ترتیب

منظورۃ السعداء کی ترتیب کا حال خود سید جعفر علی نے یوں بیان کیا ہے کہ ایک دوست مولانا جمال الدین مدارالمہام بھوپال کا ایک رسالہ میرے پاس لائے، جو سید صاحب کے حالات میں تھا اور کہا کہ اس کی روایتیں دیکھ کر درست کر دیجئے۔ اسے دیکھا تو عبارت خوب تھی، لیکن مطالب میں غلطیاں تھیں، اس لئے کہ حالات لوگوں سے سن کر لکھے تھے۔ نواب وزیر الدولہ نے ٹونک سے کئی قاصد میرے پاس بھیجے، حالاں کہ میرا وطن ٹونک سے ایک مہینے کی مسافت پر تھا۔ آخر میں ٹونک گیا، وہاں اور لوگ بھی تھے، جنہوں نے سید صاحب کو دیکھا تھا۔ سید صاحب کے خاص رفیقوں میں سے اکثر شربتِ شہادت پی چکے تھے۔ بعض کا پیمانہ حیات طبعی طور پر پُر ہو چکا تھا۔ خطرہ تھا کہ ثقات کی وفات کے بعد حالات لکھنے والا کوئی نہ ہوگا، لہٰذا جلد سے جلد جو کچھ کسی کو یاد ہے، قلمبند کر دینا چاہیے۔ میں نے وہی حالات لکھے جو خود دیکھے یا سید صاحب کی زبان سے سنے یا شاہ اسمٰعیل اور دوسرے معتمد علیہ بزرگوں نے حکایتاً میرے سامنے بیان کیے۔

بیسواں باب:

اللہ داد خاں پنّیؒ

اللہ داد خاں کا خاندان اس زمانے میں ممتاز حیثیت پر فائز تھا، جب ہندستان میں فوجی نظام جاگیرداری کا عام رواج تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے: اللہ داد خاں بن محمد سید خاں بن پردل خاں۔ پردل خاں کے بڑے بھائی نواب کرامت خاں کو بھی فوجی جاگیر ملی ہوئی تھی اور وہ فتح پور ہسوہ میں رہتے تھے۔ ان کی امارت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جس خاتون سے نکاح کیا اس کا پورا مہر پانچ لاکھ پانسو پانچ اشرفی نقد ادا کیا۔ وہ شجاع الدولہ والیٔ اودھ سے وابستہ تھے، لیکن صرف اس حد تک کہ ضرورت پیش آنے پر لڑائی کیلئے انہیں مع فوج طلب کر لیا جائے، ویسے میل جول میں انکی حیثیت برابر کی تھی۔

مفسدوں کی شکست

اتفاق سے بندیل کھنڈ میں سرکشی کا فتنہ اٹھا اور شجاع الدولہ نے نواب کرامت خاں کو لکھنؤ طلب کیا۔ یہ اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ دیوان خانے میں پہنچے تو شجاع الدولہ اس غرض سے اٹھ گیا کہ کرامت خاں کی تعظیم کیلئے کھڑا نہ ہونا پڑے۔ کرامت خاں نے یہ دیکھا تو خدمت گار کو اشارہ کیا۔ اس نے مصلّی بچھا دیا اور یہ تلاوتِ قرآن میں مصروف ہو گئے۔ آخر شجاع الدولہ آ گیا۔ یہ باطمینان تلاوت سے فارغ ہو کر اٹھے، معانقے کے بعد برابر بیٹھ گئے۔ دوسرے سردار بھی آئے ہوئے تھے۔ شجاع الدولہ نے ان سے کہا کہ بندیل کھنڈ میں بغاوت پھوٹ پڑی ہے۔ سامنے کشتی میں پان کا بیڑا اور تلوار رکھی ہوئی ہے۔ دیکھیں کون سرکشوں کی خبر لیتا ہے؟ کرامت خاں نے یہ سنتے ہی پان کا بیڑا

اٹھالیا۔ تلوار ان کی کمر میں باندھ دی گئی اور وہ اپنی فوج کے ساتھ بندیل کھنڈ پہنچ گئے۔ سرکشوں کو شکست فاش دی۔ ایک بندیلا ان کے کیمپ میں گھس آیا۔ کرامت خاں نے اس کے سر پر تلوار ماری اور وہ دو ٹکڑے ہو کر گر پڑا۔ حالاں کہ اس نے پگڑی کے نیچے سر پر لوہے کے دو تین توے باندھ رکھے تھے۔ اس سے کرامت خاں کی شہ زوری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

شہادت

وہ فتح کے شادیانے بجاتے ہوئے واپس آ رہے تھے کہ چند بندیلوں نے جو گھات میں چھپے ہوئے تھے، ایک دم قرابینیں چلا دیں۔ گولیوں سے کرامت خاں کا سینہ چھلنی ہو گیا اور وہ گر پڑے۔ ان کا وفادار گھوڑا سرپٹ دوڑ پڑا۔ فتح پور میں نواب کی ڈیوڑھی پر پہنچتے ہی رکا، گرا اور ختم ہو گیا۔ نواب کی والدہ زندہ تھیں، انہیں تشویش ہوئی کہ خدا جانے میرے بیٹے کا کیا حال ہوا۔ پکار کر کہہ دیا کہ اگر وہ میدانِ جنگ سے بھاگا ہے تو دودھ کبھی نہ بخشوں گی۔ دوسرے دن خبر ملی کہ نواب کو دھوکے سے شہید کر ڈالا گیا۔ ایسے جوانمرد بیٹے کی شہادت سے جو رنج انہیں پہنچا ہوگا، اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے، لیکن اس شکرانے میں دو نفل پڑھے کہ بیٹے نے مردانگی کا حق ادا کیا۔ چنانچہ ان کی میت فتح پور لا کر دفن کی گئی۔ مزار موجود ہے۔ گھوڑے کو بھی دفنا دیا، اس کی قبر بھی اب تک باقی ہے۔

پرُول اور محمد سید

کرامت خاں کے چھوٹے بھائی پرُول خاں اور ان کے بیٹے محمد سید خاں کے تفصیلی حالات معلوم نہ ہو سکے، لیکن کرامت خاں کے حالات سے ظاہر ہے کہ وہ بھی مردانِ رزم و پیکار ہی ہوں گے۔ پرول خاں کے پوتے اللہ داد خاں کی والدہ شیر زمان خاں کی بیٹی تھیں اور ان کا نام صاحب زمانیہ بیگم یا زمانیہ بی بی تھا۔ یہ وہی شیر زمان خاں ہیں، جن

کے دادا محمد شہاب خاں نے نواب سعادت علی خاں والیِ اودھ کے زمانے میں قصبۂ گوتنی (گائے کی چراگاہ) آباد کیا تھا۔ سید صاحب کے واقعہ نگار اسے کتنہ لکھتے رہے۔ اللہ داد خاں کی ننھیال میں مذہبیت کا یہ عالم تھا کہ خلافِ شرع کوئی بات ہونے نہ پاتی تھی۔ جامع مسجد کے چاروں طرف جو محلے ہیں ان میں اب تک شادی کے موقع پر بھی گانا بجانا نہیں ہوتا اور آس پاس سے باجا بجاتے ہوئے گذرنا ممنوع ہے۔

اللہ داد خاں

اللہ داد خاں کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شہر فتح پور میں سید خاں مسوانی رئیس کی صاحبزادی سے۔ یہ خاتون رسوم و بدعات میں ڈوبی ہوئی تھیں اور اللہ داد خاں کے بار بار روکنے پر بھی انہیں چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئیں، لہٰذا خان موصوف نے مجبوراً ان سے قطع تعلق کرلیا۔ دوسرا نکاح آصف زمان خاں (بن شیر زمان خاں رئیس گوتنی) کی صاحبزادی عائشہ بی بی سے کیا۔ جن سے خدا نے انہیں دو بیٹے اور دو بیٹیاں دیں۔ بیٹوں میں سے بڑے محمد اسمٰعیل خاں تھے، جن کا نام شاہ اسمٰعیل کے نام پر رکھا گیا، چھوٹے محمد یوسف۔ اللہ داد خاں کی سسرال کے تعلقات گوتنی سے زیادہ لکھنؤ سے تھے اور ان کے تینوں برادرانِ نسبتی احمد علی خاں، اشرف علی خاں اور واحد علی خاں بہ سلسلۂ ملازمت لکھنؤ ہی میں رہتے تھے، لہٰذا اللہ داد خاں بھی یا تو لکھنؤ میں مقیم رہتے یا اپنے پیر و مرشد کے وطن رائے بریلی آجاتے۔

تنظیم مجاہدین

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ جہاد میں شریک ہوئے یا نہیں، اتنا معلوم ہے کہ انھوں نے اپنی کل جائداد مجاہدین کے لئے وقف کر دی تھی۔ صرف سسرالی ترکے کا ایک مکان اور ایک باغ جو گوتنی سے متصل شیر گڑھ میں تھا، باقی رکھا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ وہ سید صاحب

کی شہادت کے بعد جماعت مجاہدین کو از سر نو منظم کرنا چاہتے تھے۔ غدر سے پیشتر ان کا انتقال ہو گیا۔ قبر کا کچھ پتا نہیں کہ کہاں ہے۔ خیال یہ ہے کہ انتقال کسی سفر میں ہوا جو تنظیم مجاہدین کے سلسلے میں اختیار کیا گیا تھا۔

محمد یوسف خاں

ان کے فرزند اکبر محمد اسمٰعیل خاں کی ولادت اسی سال ہوئی جس سال سید احمد نے بالاکوٹ میں شہادت پائی۔ ان کے چھوٹے بھائی محمد یوسف خاں عموماً افغانستان آیا جایا کرتے تھے۔ یہ سفر فقیرانہ بھیس میں ہوتے تھے۔ اسی وضع میں متعدد حج کیے۔ بیعت بھی لیتے تھے۔ ان کے پاس ایک خاردار تلوار بھی رہتی تھی۔ اولاد کوئی نہ چھوڑی۔ ابتدا میں ان کا نکاح خالہ زاد بہن سے ہوا تھا، وہ فوت ہو گئیں تو پھر نکاح نہ کیا۔ قیاس یہ ہے کہ ان کا تعلق سرحد آزاد کے مجاہدین سے تھا اور اس سلسلے میں وہ سفر کیا کرتے تھے۔

محمد اسمٰعیل خاں

محمد اسمٰعیل خاں کی عمر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت پچیس چھبیس سال کی ہوگی۔ وہ اودھ کی شاہی فوج میں ملازم تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں انگریزوں کے خلاف نمایاں حصہ لیا۔ الٰہ آباد میں شاہ محب اللہ کے خاندان کے ایک بزرگ شاہ احمد اللہ فاروقی تھے۔ ان کے ہاتھ پر باقاعدہ جہاد کی بیعت کی تھی۔ کانپور، لکھنؤ اور دوسرے مقامات پر مجاہدین انقلاب کے سرغنہ رہے۔ ان کی سرگرمیوں کے مفصل حالات معلوم نہ ہو سکے۔ تحریک کی ناکامی کے بعد گرفتاریاں اور سزائیں شروع ہو گئیں۔ محمد اسمٰعیل خاں بچتے بچاتے آگرہ پہنچے اور مولوی سید فرید الدین کٹروی کے پاس ٹھہرے، جو عدالت عالیہ کے مشہور وکیل تھے۔ پھر دہلی چلے گئے اور نواب فیض اللہ خاں رئیس پہاسو (ضلع علی گڑھ) یا حکیم اجمل خاں مرحوم کے والد ماجد حکیم محمود خاں کی وساطت سے الور میں پولیس کے

افسر بن گئے۔ تین سال وہیں مقیم رہے۔ پنشن لے کر گوتنی میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ ۱۹۱۸ء میں بمقام الٰہ آباد انتقال ہوا۔

حالاتِ غدر

اہلِ خانہ نے محمد اسمٰعیل خاں سے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے متعلق جو باتیں سنیں، ان سے تحریک کی بے نظمی صاف صاف آشکارا ہوتی تھی مثلاً:

۱- قلعہ الٰہ آباد کا خزانہ لٹا تو سپاہیوں کی بے صبری کا یہ حال تھا کہ جو صندوق ٹوٹتا، سب اسی پر پل پڑتے اور کش مکش میں تلواریں نکل آتیں، حالاں کہ بہت سے صندوق محفوظ پڑے تھے۔ ان کی طرف کسی کی توجہ نہ ہوتی تھی۔

۲- وہ کہا کرتے تھے کہ ہنگامے میں حصہ لینے والوں کی حیثیت ایک غیر منظم بھیڑ کی سی تھی۔ کہیں سے کوئی افواہ اڑتی تو لوگ سراسیمہ وار بھاگنے لگتے۔ پھر سرداروں میں سخت رقابت تھی۔ ہر سردار کی کوشش یہ تھی کہ دوسرے کو گرا کر خود آگے بڑھ جائے۔ خصوصاً پوربیوں کی بدلگامی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ ابتدائی دور کی معمولی وقتی کامیابیوں نے ان میں اس درجہ غرور پیدا کر دیا تھا کہ کہتے تھے ”جہ کے موڑ پر پنہی رکھ دیے، وہی بادساہ ہوجیہے“ (جس کے سر پر جوتا رکھ دیں گے، وہی بادشاہ ہو جائے گا)۔

ایمیلیا کک

محمد اسمٰعیل خاں کان پور سے ایک انگریز خاتون کو بھی لے آئے تھے۔ اس کا نام ایمیلیا کک (EMILIA COOK) تھا۔ اسے مسلمان کر کے نکاح کر لیا۔ انگریزی تسلط بحال ہو گیا تو وہ خاتون ہر چند کہتی رہی کہ چلو تمہیں خاصی جائداد دلوا دوں گی، لیکن محمد اسمٰعیل خاں تیار نہ ہوئے۔ خاتون کو لکھنؤ یا کان پور بھیج دیا۔ بعد ازاں انگریزوں نے محمد اسمٰعیل خاں کا پتا لگانے کیلئے بہت سختی کی، مگر وہ جا چکے تھے اور ان کا سراغ کسی کو نہ مل

سکا۔ معلوم نہیں تلاش کے لیے یہ تگ و دو اس غرض سے کی گئی تھی کہ انہیں جاگیر دی جائے یا سزا دینی منظور تھی۔

محمد اجمل خاں

محمد اسمٰعیل خاں کے تین بیٹے ہوئے: احمد یعقوب خاں، محمد اجمل خاں اور احمد اللہ خاں۔ احمد یعقوب خاں نے ساری عمر خانہ نشینی میں گزار دی۔ احمد اللہ خاں تعلیم پا کر سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔

محمد اجمل خاں نے ایف۔ اے تک سائنس کی تعلیم پائی۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم سے محمد اسمٰعیل خاں کی گہری دوستی ہوگئی تھی، انہیں کے نام پر فرزند کا نام اجمل رکھا۔ انہیں کے مشورے سے سائنس کی تعلیم دلائی تاکہ طب اور ڈاکٹری سیکھ سکے۔ محمد اسمٰعیل خاں کے انتقال کے بعد سائنس کو چھوڑ کر علی گڑھ کالج سے ڈگری لی اور فلسفے میں ایم۔ اے، ساتھ ساتھ قانون کا امتحان دینے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اسی زمانے میں ترک موالات کی تحریک شروع ہوگئی اور محمد اجمل خاں نے ضلع کی خلافت اور کانگرس کا کام سنبھال لیا۔ چند سال بعد عربی کا ایم۔ اے کر لیا اور ایل ایل بی کا امتحان دے کر وکالت شروع کر دی۔ پھر کچھ مدت الٰہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے لکچرار رہے۔ ۱۹۲۹ء میں ''ڈان'' کے نام سے انگریزی کا ایک ہفت روزہ اخبار الٰہ آباد سے جاری کیا۔ ۱۹۳۱ء میں آزادی کی تحریک شروع ہوئی، اس میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء میں حجاز گئے۔ واپس آ کر الٰہ آباد میں فلسطین کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ پھر ایک اہم تصنیف ''نزول قرآن کریم'' کے نام سے شائع کی۔ ۱۹۳۷ء میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے انہیں اپنا پرائیویٹ سکریٹری بنا لیا، اب تک انہیں کے ساتھ ہیں۔

تصانیف

خان محمد اجمل خاں نے اور کتابیں بھی تصنیف کیں۔ مثلاً سیاسیات، پس منظر اسلام اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر دس جلدیں مرتب کیں۔ بنیادی ہندوستانی پر تقریباً پچاس مضامین اور رسالے شائع کیے، جن کی مجموعی مقدار ایک ہزار صفحات سے کم نہ ہوگی۔ متوسط درجے کی ایک سیرت اردو زبان میں مرتب کی، جو قرآن کریم پر مبنی ہے۔ یہ شائع ہو چکی ہے، اب ایک طرف اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں کرانا چاہتے ہیں، دوسری طرف قدرے مبسوط سیرت مرتب کر چکے ہیں، جو چھپ چکی ہے۔ پہلی کتاب کی طرح یہ بھی قرآن کریم ہی پر مبنی ہے۔

اکیسواں باب:

محمد مقیم، عبدالوہاب، نور احمد

میاں محمد مقیم رام پوری

یہ میاں کریم اللہ کے بھائی تھے، جو نواب احمد علی خاں والیٔ رام پور کی جانب سے نیابت کے عہدے پر مامور تھے۔ بیعت امامت جہاد کے بعد سید صاحب نے دعوت نامے ہندوستان بھیجے تو جو اصحاب سب سے پہلے مجاہدین کے قافلے لے کر سرحد پہنچے، ان میں میاں محمد مقیم بھی تھے، جو چالیس پچاس غازیوں کے ساتھ گئے تھے۔ وہ تمام جوان، شجاع اور حد درجہ پرہیز گار تھے۔ نقد روپے کے علاوہ قرابینوں کی بھی خاصی بڑی تعداد ساتھ لے گئے تھے۔

پکھلی میں جہاد

خوانین پکھلی کی دعوت پر سید صاحب نے غازیوں کی ایک جماعت ہزارہ میں بھیجنے کا فیصلہ کیا تو میاں محمد مقیم نے سبقت بالخیر کرتے ہوئے عرض کیا کہ میرا قافلہ ضروری ساز و سامان سے لیس ہے۔ تمام مجاہدین آزمودہ کار ہیں اور اس مہم پر ہمیں ضرور بھیجا جائے۔ سید صاحب نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ چالیس پچاس غازی میاں مقیم کے قافلے کے تھے۔ تقریباً ایک سو غازی دوسری جماعتوں سے منتخب کیے، مولانا شاہ اسمٰعیل کو ان کا سالار بنایا۔ مولوی خیر الدین شیر کوٹی اور ملا شاہ سید چیڑ منگی کو ان کے نائب و مشیر مقرر کر دیا۔

ارسلان خان کی معیت

مولانا شاہ اسمٰعیل پکھلی (ضلع ہزارہ) میں پہنچے تو انہیں محسوس ہوا کہ یہاں جہاد کا اقدام قبل از وقت ہوا ہے، لہٰذا وہ تنظیمات میں مصروف ہوگئے۔ میاں مقیم جوشِ شجاعت میں جنگ کیلئے مضطرب تھے۔ مولانا شاہ اسمٰعیل ضروری تنظیمات کے بغیر آغازِ جنگ کو خلافِ مصلحت سمجھتے تھے۔ اس اثناء میں خان اگرور کے بھائی ارسلان خاں نے اعلان کردیا کہ میں سکھوں سے لڑنے کیلئے جارہا ہوں۔ جن لوگوں کو جہاد کا شوق ہو، میرے ساتھ ہوجائیں، ان سب کا خرچ میں برداشت کروں گا۔ میاں محمد مقیم اور ان کے ساتھی معاً تیار ہوگئے اور مولانا سے اجازت مانگی۔ اگرچہ اجازت مطابق مصلحت نہ تھی، لیکن سید صاحب نے روانگی کے وقت میاں محمد مقیم کی دلداری کی تاکید فرمادی تھی، اس لئے مولانا نے اجازت دے دی اور یہ ارسلان خاں کے ساتھ روانہ ہوگئے۔

جنگ ڈمگلہ

جب مولانا کو معلوم ہوا کہ ڈمگلہ میں سکھوں کی فوج جمع ہورہی ہے تو خود بھی آگے بڑھ کر شنکیاری کے قریب پہنچ گئے جو ڈمگلہ سے تین میل پر درہ بھوگڑ منگ کے سامنے ایک مشہور مقام ہے۔ وہاں سے میاں محمد مقیم کو ایک سو مجاہدین کا سالار بنا کر ڈمگلہ پر شبخون مارنے کا حکم دے دیا۔ چودہ پندرہ سو ملکی آدمی ان کے ساتھ ہوگئے۔ مولوی خیرالدین شیرکوٹی کو میاں مقیم کا مشیر و نائب بنادیا۔ گولی بارود کے علاوہ بارود بھرے ہوئے نل بھی مجاہدین کو دے دیے۔ انہیں وقت کے "ہینڈ گرینیڈ" سمجھنا چاہیے۔ چوں کہ سکھ لشکر نے اپنی قیام گاہ کے اردگرد خار بندی کر رکھی تھی، اسلیے مجاہدین نے کچھ چارپائیاں بھی ساتھ لے لیں تاکہ خار بندی سے لگا کر بہ سہولت اندر پہنچ سکیں۔

میاں مقیم کی دلاوری

تین میل کی مسافت میں بہت سے ملکی آدمی اِدھر اُدھر چھپ گئے اور میاں مقیم کے ساتھ صرف تین چار سو رہ گئے۔ میاں صاحب بلند ہمت آدمی تھے۔ اپنے ساتھیوں کی قلتِ تعداد سے بے پرواہ ہو کر انہوں نے حملہ کیا۔ پہلے بارود بھرے تل لشکر گاہ میں پھینکے پھر چار پائیاں خار بندی سے لگا دی گئیں۔ قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ جو شخص سب سے پہلے لشکر گاہ میں پہنچا وہ مجاہدین کا بہادر سالار محمد مقیم تھا۔ میاں نے پورے زور سے نعرۂ تکبیر لگایا۔ راویوں کا بیان ہے کہ سکھ غول غول بن کر کئی جگہ جمع ہو گئے تھے۔ مجاہدین پہلے ان پر تل پھینکتے، پھر قرابینیں چلاتے ہوئے حملہ کرتے۔ "منظورہ" میں مرقوم ہے کہ محمد مقیم اور ان کے ساتھیوں نے جوانمردی کے وہ جوہر دکھائے کہ رستم واسفند یار کی داستانیں فراموش ہو گئیں۔ وہ لوگ اس طرح سکھوں کے ہجوم میں گھستے تھے، جیسے کوئی کبڈی کھیلتا ہے۔ تین چار ہلوں میں سکھوں کو خار بندی سے باہر نکال دیا۔

جب سکھوں پر واضح ہوا کہ حملہ آور تعداد میں کم ہیں تو انہوں نے دوبارہ اکٹھے ہو کر مقابلے کی ٹھانی۔ مولوی خیر الدین نے یہ حالت دیکھی تو مشورہ دیا کہ اب باہر نکل چلو۔ مولوی صاحب ایک جماعت لیکر سکھوں کا مقابلہ کرنے لگے۔ باقی مجاہدین کو مراجعت کا حکم دیدیا۔ پھر خود بھی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے ہوئے نکل گئے۔ اس معرکے میں سکھ مقتولین کی تعداد تین سو کے قریب تھی۔ غازیوں میں سے دو سخت زخمی ہوئے اور شہادت پائی۔ چھ سات کے ہلکے زخم لگے۔ خود میاں محمد مقیم کی ٹانگ پر بھی تلوار کا ایک زخم تھا۔

مراجعت اور وفات

ہزارہ سے واپسی کے بعد میاں صاحب کے بھائی کریم اللہ کے مرنے کی اطلاع پہنچی اور غالباً ان کے متعلقین اور خود نواب احمد علی خاں کی طرف سے معروض پیش ہوا کہ

میاں محمد مقیم کو واپس بھیج دیا جائے۔ وہ جانے کیلئے تیار نہ تھے۔ سید صاحب نے حکماً انہیں واپس بھیجا۔ رام پور میں وہ اونچے عہدے پر مامور ہو گئے تھے۔ ایک ریاستی کی سرکشی کے انسداد کیلئے پالکی میں بیٹھ کر گئے۔ ادھر سے اچانک گولیوں کی بوچھار آئی۔ میاں محمد مقیم بری طرح زخمی ہو گئے اور کچھ دیر بعد وفات پائی۔

طریقہ محمدیہ

نواب وزیر الدولہ نے "وصایا" میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ عطاء اللہ نے جو حکیم غلام حسین نائب والیٔ رام پور کے بڑے بھائی تھے، نیز میاں محمد مقیم نے سید صاحب سے بہ ادب پوچھا کہ آپ چشتی، قادری، نقشبندی اور مجددی طریقوں میں بیعت کے بعد طریقہ محمدیہ میں بھی بیعت لیتے ہیں، اس کی حقیقت ہمیں معلوم نہ ہو سکی۔ سید صاحب نے اس کا جواب بطریق اجمال یہ دیا: چشتی اور قادری طریقوں کے اشغال کی تعلیم اس طریق پر دی جاتی ہے کہ ذکر جہر کرو اور ضرب اس طرح لگاؤ۔ طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کی تلقین اس طرح کی جاتی ہے کہ ذکر خفی کرو، پھر سمجھایا جاتا ہے کہ یہ لطیفۂ قلب ہے، یہ لطیفۂ روح، یہ لطیفۂ نفس ہے، یہ لطیفۂ سر، یہ لطیفۂ خفی ہے اور یہ لطیفۂ اخفیٰ ہے۔ ان طریقوں کی نسبت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باطنی ہے۔ طریقہ محمدیہ کے اشغال یوں سکھائے جاتے ہیں:

> "کھانا اس نیت سے کھایا جائے، لباس اس نیت سے پہنا جائے، نکاح اس نیت سے کیا جائے، رات کو سویا اس نیت سے جائے، کھیتی باڑی اس نیت سے کی جائے، تجارت اس نیت سے اور نوکری اس نیت سے۔ اس طریقے کی نسبت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ طور ظاہر شریعت ہے۔"(۱)

---

(۱) وصایا حصہ دوم ص: ۳۲، ۳۳۔ مراد یہ ہے کہ سب کچھ خدا کے لئے کیا جائے۔ کھانے سے مقصود جسم میں قوت کی بحالی ہو تا کہ دین کی خدمات احسن طریق پر انجام پائیں۔ لباس سے مقصود جسم کی حفاظت ہو۔ نکاح سے مقصود یہ ہو کہ انسان لغزش سے محفوظ رہے۔ کھیتی باڑی، تجارت یا نوکری کی غرض یہ ہو کہ انسان کمائی کر کے متعلقین کے حقوق ادا کرے اور جو رقم بچائی جا سکے اسے خدائی کاموں میں صرف کرے۔

گویا ہر عمل کا مقصد رضائے باری تعالیٰ ہو، اس کے سوا کچھ نہ ہو، اور جو کام بھی کیا جائے شریعت کے مطابق کیا جائے۔

مولوی عبدالوہاب

شاہ یقین اللہ کے فرزند، بڑے سلیم المزاج، نیک کردار، بردبار اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ پنجتار میں سید صاحب نے انھیں رسد کی تقسیم پر مامور فرما دیا تھا "قاسم غلہ" ان کے نام کا جزو بن گیا تھا۔ مختلف عوارض کے باعث بہت لاغر اور نحیف ہو گئے تھے۔ اس لئے تقسیم غلہ کی خدمت میں عذر کیا۔ سید صاحب نے فرمایا: ہم دعا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے۔ چنانچہ خدا کے حکم سے آپ کے عارضے بھی جاتے رہے اور جسم کی حالت بھی بہتر ہو گئی۔

حفظِ قرآن اور حسنِ تقسیم

مولوی صاحب کو حفظ قرآن کا بہت شوق تھا۔ کئی مرتبہ سید صاحب سے عرض کیا کہ دعا فرمائیے، اللہ تعالیٰ حفظ کی توفیق عطا کرے اور میں ایک بار تراویح میں پورا قرآن آپکو سناؤں۔ کیفیت یہ تھی کہ غلہ تقسیم فرماتے وقت آہستہ آہستہ قرآن مجید پڑھتے جاتے۔ ایک ایک وقت میں بیس بیس پچیس پچیس مجاہد رسد کے لئے آ جاتے اور سب کو باری باری مقررہ پیمانے کے مطابق دیتے جاتے۔ طریقہ یہ اختیار کر لیا تھا کہ بڑا ہو یا چھوٹا، افسر ہو یا سپاہی، جس ترتیب سے لوگ آتے تھے، اسی ترتیب سے سب کو رسد دیتے تھے۔ تقدم و تاخر نہ ہونے پاتا۔

عفو و حلم

ایک روز مولوی امام علی عظیم آبادی رسد لینے کیلئے آئے۔ وہ تو وارد تھے اور مولوی

صاحب کے طریق تقسیم سے انہیں آگاہی نہ تھی۔ اصرار کیا کہ پہلے مجھے رسد دیجئے۔ مولوی صاحب نے تحمل سے فرمایا کہ بھائی رسد باری سے ملے گی۔ وہ قوی الجثہ اور جسیم آدمی تھے۔ غصے میں آ گئے اور مولوی صاحب کو دھکا دیکر آٹے کے انبار پر گرا دیا۔ مولوی صاحب تمام غازیوں میں بہت ہی معزز و محترم مانے جاتے تھے۔ قندھاری غازیوں نے یہ کیفیت دیکھی تو مولوی امام علی کو مارنے کیلئے تیار ہو گئے۔ مولوی عبدالوہاب نے انہیں روک دیا اور کہا کہ امام علی میرا بھائی ہے، دھکا دیا تو مجھے دیا، آپ لوگ کیوں جوش میں آ گئے؟

ہوتے ہوتے یہ بات سید صاحب تک پہنچی۔ آپ نے مولوی عبدالوہاب کو بلا کر تفصیل پوچھی۔ موصوف نے عرض کیا: امام علی نیک بخت آدمی ہیں۔ رسد لینے آئے تھے، باری ان کی نہ تھی۔ انہوں نے عجلت کی اور مجھے دھکا لگ گیا۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ غازیوں نے مولوی صاحب کے عفو و تحمل کی یہ داستان مولوی امام علی کو سنائی تو وہ بہت پشیمان ہوئے۔ خود سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی زیادتی کا صاف صاف اقرار کیا۔ ساتھ ہی کہا کہ مولوی صاحب سے میرا جرم معاف کرا دیجئے۔ یہی اسلامی اخوت کے یہ دلکشا مناظر جماعت مجاہدین میں عام تھے۔ انہیں سے سید صاحب کی شان تربیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جب سید صاحب پنجتار سے ہجرت کر کے راج دواری پہنچے تو مولوی عبدالوہاب نے رمضان شریف کی تراویح میں قرآن سید صاحب کو سنایا اور اس طرح ان کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ ۲۴ر ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ کو سید صاحب کے ساتھ جنگ بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔

رضائے باری تعالیٰ

مولوی سید جعفر علی نقوی نے قیام امب کا ایک واقعہ لکھا ہے جو سننے کے قابل

ہے۔ ایک روز سید صاحب نے فرمایا کہ دل دیوانے ہوتے ہیں۔ مجھے بہشت کی بھی خواہش نہیں، محض اللہ کی رضا پر نظر ہے۔ شاہ اسمٰعیل نے یہ سن کر کہا کہ یہ بڑا اونچا مرتبہ ہے، لیکن بہشت سے بے پروائی کا ذکر زبان پر نہ لائیں، اس لئے کہ بہشت سے مراد حق اور دوزخ سے مراد باطل ہے۔ مومن کے لئے حق سے بے پروائی مناسب نہیں۔

سید صاحب: جب خدا راضی ہوگا تو بندے کو خود بہشت میں بھیجے گا، اصل اس کی رضا ہے، بہشت رضا کی ایک شاخ ہے۔

شاہ اسمٰعیل: ایسا نہیں۔ بہشت کی بہترین شاخوں میں سے رضا ایک شاخ ہے۔

یہ سنتے ہی مولوی عبدالوہاب قاسم نغر نے یہ آیت پڑھی: وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ. وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ. ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (سورہ توبہ)
اور کہا: اس سے ظاہر ہوا، رضا دوسری چیز ہے، جس کا ایک ثمرہ بہشت بھی ہے۔

شاہ یقین اللہ

مولوی عبدالوہاب کے والد ماجد شاہ یقین اللہ سید صاحب کے مخلص مرید اور خلیفہ تھے۔ مجموعہ مکاتیب میں ایک خط بھی ان کے نام ملتا ہے، جس میں جنگِ شیدو، دورۂ بنیر وسوات اور اہلِ سرحد کے اتفاق کا ذکر ہے۔ اس میں شاہ یقین اللہ کو ان الفاظ سے مخاطب کیا گیا ہے:

> ”بخدمت فیض درجت سجادہ نشین ارشاد و تلقین، رہنمائے اربابِ صدق و یقین، یادگار اسلاف کرام، تذکار اولیائے عظام، مقبول بارگاہ الٰہ، مخدومی و مکرمی شاہ یقین اللہ مد اللہ ظلال ہدایتہ علی رؤس المستفیدین الی یوم الدین۔“

ان الفاظ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سید صاحب کی نظروں میں شاہ یقین اللہ کا رتبہ کتنا اونچا تھا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ میاں دین محمد نے سید صاحب

کے حکم سے پچیس روپے کی رقم شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کی تھی۔ ممکن ہے اس قسم کی اور رقمیں بھی دی گئی ہوں۔

مولوی نور احمد نگرامی

مولوی صاحب مجاہدین کے لشکر اور سید صاحب کے عقیدت مندوں میں ''مؤرخ اسلام'' کے لقب سے مشہور تھے۔ ابتدا ہی سے آپ کے ساتھ رہے اور سب سے پہلے آپ کے حالات لکھنے کا التزام کر لیا تھا۔ جو کچھ سنتے، سید صاحب سے اس کی تصدیق کرا لیتے۔ سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ مولوی صاحب نے تمام واقعات سید صاحب کو سنا کر ان کی تصحیح کر لی تھی۔ یہ کتاب دورانِ جہاد میں ان کے پاس تھی۔ افسوس کہ اس کا محض نام باقی رہ گیا اور کتاب کا سراغ اب تک نہ مل سکا۔

شہادت

مولوی صاحب جہاد میں سید صاحب کے ہمراہ تھے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کن کن جنگوں میں انہوں نے حصہ لیا۔ جنگ بالاکوٹ میں ان کی شرکت ثابت ہے۔ محمد امیر خاں قصوری کہتے ہیں کہ جنگ شروع ہو چکی تھی اور میں شالی کے کھیتوں سے آگے بڑھ کر ایک پتھر کی آڑ میں کھڑا بندوق چلا رہا تھا۔ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر مولوی نور احمد تھے۔ ایک گولی ان کے بازو پر لگی اور بولے: بھائی! میں تو معذور ہو گیا۔ میری چیزوں میں سے جو درکار ہو لے لو۔ میں نے گولیاں لے لیں۔ وہ پلٹ کر پیچھے کو چلے۔ اس حالت میں ایک اور گولی لگی اور وہ زمین پر بیٹھ گئے۔ پھر معلوم نہ ہو سکا کہ اسی جگہ شہید ہوئے یا کسی اور جگہ۔

شہادت اس بنا پر یقینی ہے کہ جنگ بالاکوٹ کے بعد کسی نے مولوی صاحب کو زندہ نہ دیکھا۔ چوں کہ سکھوں نے جنگ کے بعد بالاکوٹ کو آگ لگا دی تھی اور مجاہدین کی تمام

چیزیں جل گئی تھیں، اس لئے اغلب ہے کہ مولوی نور احمد کی مرتبہ سیرت بھی نذر آتش ہو گئی ہو۔ میں نے اس کتاب کی تلاش میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا، لیکن کسی نے اس کے وجود کی تصدیق نہ کی۔

جب سید صاحب نواب امیر خاں کے لشکر میں تھے تو انکے رفیقوں میں سید ظہور احمد نگرامی اور سید عبدالرزاق نگرامی کے نام بھی آئے ہیں، ممکن ہے یہ حضرات مولوی نور احمد نگرامی "مورخ اسلام" کے عزیزوں میں سے ہوں، مجھ پر حقیقت حال منکشف نہ ہو سکی۔

بائیسواں باب:

محمدی، باقر علی، محمد حسین، قمر الدین

منشی محمدی انصاری

منشی محمدی انصاری جنہیں بعض اوقات بردوانی بھی لکھتے ہیں، سید صاحب کے میر منشی تھے۔ ان کا وطن راج محل سے بارہ کوس کے فاصلے پر تھا۔ صحیح نام معلوم نہ ہو سکا۔

منشی صاحب نے اس زمانے میں بمقام میرٹھ بیعت کی تھی جب سید صاحب میرٹھ سہارنپور مظفر نگر وغیرہ کے دورے پر نکلے تھے۔ اس وقت منشی صاحب کی عمر انیس بیس سال سے زیادہ نہ ہوگی، اس لئے کہ دورانِ جہاد جن لوگوں نے انہیں دیکھا، ان کی عمر پچیس چھبیس سال کی بتائی۔ غالباً اسی وقت سے سید صاحب کی معیت اختیار کر لی۔ سفر حج میں سید صاحب کے ساتھ رائے بریلی سے روانہ ہوئے۔ راج محل پہنچ کر منشی صاحب سید صاحب کو باصرار اپنے وطن لے گئے اور منشی صاحب کے اکثر اقربا نے وہاں سید صاحب کی بیعت کی، مثلاً ان کے والد منشی شاہ محمد، منشی رؤف الدین، منشی مخدوم بخش، منشی حسن علی (جن کا رشتہ معلوم نہ ہو سکا)، منشی فضل الرحمٰن اور منشی عزیز الرحمٰن (یہ منشی صاحب کے ماموں تھے) اور لوگ بھی سید صاحب کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ منشی شاہ محمد حج کے لئے ساتھ گئے۔

اہل و عیال

واپسی میں مرشد آباد سے منشی صاحب کو وطن جانے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ نکاح

کر لیجیے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت منشی صاحب کا عنفوانِ شباب تھا۔ چنانچہ انہوں نے نکاح کیا اور خدا نے ایک بیٹا دیا، جس کا نام یحییٰ رکھا۔ خود فرماتے تھے: بچے کی محبت اس طرح دل میں پیوست ہو گئی کہ یہ بھی امتحانِ الٰہی بن گیا۔ تاہم کوئی شے منشی صاحب کو خدمتِ حق سے روک نہ سکی۔

ہجرت

جب ہجرت کی خبر ملی تو منشی صاحب بیوی بچے اور اقربا کو چھوڑ کر رائے بریلی پہنچ گئے اور سید صاحب کے ساتھ ہجرت کا شرف حاصل کیا۔ ان کے ماموں منشی فضل الرحمٰن بھی ساتھ تھے۔ سید صاحب منشی محمدی کو عموماً ''انصاری بھائی'' کہہ کر پکارتے تھے۔ تمام اہلِ لشکر انہیں ''بھائی صاحب'' کہتے تھے۔

انتظامِ دفتر

یہ بتایا جا چکا ہے کہ منشی صاحب کو تحریر پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اندھیرے میں بھی بے تکلف لکھتے، لیکن نہ سطر ٹیڑھی ہوتی، نہ الفاظ ایک دوسرے سے پیوست ہوتے۔ انہوں نے مختلف امور کے لئے الگ الگ بستے بنا لئے تھے۔ یہ بستے ایک بڑے صندوق میں رہتے۔ جس بستے کی ضرورت پڑتی، محافظوں سے کہہ کر صندوق میں سے نکلوا لیتے۔ ہر مہینے کے آغاز میں روزنامچے کی جدولیں تیار کرا لیتے۔ اس روزنامچے میں تمام حالات تفصیل سے لکھوا لیتے۔ سید جعفر علی نقوی جہاد کے لئے سرحد پہنچے اور منشی خانے سے وابستہ ہو گئے تو خبروں کی تبییض کا کام انہیں سے لیا جاتا۔

خاص نشانات

سید صاحب نے اپنی مہر شاہ اسمٰعیل کے حوالے کر دی تھی۔ شاہ صاحب یہ مہر کبھی

کبھی مولوی محمد حسن (رام پور منہاران) اور منشی محمدی انصاری کو دیدیتے تھے۔ منشی صاحب ہر مکتوب پر ایک اصطلاحی نشان بنادیتے۔ جس پر یہ نشان ہوتا، اس پر مہر لگائی جاتی۔ کسی کاغذ کے گوشے میں دستخط ''حضور'' لکھ دیتے۔ کسی کے گوشے میں ''مولانا''۔ ''حضور'' کا مطلب یہ ہوتا کہ مکتوب یا فرمان براہِ راست سید صاحب کی طرف سے ہے۔ لفظ ''مولانا'' کا مطلب یہ ہوتا کہ شاہ اسمٰعیل کی وساطت سے یہ فرمان جاری ہو رہا ہے۔

شہادت

ان کے ماموں منشی فضل الرحمٰن نے جنگِ مایار میں تورو اور مایار کے درمیان شہادت پائی، چنانچہ ان کی میت تورو میں دفن ہوئی۔ خود منشی صاحب کی شہادت بالاکوٹ میں سید صاحب کی شہادت گاہ کے قریب ہوئی۔ انہیں غالباً اس گنجِ شہیداں میں دفن کیا گیا جو قصبہ بالاکوٹ کے مغرب میں مٹی کوٹ کے ٹیلے سے قریب ہے۔

اخلاق و عادات

راویوں نے لکھا ہے کہ منشی صاحب بڑے مخلص، سید صاحب کے کمال کے معتقد اور آپ کے نزدیک نہایت معتبر و معزز تھے۔ اخلاص کا یہ عالم تھا کہ دورانِ جہاد میں کبھی کسی معاملے کے متعلق سید صاحب سے خفیف سے اختلاف کا موقع نہ آیا۔ سید صاحب کی طرف سے جو فیصلہ یا فرمان صادر ہوا، اس کی درستی کے بہ دل معتقد تھے۔ شہادت کے وقت عمر تیس برس سے کم تھی۔

باقر علی عظیم آبادی

یہ مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے ہم جد اور چچیرے بھائی تھے، شجرۂ نسب یوں ہے: باقر علی بن مولوی بشارت علی بن مولوی وارث علی بن ملا محمد سعید۔ مولوی وارث علی

کے دوسرے بیٹے مولوی فتح علی تھے جو مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کے والد تھے۔ مولوی بشارت علی کی شادی حضرت شاہ محمد معز ساکن محلہ ٹموہیہ کی صاحبزادی مسماۃ نجیبن سے ہوئی تھی۔ جوانی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ صرف دو بیٹے اور ایک بیٹی یادگار چھوڑی۔ یہ بچے کم سن تھے۔ مولوی فتح علی ہی نے ان کی پرورش کی۔

شانِ ارادت

سید صاحب حج سے مراجعت پر پٹنہ میں ٹھہرے تو خاندان اور شہر کے دوسرے افراد کے ساتھ مولوی باقر علی نے بھی بیعت کرلی۔ اس وقت سولہ سترہ سال کی عمر ہوگی۔ شادی نہ ہوئی تھی اور عیالداری کا کوئی جنجال نہ تھا۔ اس لئے اسی وقت سے مرشد کی رکاب پکڑلی اور ساتھ نہ چھوڑا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک موقع پر ننگے پاؤں سید صاحب کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے، راستے میں کھتے کا کانٹا چبھ گیا۔ شدید تکلیف کے باوجود یہ ایک لمحے کیلئے بھی نہ رکے اور برابر ساتھ رہے۔ منزل پر پہنچ کر کانٹا نکلوایا۔

نائب تقسیم رسد

جب سید صاحب جہاد کیلئے نکلے تو مولوی باقر علی پہلی جماعت میں شریک ہوئے۔ اس وقت مولوی محمد یوسف پھلتی سید صاحب کی طرف سے تمام انتظامات کے کفیل تھے۔ انہیں کے پاس روپیہ جمع ہوتا تھا، وہی جماعت مجاہدین کیلئے سارا سامان خریدتے تھے۔ مولوی باقر علی کو سید صاحب نے رسد کی تقسیم کے لئے ان کا نائب بنادیا تھا۔

راہِ حق کا پہلا شہید

اکوڑہ میں سکھوں کے لشکر پر شبخون مارنے کیلئے جو ایک سو چھتیس غازی منتخب ہوئے تھے، ان میں مولوی باقر علی بھی شامل تھے۔ ان کا شرف یہ ہے کہ سکھوں کی طرف سے جو

پہلی گولی مجاہدین کی طرف آئی وہ مولوی باقر علی کے لگی۔ زخم کاری تھا، وہ بیٹھ گئے اور بولے: بھائیو! میرا کام تمام ہوا۔ اب مجھ سے ہتھیار لے لو۔ یہ اللہ کا مال ہے۔ یہ کہتے ہی جاں بحق ہو گئے۔ گویا جماعتِ مجاہدین میں سے وہ راہِ حق کے پہلے شہید تھے۔ ان کے پاس دو پستول تھے، ایک تلوار اور ایک بندوق۔ پستولوں میں سے ایک کا نام بسم اللہ تھا اور دوسرے کا عبداللہ۔ غازیوں نے پستول تو سنبھال لیے، تلوار اور بندوق وہیں رہ گئیں۔ شہادت کے وقت صرف اٹھارہ انیس سال کی عمر تھی۔

شاہ محمد حسین عظیم آبادی

ان کے بزرگوں میں سے پہلے پہل میر معز الدین دیورہ میں آ کر آباد ہوئے اور پانچ ہزار بیگھ زمین انہیں معاش کیلئے عطا ہوئی۔ ان کی پانچویں پشت میں شیخ شاہ محمد ایک مشہور بزرگ تھے۔ ان کے بیٹے شاہ عبدالعلی اور پوتے شاہ ابوسعید نے بھی آبائی مقام ہی میں سکونت جاری رکھی۔ ابوسعید کے فرزند شاہ ابوالبرکات محمد فائض پہلے پہل پٹنہ میں آئے اور وہ مقام سکونت کیلئے پسند کیا، جہاں بعد میں محلہ تموہیہ آباد ہوا۔ انہوں نے ایک غیر آباد جنگ اونچی ٹیکری پر ایک حجرہ بنا لیا تھا۔ بعد ازاں ان کی بزرگی کے پیش نظر بادشاہ کی طرف سے خاصی زمین دے دی گئی۔ شاہ محمد حسین انہیں کی اولاد میں سے تھے۔ نسب نامہ یوں ہے: شاہ محمد حسین بن شاہ محمد معز بن شاہ محمد عزیز عرف شاہ درگاہی بن شاہ ابوالخیر محمد انور بن شاہ ابوتراب محمد منور بن شاہ ابوالبرکات محمد فائض۔

دعوت و تبلیغ

شاہ محمد حسین ۱۲۰۳ھ (۸۹-۱۷۸۸ء) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم اپنے چچا شاہ محمد کریم سے پائی۔ ابتداء ہی سے صوم و صلوٰۃ کے پابند اور طہارت و تقویٰ کے شیفتہ تھے۔ سید صاحب حج سے واپس آئے تو بیعت کی۔ اسکے بعد پورا وقت کتاب و سنت کی دعوت میں

صرف ہونے لگا، ان کے عقیدت مندوں کا دائرہ بہت پھیلا ہوا تھا۔ مظفر پور، دربھنگہ، چھپرہ، گیا، بہار، مونگیر، بھاگل پور وغیرہ کے اطراف میں مسلسل دورے فرماتے رہتے۔ ان کے ارشادات کی برکت سے لاکھوں آدمی کتاب وسنت کے پابند بن گئے۔

توسیع مسجد اور حج

ان کی خاندانی مسجد چھوٹی تھی، جس میں ایک سو آدمی بمشکل نماز ادا کر سکتے تھے۔ شاہ محمد حسین نے مسجد کو اتنا وسیع کر دیا کہ اس میں تین ہزار آدمی بے تکلف نماز پڑھ سکتے تھے۔ جمعہ اور عیدین کی نمازوں کیلئے پاس کے ایک میدان میں انتظام کیا جاتا۔ وعظ بہت سادہ ہوتا تھا، اسلئے عوام بھی اس سے مستفید ہوتے۔ رات کے وقت زنانے میں وعظ فرماتے اور ان میں دور نزدیک کی مستورات شریک ہوتیں۔ سب کیلئے کھانے پینے کا انتظام فرماتے۔

جہاد کے لئے ساتھ نہ گئے۔ غالباً سید صاحب نے خود انہیں روک دیا تھا اور دعوت وارشاد کا کام ان کے ذمے لگا دیا تھا۔ ۱۲۶۱-۶۲ھ (۱۸۴۵-۴۶ء) میں حج کیلئے گئے۔ اس سفر میں دو برس صرف ہوئے۔ دوران ''غدر'' میں پٹنہ کے کمشنر ٹیلر نے انہیں نیز مولانا احمد اللہ، مولانا واعظ الحق وغیرہ کو بعض شبہات کی بناء پر نظر بند کر دیا تھا۔ تقریباً تین مہینے اس ابتلا میں گذرے۔

سواری وسپہ گری

فن سپہ گری میں پورا دخل تھا۔ گھوڑے کی سواری میں مشاق تھے۔ آخری عمر تک گھوڑے کے سوا کوئی سواری استعمال نہ کی۔ ہمیشہ شریر گھوڑا خرید لیتے اور اسے سدھار کر فروخت کر دیتے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ ہاشمی تخلص تھا۔ قد میانہ، رنگ بہت گورا، نہایت خوب صورت اور وجیہ تھے۔

وفات

۸؍رجب ۱۲۷۶ھ (۳۱؍جنوری ۱۸۶۰ء) کو جمعرات کے دن وفات پائی۔ حکیم مولوی اسد اللہ نے تاریخ وفات کہی:

رفت بہ یوم الخمیس وز قدم پاک و صاف
زیب سرِ ارم شاہ محمد حسین!

آپ کی اہلیہ بی بی نصرت نے تقریباً ایک سو سال کی عمر پا کر انتقال کیا۔ مولوی محمد یوسف جعفری نے تاریخ وفات کہی:

چو جدہ ماجدہ ام بی بی نصرت ❁ جدا گشتہ ز ما زیر زمیں رفت
پئے تاریخ رحلت فکر کردم ❁ ندا آمد بہ فردوس بریں رفت

۱۲۹۹ھ

اولاد

شاہ محمد حسین کے ایک بیٹا اور چھ بیٹیاں تھیں۔ بیٹے کے کوئی اولاد نہ تھی۔ بیٹیوں میں سے ایک نے بچپن میں وفات پائی۔ باقی پانچ میں سے چار کے نکاح ان بزرگوں سے ہوئے جو سید صاحب کی تحریک جہاد میں سرگرمی سے شریک رہے۔ مثلاً:

۱۔ **مولانا احمد اللہ:** بہ سلسلۂ اعانت مجاہدین حبس دوام کی سزا پائی اور جزائر انڈمان میں فوت ہوئے۔ بڑی صاحبزادی ان کے نکاح میں تھی۔

۲۔ **مولانا یحییٰ علی:** بہ غرض جہاد سرحد میں بھی رہے۔ پھر جماعت مجاہدین کیلئے دعوت و تنظیم میں مشغول ہو گئے۔ گرفتار ہوئے اور پھانسی کی سزا پائی جسے عمر قید میں بدل دیا گیا۔ جزائر انڈمان ہی میں فوت ہوئے۔ دوسری صاحبزادی ان کے نکاح میں تھی۔

۳۔ **مولوی فیض علی:** مولانا ولایت علی کے ساتھ جہاد میں شریک رہے۔ تیسری صاحبزادی ان کے نکاح میں تھی۔

۴۔ **مولوی اکبر علی:** مولانا ولایت علی کے ساتھ مجاہدین میں شریک رہے۔ پھر وطن میں بہ عارضہ ہیضہ وبائی انتقال کیا۔ جو صاحبزادی ان کے نکاح میں تھی اس کا نکاح ثانی مولانا عنایت علی سے ہوا جو مولانا ولایت علی کے بعد امیر المومنین ہوئے اور انگریزوں سے لڑتے ہوئے چنگئی (سرحد آزاد) میں وفات پائی۔

ان حضرات کے مفصل حالات کتاب کی آئندہ جلد میں بیان ہونگے، انشاءاللہ تعالیٰ۔

قمر الدین حسین

شجرۂ نسب یہ ہے: قمر الدین حسین بن رکن الدین حسین بن رفیع الدین حسین نائب ناظم بہار۔ رفیع الدین اور ان کے والد روح الدین حسین مغل بادشاہوں کی طرف سے بہار کے نائب ناظم رہے، اس لئے وہاں کے اکابر امراء میں شمار ہوتے تھے۔ رفیع الدین حسین قمر الدین حسین کے دادا، مولانا ولایت علی کے نانا تھے۔ یہ بہار کا دوسرا بڑا خاندان تھا، جس سے قمر الدین حسین کو قرابت قریبہ حاصل تھی۔

بیعت و رفاقت

ان کی شادی مولوی الٰہی بخش کی صاحبزادی جمیلۃ النساء سے ہوئی تھی۔ مولوی صاحب موصوف بھی عظیم آباد کے رؤسا میں محسوب تھے۔ قمر الدین حسین نے اسی زمانے میں سید صاحب سے بیعت کی جب آپ حج سے واپس آتے ہوئے عظیم آباد ٹھہرے تھے۔ اسی وقت سے رفاقت اختیار کر لی۔ بیعت امامت جہاد کے بعد سید صاحب نے بلوا بھیجا تو توقف کئے بغیر سرحد پہنچے۔

شہادت

سید صاحب نے مولوی مظہر علی عظیم آبادی کو پشاور میں قاضی مقرر کر دیا تو انہوں نے جن اصحاب کو اپنے ساتھ رکھا اُن میں سے ایک قمر الدین حسین تھے۔ ممکن ہے مولوی صاحب نے انہیں ہم وطنی کی بنا پر چنا ہو۔ ممکن ہے قمر الدین حسین مولوی صاحب کی جماعت میں شریک ہوں۔ بہر حال یہ مولوی صاحب کے ساتھ رہے اور بتایا جاتا ہے کہ انہیں کے ساتھ شہید ہوئے۔ اولاد کوئی نہ تھی۔ ان کی بیوہ کا نکاحِ ثانی مولانا ولایت علی سے ہو گیا۔ صاحب درہلشور نے لکھا ہے کہ بہار و بنگال میں بیوہ کا یہ پہلا نکاحِ ثانی تھا۔

تیئیسواں باب:

احمد اللہ، خیر آبادی گھرانا، عبدالمجید خاں

احمد اللہ ناگ پوری

مولانا عبدالحیٔ کے چچیرے بھائی تھے۔ بعض نے علاتی بھائی لکھا ہے، لیکن اس کی تصدیق کسی ذریعے سے نہ ہوسکی۔ عجیب امر یہ ہے کہ اتنے قریبی رشتے کے باوجود دونوں بھائیوں میں ظاہری ملاقات کبھی نہ ہوئی تھی۔ مولانا عبدالحیٔ سرحد چلے آئے تو مولوی احمد اللہ نے زیارت کا پختہ ارادہ کر کے کمر ہمت باندھ لی اور ٹونک ہوتے ہوئے سرحد پہنچے۔ چند آدمی بھی ساتھ تھے۔ اس وقت سید صاحب خہر میں مقیم تھے، مولوی احمد اللہ کے خہر آنے سے صرف تین چار دن پیشتر مولانا عبدالحیٔ نے وفات پائی۔ یہ جانکنا خبر مولوی احمد اللہ کو درگئی میں ملی۔ ان کے رنج و قلق کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ صرف بھائی کے اشتیاقِ دیدار میں اتنا لمبا اور کٹھن سفر اختیار کیا، لیکن شوق پورا نہ ہوسکا۔

کمالات

خہر پہنچ کر سید صاحب سے ملاقات ہوئی تو معاً بیعت کر لی اور رفیقانِ خاص میں شامل ہوگئے۔ علم و تقویٰ میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ تیر اندازی، چابک سواری اور کشتی کے فنون میں استادِ کامل تھے۔ جانوروں کے علاج میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ دعوتِ اسماء کے بھی ماہر مانے جاتے تھے۔ ایک موقع پر کوئی شخص سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے ایک عزیز کو آسیب کا عارضہ ہے۔ مہربانی فرما کر کوئی تدبیر کیجئے۔

سید صاحب نے مولوی احمد اللہ کو بھیجنا چاہا۔ انہوں نے عذر کیا کہ اس میں گوشت ترک کرنے کے علاوہ بعض اور پابندیاں بھی ہیں۔ سید صاحب نے پوچھا آپ پڑھتے کیا ہیں؟ عرض کیا وہی اسماء جو قرآن مجید میں آئے ہیں۔ پوچھا کوئی اور چیز تو نہیں؟ عرض کیا نہیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ بے تکلف جایئے۔

مختلف خدمات

سید صاحب نے مولوی صاحب کو ایک جماعت کا سالار بنا دیا تھا۔ مختلف فنون میں باکمال ہونے کے باعث وہ غازیوں کی تربیت بھی فرمایا کرتے تھے۔ سید صاحب کی اہم مجالسِ شوریٰ میں بہ طور رکن شریک ہوتے تھے۔ پنجتار کے شمال میں کوئی میل ڈیڑھ میل پر قاسم خیل ایک گاؤں ہے، مولوی احمد اللہ نے وہاں گولے ڈھالنے کا ایک کارخانہ بنایا تھا۔ مولوی خیر الدین شیرکوٹی بھی اس کام میں شریک تھے۔ ایک موقع پر سید صاحب نے مرکز سے باہر جاتے وقت انتظام ان کے حوالے کر دیا تھا۔

بالاکوٹ

مولوی سید جعفر علی نقوی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود نیز شیخ محمد اسحاق گورکھپوری، حافظ مصطفیٰ کاندھلوی جیسے لوگ مولوی احمد اللہ کی جماعت میں شریک تھے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے جنگِ بالاکوٹ سے ایک رات پیشتر اپنی پوری جماعت کو دعوتِ طعام دی۔ مولوی جعفر علی سے کہا کہ میں امیر المومنین کے ساتھ رہوں گا، جنگ میں جماعت کی قیادت آپ کیجیے گا۔ نقوی نے عذر کیا کہ مجھے افسری کا تجربہ نہیں۔ حافظ مصطفیٰ کو یہ منصب سونپ دیجیے۔

مولوی احمد اللہ: حافظ مصطفیٰ بھی میرے ساتھ ہوں گے۔

نقوی: تو شیخ اسحاق کو امیر بنا دیجیے۔

مولوی احمد اللہ: وہ ذرا جوشیلے آدمی ہیں اور امارت کیلئے متین آدمی کی ضرورت ہے۔

نقوی: پھر میں حسن خاں بناری کا نام پیش کرتا ہوں۔

مولوی احمد اللہ: بھائی! کیا آپ طے کر چکے ہیں کہ میرا حکم نہ مانیں گے؟

نقوی: میں معافی مانگتا ہوں۔ محض اپنی ناتجربہ کاری اور ناتوانی آپ پر واضح کر رہا تھا۔

مولوی صاحب یہ الفاظ سن کر مسکرائے اور جماعت کو حکم دیا کہ میدان جنگ میں تمام بھائی سید جعفر علی نقوی کے احکام کی تعمیل کریں۔

یہ امر یقینی ہے کہ مولوی صاحب جنگ بالاکوٹ میں خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوئے۔ شہادت کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

نیزہ بازی

مولوی احمد اللہ اگرچہ تمام فنونِ حرب میں طاق تھے اور نیزہ بازی میں بھی کمال حاصل تھا لیکن ایک مرتبہ مشق میں سید صاحب سے مقابلے کا موقع آن پڑا تو معلوم ہوا کہ نیزہ بازی میں مزید تعلیم کی ضرورت ہے۔ نواب وزیر الدولہ نے ایک نہایت عمدہ گھوڑا سید صاحب کیلئے بھیجا تھا، آپ نے وہ مولوی احمد اللہ کو دیدیا کہ اسے سدھائیں۔ چند روز کے بعد اس پر سواری کی تو معلوم ہوا کہ بہت اچھا ہے۔ آپ کی عادتِ شریف یہ تھی کہ کوئی شخص کسی فن کا ماہر ہوتا تو اس فن میں اپنی مہارت اس کے سامنے ظاہر نہ کرتے، لیکن سواری کرتے ہوئے مولوی احمد اللہ سے فرمایا کہ آپ نیزہ بازی کے ماہر ہیں، ذرا دو چار ہمیں بھی ہاتھ دکھایئے۔ سیکڑوں لوگ تماشا دیکھنے کیلئے جمع ہو گئے۔ لٹو والے ڈنڈے لے کر کسرت شروع کی۔ سید صاحب نے مولوی صاحب سے فرمایا کہ دھر میں دریغ نہ کیجئے، لیکن جب تک کسرت جاری رہی، مولوی صاحب کبھی پہلو میں کبھی

شانے میں اور کبھی گردن میں ضربیں کھاتے رہے۔ بہت ہوشیاری کرتے لیکن بچ نہ سکتے۔ آخر مولوی صاحب نے کہا کہ میں نے نیزہ بازی بڑے ماہر استاد سے سیکھی ہے، لیکن جو پیچ آج دیکھے ہیں وہ تو خواب وخیال میں بھی نہ تھے۔ چنانچہ سید صاحب سے درخواست کی کہ یہ پیچ سکھا دیں۔ بعد ازاں سید صاحب دوسرے تیسرے دن مولوی صاحب کو نیزہ بازی کے خاص پیچ سکھاتے اور یہ سلسلہ کوئی دو مہینے تک قائم رہا۔ (۱)

خیر آبادی مجاہد

ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ کسی خاندان کے تمام افراد نے بیک وقت جہاد فی سبیل اللہ کے لئے قدم اٹھایا ہو۔ سید صاحب کے رفیقوں میں سے خیر آباد کا ایک گھرانا اس لحاظ سے خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ چھ بھائی تھے۔ تمام نے سید صاحب سے بیعت کی اور تمام ساتھ جانے کے لئے ہمہ تن تیار ہوگئے، ان کے والد بھی جہاد میں شریک رہے۔ تفصیل ذیل میں درج ہے:

۱۔ گوہر خاں

چھ بھائیوں میں یہ سب سے بڑے تھے۔ سید صاحب نے جب وطن چھوڑ کر جہاد کے لئے سرحد پہنچنے کا ارادہ کرلیا تو تکیہ شریف سے بایں غرض خیر آباد آئے کہ اہل وعیال کو لے کر روانہ ہوں۔ اتفاق سے اسی اثناء میں وفات پائی۔ چوں کہ جہاد کے لئے ہجرت کی پختہ نیت کیے بیٹھے تھے، اس لئے پورے ثواب کے مستحق ٹھہرے۔

۲۔ امام خاں

یہ مختلف جنگوں میں شریک رہے۔ سید صاحب پائندہ خاں سے ملنے کے لئے عشرہ

---

(۱) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو "وقائع احمدی"۔

گئے تھے تو شاہ اسمٰعیل نے احتیاطاً مجاہدین کی ایک جماعت کو مقامِ ملاقات سے قریب ایک پوشیدہ جگہ بٹھا دیا۔ اس جماعت میں امام خاں اور ان کے بھائی محمد خاں اور ابراہیم خاں بھی شریک تھے۔ جب سردار پائندہ خاں نے مجاہدین کا راستہ روک کر جنگ کی صورت پیدا کر دی تو اس کے ساتھ کئی لڑائیاں پیش آئیں، جن میں سے کوہ کنیر ڑی کی جنگ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ عشرہ (زرداب) کے سامنے کنیر ڑی ایک برج نما ٹیلا ہے۔ مجاہدین کا ایک جیش ارباب بہرام خاں تہکالی کی سرکردگی میں اس ٹیلے پر جا بیٹھا تھا۔ سردار پائندہ خاں نے صلح کا فریب دے کر مجاہدین کی جنگی سرگرمیوں کو معطل کرا دیا اور اس اثناء میں اچانک کوہ کنیر ڑی پر حملہ کر دیا۔ شیخ بلند بخت دیوبندی، مولوی خیر الدین شیر کوٹی اور امام خاں خیرآبادی مجاہدین میں ممتاز مانے جاتے تھے، تینوں کوہ کنیر ڑی کے جیش کے ساتھ تھے۔

پائندہ خاں کے لشکر نے اس پہاڑ پر بیک وقت دو جانب سے حملہ کیا۔ اگرچہ ان کے آدمیوں کو بھی سخت نقصان پہنچا لیکن پہلی ہی بار میں چھ غازی شہید ہو گئے۔ اس اثناء میں سید دلاور علی کے گولی لگی۔ وہ گرے تو پاس کے غازیوں نے ان کے ہاتھ پکڑ لئے۔ پائندہ خاں کے آدمی انہیں ٹانگوں سے پکڑ کر نیچے کھینچنے لگے۔ امام خاں نے اپنے مورچے سے ذرا آگے بڑھ کر بندوق سر کی۔ معاً ایک گولی ان کی کنپٹی میں لگی اور آناً فاناً شہادت پائی۔ (۱)

۳۔ محمد خاں

یہ مختلف جنگوں میں شریک رہے۔ ہزارہ میں سکھوں کے خلاف اقدامات کا فیصلہ ہوا اور سید احمد علی (خواہرزادۂ سید صاحب) کو سپہ سالار بنا کر بھیجا گیا تو محمد خاں بھی اس لشکر

---

(۱) غلط فہمی کے ازالے کیلئے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ خیرآباد کے ایک امام خاں اکوڑہ میں شہید ہوئے تھے، وہ ان کے علاوہ تھے۔

میں شریک تھے۔ سکھوں نے پھولڑہ میں غازیوں پر حملہ کیا اور گھمسان کا رن پڑا تو سکھ ایک موقع پر اژدر نام ایک گھوڑے کو پکڑ کر لے گئے جو ارباب بہرام خاں نے بطور نذرانہ سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا اور ان کی خاص سواری کا گھوڑا سمجھا جاتا تھا۔ سید احمد علی کو غازیوں کے لشکر کا سالار بنایا تو سید صاحب نے اپنی بعض دوسری چیزوں کی طرح گھوڑا بھی انہیں دے دیا تھا۔

محمد خاں نے جب دیکھا کہ سکھ اژدر کو لئے جا رہے ہیں تو پکار کر کہا: بھائیو! یہ امیر المومنین کی سواری کا گھوڑا ہے۔ اسے دشمن کے قبضے میں نہ جانے دو۔ یہ کہتے ہی بجلی کی طرح تنہا سکھوں پر جا گرے۔ کچھ اور غازی بھی ان کے ساتھ ہو گئے اور اژدر کو چھڑا لائے۔ سکھوں نے دوبارہ حملہ کر دیا۔ غازی تعداد میں بہت کم تھے، چنانچہ گھوڑا بھی مارا گیا اور بعض غازیوں کے ساتھ محمد خاں بھی شہید کر دیے گئے۔ پھولڑہ کے گنج شہیداں میں دفن ہوئے۔

۴۔ ابراہیم خاں

یہ جنگ بالاکوٹ کے بعد کئی سال شیخ ولی محمد پھلتی کے ساتھ رہے۔ پھر غالباً انہیں کے ساتھ ٹونک آگئے اور وہیں اقامت اختیار کر لی۔ نواب وزیرالدولہ مرحوم والی ٹونک کی والدہ ماجدہ حج کے لئے گئیں تو ابراہیم خاں بھی ساتھ تھے۔ اسی سفر میں وفات ہوئی۔

احمد خاں اور ارادت خاں

پانچویں بھائی احمد خاں اور چھٹے بھائی ارادت خاں دورانِ جہاد میں طبعی موت مرے۔

غور فرمائیے کہ ان چھ بھائیوں کی زندگی اور موت کس درجہ قابل رشک تھی۔ ان کے والد جن کا نام معلوم نہیں، جہاد میں برابر شریک رہے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالاکوٹ کی جنگ میں شہید ہوئے۔

عبدالمجید خاں آفریدی

یہ جہان آباد (رائے بریلی) کے باشندے تھے۔ مجاہدین کی اس جماعت میں شریک ہوکر سرحد پہنچے جو سید صاحب کے ساتھ گئی تھی اور جسے مجاہدین کا ہراول سمجھنا چاہیے۔ وہاں سب سے پہلی جنگ اکوڑہ میں پیش آئی، جہاں بدھ سنگھ سکھوں کا بھاری لشکر لئے بیٹھا تھا۔ جس کی تعداد سات ہزار سے دس ہزار تک بتائی جاتی تھی۔ سید صاحب نوشہرہ میں مقیم تھے۔ اس سے مقصود نوشہرہ شہر یا پرانا نوشہرہ ہے جو دریائے لنڈے کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ نوشہرہ چھاؤنی مقصود نہیں جو مغربی کنارے پر ہے اور جہاں ریلوے اسٹیشن ہے۔ چوں کہ سکھوں کا لشکر بہت بڑا تھا، اس لئے شبخون مارنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس غرض کیلئے ہندوستانی غازیوں میں سے ایک سو چھتیس قوی اور توانا آدمی منتخب کیے گئے۔ سات آٹھ سو سرحدی غازی ساتھ ہو گئے۔ چوں کہ جانے آنے میں پندرہ سولہ میل کا فاصلہ طے کرنا لازم تھا، اس لئے انہیں لوگوں کو منتخب کیا گیا جو بے تکلف فاصلہ طے کر سکتے تھے۔ عبدالمجید خاں ان دنوں بخار میں مبتلا رہنے کے باعث بہت کمزور ہو گئے تھے، اس لئے ان کا نام اس فہرست میں شامل نہ کیا گیا۔

نیکی میں سبقت

انہیں جب یہ کیفیت معلوم ہوئی تو بیتاب ہوکر سید صاحب کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا:

حضرت! میں کچھ ایسا بیمار تو ہوں نہیں کہ چلنے کی طاقت نہ ہو، اور یہ پہلا معرکہ ہے۔ جس میں جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد رکھی جائے گی۔ میرا نام ضرور شامل فرما لیجئے تاکہ سبقت کی فضیلت سے محروم نہ رہ جاؤں۔

عبدالمجید خاں کی بیتابی دیکھ کر سید صاحب نے ان کی درخواست قبول کر لی اور دعاء فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ہمت میں برکت دے۔

شہادت

جنگِ اکوڑہ کی تفصیلات بیان کرنے کا یہ موقع نہیں، لیکن یہ بتا دینا چاہیے کہ عبدالمجید خاں نے خاصی کمزوری کے باوجود جنگ میں انتہائی مردانگی دکھائی۔ چودہ آدمی ان کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ پھر ان کی تلوار ٹوٹ گئی۔ مولوی خیرالدین ولایتی کے پاس دو تلواریں تھیں، انہوں نے معاً ایک تلوار عبدالمجید خاں کے حوالے کر دی۔ اس سے بھی کئی دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ منظورہ کے الفاظ ہیں:

> ازآں ہم چند کس را کشتند۔

پھر خود بھی جامِ شہادت نوش کر کے "عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ" کے انعام یافتہ گروہ میں شامل ہو گئے۔

چوبیسواں باب:

شہزادہ گدڑی، انور شاہ، اکبر خاں

شہزادہ گدڑی

بیعت امامت جہاد کے بعد جو مخلصین سید صاحب کی خدمت میں پہنچے، ان میں سے ایک صاحب گدڑی شہزادہ کے لقب سے مشہور تھے۔ وقائع میں انہیں "جلیل القدر پیرزادہ" بتایا گیا ہے۔ سید محمد خاں دارنی نے اپنے ایک مکتوب میں انہیں "صاحبزادہ گدڑی" لکھا ہے۔ موصوف نے بیعت کی تو کہا: میں خالصۃً لوجہ اللہ حاضر ہوا ہوں۔ آج کے بعد آپ کا ساتھ چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

درانی سردار سے ملاقات اور مشوروں کیلئے آئے تو سید صاحب بھی ہنڈ سے پانسو آدمیوں کے ساتھ نوشہرہ پہنچے۔ ساتھیوں میں فتح خاں رئیس پنجتار، اشرف خاں رئیس زیدہ اور خادے خاں رئیس ہنڈ کے علاوہ شہزادہ گدڑی بھی شامل تھے۔ سید صاحب ہنڈ واپس چلے گئے لیکن گدڑی شہزادہ کو سردار یار محمد خاں نے روک لیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ شہزادہ درانی سرداروں کے نزدیک بہت ہی معزز و محترم تھا۔

شہادت

وہ شیدو کی جنگ میں شریک ہوا، جس میں کم و بیش ایک لاکھ آدمی سید صاحب کے زیر علم جمع تھے اور نظر بظاہر یقین تھا کہ غازیوں کی یہ کثیر التعداد فوج سکھوں کو شکست فاش دے کر اٹک پر پیش قدمی کرے گی اور تطہیر پنجاب کا کام احسن طریق پر شروع ہو جائے

کا، لیکن یار محمد خاں کی خیانت و غداری کے باعث یہ خوش گوار امید پوری نہ ہو سکی۔ وہ عین کامیابی کی حالت میں اپنی فوج لے کر میدان سے بھاگ گیا۔ اس کے بھائی بھی ساتھ ہی فرار ہو گئے۔ یہ حالت دیکھ کر عام سرحدی خوانین کے پائے ثبات میں بھی لغزش پیدا ہو گئی۔ صرف چند مخلص خوانین، ہندوستانی غازی اور شہزادہ گدڑی چٹان کی طرح اپنی جگہ جمے رہے۔

شہزادہ گدڑی کا مورچہ شیدو گاؤں میں تھا، وہ اپنا جیش لے کر سکھ لشکر گاہ کے قریب پہنچا اور خار بندی سے گذر کر اندر داخل ہو گیا۔ پیچھے فرار کا نقشہ دیکھا تو حیران رہ گیا۔ حالت جنگ میں معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ کیا صورت پیش آئی۔ سکھوں نے اس پر ہجوم کیا تو قدم بہ قدم پیچھے ہٹنے لگا۔ پہلے اپنے گاؤں والے مورچے پر پہنچا۔ سکھوں کا ہجوم بہت بڑھ گیا تو اور پیچھے ہٹ کر قبرستان میں مورچہ قائم کر لیا۔ وہیں خونِ شہادت میں تیرتا ہوا مالکِ حقیقی کے دربار میں پہنچ گیا۔

منظورہ کا بیان

یاد ہو گا، ڈیڑھ دو مہینے پیشتر سید صاحب کی بیعت کرتے ہوئے عہد کیا تھا کہ آپ کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گا۔ شیدو کے میدان میں اس صادق العہد نے اپنے پیمان پر خونِ شہادت سے مہر لگا دی۔ "منظورہ" کا بیان ہے کہ رستمانہ شجاعت سے کام لیتے ہوئے بہت سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اپنی جماعت کے ساتھ جو استقامت میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی حیثیت رکھتی تھی، قدم جما کر دادِ شجاعت دی اور جنت لے کر جانِ جاں آفریں کے حوالے کی۔

پرانا شیدو موجودہ آبادی سے تھوڑے فاصلے پر دریا کے عین کنارے واقع تھا۔ طغیانی میں وہ منہدم ہو گیا، اب صرف کھنڈر باقی ہیں۔ وہیں شہزادہ گدڑی کی قبر ہے۔

شیدو کے تمام لوگ اس غیور مجاہد کے نام سے واقف ہیں اور اسے خاص احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

سید انور شاہ

سید انور شاہ امرتسر کے سادات کرام میں سے تھے۔ سنا جاتا ہے کہ رنجیت سنگھ کے دربار میں بھی انہیں احترام کا درجہ خاص حاصل تھا۔ سکھ امراء اور عوام بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ سکھوں کے کسی مذہبی پیشوا کا ایک عزیز اُن کے پاس آتا جاتا تھا۔ اس نے مسلمان ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ سید انور شاہ نے بے تکلف اسے کلمہ پڑھایا۔ اس وجہ سے تمام سکھ ان کے دشمن بن گئے۔ نو مسلم کے رشتہ داروں نے ہنگامہ بپا کر دیا۔ منظورۃ السعداء سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے سید انور شاہ کی ناک کاٹ دی۔ ''منظورہ'' کے الفاظ یہ ہیں کہ ''حسن چہرۂ زیبائش بہ نقصان سرِ بینی متغیر ساختند''۔ اس واقعے کے بعد سکھ حکومت نے انہیں گھر ہی میں نظر بند کر دیا اور وہ اس مصیبت سے نجات پا کر سکھ حکومت کے خلاف جہاد آرائی کی تدبیریں سوچنے لگے۔

جلاوا

سید صاحب تکیہ شریفہ میں جہاد کی تیاریاں کر رہے تھے تو ہندوستان کے گوشے گوشے سے ان تمام افراد کے متعلق اطلاعیں حاصل کرنے کا انتظام کر رکھا تھا، جن سے جہاد میں امداد کی امید ہو سکتی تھی۔ اس سلسلے میں سید انور شاہ کے حالات بھی معلوم ہو گئے۔ قرینہ یہ ہے کہ سید صاحب نے ان سے ربط و علاقہ بھی پیدا کر لیا تھا۔ چنانچہ راہِ ہجرت میں قدم رکھا تو فتح پور سے حاجی یوسف کشمیری کو امرتسر روانہ فرما دیا کہ سید انور شاہ کو ہر ممکن تدبیر سے ساتھ لے کر سندھ پہنچ جائے۔

ہجرت

حاجی یوسف امرتسر پہنچا تو سید انور شاہ کے نکلنے کا ایک خدا ساز سامان ہو گیا۔ جو سکھ افسر ان کی نگرانی پر مامور تھا، وہ کسی بات پر ناراض ہو کر نگرانی کا کام چھوڑ بیٹھا۔ دوسرا آدمی اس کی جگہ مقرر نہ ہوا تھا۔ سید انور شاہ نے فرصت کو غنیمت سمجھا۔ اپنے پندرہ خادموں کو تین گھوڑے اور بار برداری کے اونٹ دے کر الگ الگ خفیہ خفیہ بھیج دیا۔ پھر خود چپ چاپ نکلے اور بہاول پور کی سرحد میں داخل ہو گئے، وہاں ان کی ملاقات سید دین محمد قندھاری سے ہوئی، جنہیں سید صاحب نے جہاد کا دعوت نامہ دیکر نواب بہاول خاں کے پاس بھیجا تھا۔ سید صاحب نے پہلے شکار پور میں ان کا انتظار کیا۔ پھر اکبر خاں کو دس غازیوں کے ساتھ سید انور شاہ کے استقبال کے لئے شکار پور میں چھوڑا اور خود جاگن چلے گئے۔ وہیں سید انور شاہ صاحب سے ملحق ہوئے۔ محمد یوسف راستے میں کسی بات پر ناراض ہو کر الگ ہو گیا تھا۔

جنگ بازار

سید انور شاہ بڑے عقیل و فہیم اور تجربہ کار شخص تھے۔ اس لئے مشوروں میں برابر شریک رہے ہوں گے۔ لیکن ان کی سرگرمیوں کی تفصیلات کہیں نہیں ملتیں۔ جن دنوں سید صاحب ہنڈ میں ٹھہرے ہوئے تھے، ملکی لوگوں نے بطور خود حضرو پر شبخون مارا تھا۔ وہ مال غنیمت لے کر واپس آ رہے تھے کہ سکھوں نے حملہ کر دیا۔ ان کے بچاؤ کیلئے سید صاحب کو بھی نکلنا پڑا۔ چنانچہ آپ نے سید انور شاہ کو پچاس ساٹھ آدمیوں کے ساتھ دریا کے پار بھیج دیا تاکہ حملہ آوروں کا مقابلہ کریں۔

سید انور شاہ نے کشتی کے ذریعے سے دریا عبور کیا اور مناسب مقام پر مورچے بنا کر لڑنے لگے۔ آخر سکھ بھاگ نکلے۔ ہنڈ کی طرف سے کشتیاں بھیج دی گئیں۔ تمام لوگ ان

میں سوار ہو کر آ گئے۔ سید انور شاہ صبح کے وقت گئے تھے۔ تمام ساتھیوں کو اپنے سامنے کشتیوں میں سوار کرا کے سب کے بعد خود سوار ہوئے اور مغرب کے وقت ہنڈ پہنچے۔

مراجعت

اس واقعے کے بعد سید انور شاہ کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ واپس آ گئے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے کیا تدبیر کی، اس کا کچھ علم نہیں۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد جو غازی مسافروں کے بھیس میں واپس آئے، ان میں سے بعض کے بیانات میں مرقوم ہے کہ امرتسر میں سید انور شاہ نے ان کی تواضع میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ باطمینان اپنے وطن میں مقیم ہو گئے تھے۔

اکبر خاں

رائے بریلی وطن، فنونِ جنگ میں مشاق تھا۔ خہر میں غازیوں سے قواعد اور نشانہ بازی کی مشق کرانے کا حکم جاری ہوا تھا تو اکبر خاں ان لوگوں میں شریک تھا جو مختلف فنونِ جنگ سکھانے کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے۔ ملیح آباد کے ایک غازی رسول خاں نے اپنے نو عمر بھتیجے کو تربیت کی غرض سے اکبر خاں کے حوالے کر دیا تھا۔ وہاں مختلف لوگ سید صاحب کیلئے مٹھائیاں بطور نذرانہ لاتے۔ بچے نے ان میں سے دو لڈو اجازت کے بغیر کھا لئے۔ اکبر خاں نے تادیباً ایک تھپڑ مارا۔ رسول خاں نے یہ واقعہ سنا تو معاً جوش میں آ گیا اور اکبر خاں کو بہت سخت سست کہا۔ سید صاحب کو یہ حالات معلوم ہوئے تو رسول خاں کو بلا کر خاطر داری سے پاس بٹھایا، مزاج پوچھا، پھر شفقت بھرے انداز میں کہا ہم نے سنا ہے کہ اکبر خاں نے آپ کے بھتیجے کو دھول ماری، سو آپ کو اس کا بڑا رنج ہوا۔ یہ بات آپ کو نہ چاہیے۔ انہوں نے اپنا لڑکا سمجھ کر تعلیماً مارا ہوگا۔

رسول خاں کا غصہ تو پہلے ہی فرو ہو چکا تھا۔ سید صاحب کا ارشاد سن کر عرض کیا کہ

اکبر خاں میرے بھائی ہیں، بھتیجے کو مارا تو خوب کیا۔

اکوڑہ اور بازار

اکبر خاں اکوڑہ کی جنگ میں شریک تھا اور اس میں تلوار کا ایک زخم کھایا تھا، اسی نے مجاہدین کو یہ کہہ کر جنگ سے روکا تھا کہ آخری فیصلہ اسی میدان میں نہ ہوگا۔ اب واپس چلو انشاء اللہ پھر لڑیں گے۔ سید صاحب نے اسے ایک دستار عنایت کر رکھی تھی۔ جب سید صاحب ہنڈ کے قریب موضع بازار میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ملکی لوگوں نے حضرو پر چھاپا مارا تھا تو سکھوں کے جوابی حملے نے ملکیوں کے لئے شدید خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ اس موقع پر سید صاحب نے اپنے غازیوں کو دفاع کا حکم دیا۔ بعض لوگ کشتیوں پر سوار ہو کر دریا عبور کر کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے تاکہ سکھوں سے دست بدست جنگ کریں۔

اکبر خاں بھی آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ اس اثناء میں ایک ملکی بہادر مشکیزہ بغل میں دبا کر دریا میں کود پڑا۔ اکبر خاں نے اس کی شانِ سبقت دیکھ کر سید صاحب کی عطا کی ہوئی دستار اس غازی کے سر پر رکھ دی اور کہا کہ آج اس دستار کا مستحق آپ سے بڑھ کر کوئی نہیں اور اس کا پٹکا لے کر اپنے سر پر لپیٹ لیا۔ سید صاحب نے بعد میں اکبر خاں کو نئی دستار دے دی۔

مجاہدین کی جماعتیں چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم تھیں۔ ان ٹکڑیوں کو اصطلاح میں بہیلہ کہتے تھے اور ان کے افسر بہیلہ دار کہلاتے تھے۔ اکبر خاں بھی بہیلہ دار تھا۔ بعد کے پورے حالات معلوم نہ ہوسکے صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ قیامِ خمر کے زمانے میں مجاہدین نے فوجی مشق شروع کی تھی تو چقماقی بندوقوں اور قرابینوں والے مجاہدین کی نگرانی و تعلیم اکبر خاں کے ذمے تھی۔

پچیسواں باب:

اللہ بخش، امیر اللہ، کالے خاں

اللہ بخش مورانیں

سید صاحب نے جب پہلی مرتبہ کان پور کا دورہ کیا تو چار چھیلے اور کڑیل جوان بیعت کی غرض سے انکی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے دیکھتے ہی فرمایا، ایسے جوان تو ہمارے کام کے ہیں، یہ پیرزادے کیا کام دیں گے؟ ان میں سے ایک کا نام اللہ بخش خاں تھا، دوسرے کا شمشیر خاں، تیسرے کا شیخ رمضان، چوتھے کا مہربان خاں۔ یہ چاروں آپس میں گہرے دوست تھے۔ اکٹھے مرید ہوئے۔ پھر سید صاحب کا ساتھ نہ چھوڑا۔

سید صاحب کی بیعت

سید صاحب مجاہدین کی پہلی جماعت کو لے کر نکلے تو چاروں ساتھ تھے۔ مہربان خاں سے سید صاحب نے فرمایا تھا کہ آپ سے اللہ تعالیٰ ایک کام لے گا، آپ کے ان بھائیوں سے دوسرا کام لے گا۔ چنانچہ مہربان خاں کو سید صاحب نے اپنی ازواج کے ساتھ پہرے داری کے لئے مقرر کردیا۔ ان کا وقت سندھ میں بسر ہوا۔ وہاں سے ازواج ٹونک آ گئیں تو وہ بھی ساتھ آئے۔ ۱۲۷۴ھ تک جب ''وقائع احمدی'' کی ترتیب جاری تھی، وہ زندہ تھے۔

ساقۃ الجیش کے امیر

سید صاحب نے جب مجاہدین کو مختلف جماعتوں میں تقسیم کیا تو ہر جماعت کے لئے

ایک ایک امیر مقرر فرما دیا۔ سالار الجیش کے امیر اللہ بخش مقرر ہوئے۔ یہ لشکر کے سامان کی گاڑیوں اور چھکڑوں کے ساتھ چلتے تھے۔ ہمیشہ سب سے پہلے روانہ ہوتے اور سب سے آخر میں منزل پر پہنچتے۔ ان کے دوست یعنی شمشیر خاں اور شیخ رمضان بھی انہیں کی جماعت میں شامل تھے۔

پہلے جنگی جیش کے سالارِ اعظم

اکوڑہ میں سکھوں پر شبخون کا فیصلہ ہوا تو اللہ بخش خاں کو غازیوں کے لشکر کا سالار مقرر فرمایا۔ یہ نہایت درجہ قابل رشک شرف تھا جو اس مجاہد کے حصے میں آیا کہ اس سرزمین میں اسلام کی فرمانروائی بحال کرنے کے لئے مجاہدات کا جو سلسلہ شروع ہوا، اس میں پہلے معرکے کی سرعسکری کا تاج اس کے سر پر رکھا گیا۔

سید صاحب نے فیصلہ فرماتے ہی اللہ بخش خاں کو حکم دے دیا کہ آپ دریا کے مغربی کنارے پر چلے جائیں۔ غازی چھوٹے چھوٹے گروہوں میں آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔ عشاء کے وقت تک تمام مجاہدین پہنچ گئے تو اللہ بخش خاں پھر چند رفیقوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر سید صاحب سے رخصتی ملاقات کے لئے گئے۔ آپ نے معمول کے مطابق برہنہ سر ہو کر انتہائی عجز و الحاح سے دعا کی۔

شہادت

شبخون غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔ اللہ بخش خاں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے تاکہ ساتھیوں کو لے کر لشکر گاہ سے نکل جائیں۔ راستے میں شیخ ہدائی اور علی حسن خاں ایک جگہ کھڑے بندوقیں چلا رہے تھے۔ انہوں نے جوشِ تہور میں اللہ بخش خاں کو مخاطب کر کے کہا کہ امیر المومنین نے آپ کو ہمارا سردار بنا کر بھیجا ہے۔ دشمن کے مقابلے میں پیچھے کیوں ہٹتے جا رہے ہیں؟ یہ آوازہ جنگی مصلحتوں کے بھی خلاف تھا اور اسے شبخون کے

مفہوم سے بھی کوئی مناسبت نہ تھی۔ اللہ بخش خاں کو گوارا نہ ہوا کہ جس جیش کا سردار بنا کر انہیں بھیجا گیا تھا، اس کے چھوٹے سے حصے کو بھی پیچھے چھوڑ کر نکل جائیں۔ چنانچہ انہوں نے مراجعت کا خیال چھوڑ کر باقاعدہ جنگ شروع کر دی اور اپنی جماعت سے پچاس ساٹھ گنا لشکر کو مارتے مارتے بہت پیچھے ہٹا دیا۔ اسی حالت میں خود بھی شہید ہو گئے اور ان کے دو جگری دوست شمشیر خاں اور شیخ رمضان بھی خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوئے۔

پیر خاں

اللہ بخش خاں کی شہادت کے بعد ان کے جیش کے سرعسکر پیر خاں بنائے گئے جو اللہ بخش خاں کے بھائی تھے۔ یہ برابر سید صاحب کے ساتھ رہے اور نہایت اہم خدمات انجام دیں۔ اہل سمہ کی سازش کے وقت یہ کھتبل میں مقیم تھے۔ حکم پہنچنے پر کھتبل سے پنجتار روانہ ہوئے۔ تھوڑی ہی دیر میں بیدرد سازشیوں نے ان کا محاصرہ کر لیا اور مسجد کو آگ لگا دینے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ آخر یہ مجاہد باہر نکلے اور ان پر ہر طرف سے تیروں، نیزوں اور تلواروں کی بارش ہونے لگی۔ ان میں سے دو پہلے اس مکان میں چلے گئے تھے، جس میں غلے کا گودام تھا۔ باقی میں سے آٹھ بچے اور سب شہید ہو گئے۔ انہی میں پیر خاں بھی تھے۔ راویوں نے لکھا ہے کہ وہ سپہ گری کے فن میں بڑے ہی چست و چالاک تھے۔

شیخ امیر اللہ

شیخ صاحب تھانہ بھون کے باشندے تھے اور بڑے شجاع و دلیر۔ پہلی جماعت میں شریک ہو کر سرحد پہنچے۔ پڑھے لکھے نہ تھے، لیکن ضرورت کے وقت وعظ بھی کر لیتے تھے۔ جب مولوی محبوب علی صاحب دہلوی کی وجہ سے جماعت میں افتراق کا فتنہ پیدا ہوا اور مولوی صاحب نے مختلف غازیوں سے یہ کہنا شروع کیا کہ گھر واپس چلو، تم پر اقربا کے

بھی حقوق ہیں، یہاں رہ کر ان کے اتلاف کا وبال اپنی گردن پر نہ لو، تو شیخ امیر اللہ تھانوی نے سید صاحب سے درخواست کی کہ میں بھی اس موقع پر ایک تقریر کرنا چاہتا ہوں۔ سید صاحب نے اجازت دیدی۔ انہوں نے منبر پر کھڑے ہوکر فرمایا:

> ”مسلمانو! یہ مقامِ جہاد ہے۔ جو مسلمان اعلاء کلمۃ الحق کی نیت سے اس طرف قدم اٹھائے اس کا ہر قدم جنت کی طرف ہوگا، جو یہاں سے جائے اس کا ہر قدم جہنم کی جانب ہوگا۔ مولوی محبوب علی صاحب اس طرف آئے تو رو بہ جنت تھے، اب سنتا ہوں وہ واپس جا رہے ہیں۔ جو انکے ساتھ جائے گا وہ رو بہ دوزخ ہوگا۔ اس دعوے کی دلیلیں آپ مولوی صاحبان سے سن لیں“۔

بیٹے کو خط

ایک مرتبہ فرمایا کہ میں اپنے بیٹے کو خط لکھنا چاہتا ہوں، لیکن منشی ایسا ہونا چاہیے جو میرا مدعا موزوں الفاظ میں پیش کر سکے اور عبارت آرائی نہ کرے۔ چنانچہ مولوی جعفر علی نقوی نے خط لکھا۔ مضمون یہ تھا کہ فلاں باغ بیچ ڈالو اس کی قیمت میں سے آدھی رقم اپنی والدہ کے حوالے کردو تا کہ اسے کھانے، پینے پہننے کی تکلیف نہ ہو۔ باقی رقم لیکر یہاں آ جاؤ۔ اگر حکم کی تعمیل میں تساہل ہوا تو لشکر اسلام کی آمد کے وقت تم سے سخت مواخذہ ہوگا:

> ”در تخلف ایں امر وقت رسیدن لشکر اسلام بحول اللہ وقوتہ آنچہ سزائے ایں تخلف برائے شما خواہد بود در آں ہرگز ہرگز فروگذاشت و رعایت نہ خواہد شد۔ جزائے اعمال یوم جزا علاوہ است۔“

ترجمہ: اس حکم کی خلاف ورزی ہوئی تو لشکر اسلام کے پہنچنے پر اس کی جو سزا ہوگی، وہ نہ چھوڑی جائے گی، نہ اس میں کمی کی جائے گی، قیامت کے دن جو سزا ملے گی وہ اس کے علاوہ ہے۔

مایار اور بالاکوٹ

تمام جنگوں میں شریک رہے، لیکن اتفاق کی بات ہے کہ کسی بھی معرکے میں انہیں کوئی گزند نہ پہنچا، اس لئے ہمیشہ کہتے رہتے تھے: یہاں آئے تو کیا حاصل، ابھی تک نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔ جنگ مایار میں ان کی ران اور دایاں بازو بہت بری طرح زخمی ہوئے۔ فتح کے بعد تورد پہنچ کر ان کی مرہم پٹی ہونے لگی تو نور بخش جراح نے مزاحاً کہا: شیخ صاحب آپ ہمیشہ کہتے رہتے تھے کہ ابھی تک نکسیر بھی نہیں پھوٹی، بتایئے اب پھوٹی کہ نہیں؟ فرمایا: الحمد للہ! اللہ تعالیٰ قبول کرے۔ شیخ صاحب بالاکوٹ کی جنگ میں شہید ہوئے۔ شہادت کی کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔

کالے خاں شمس آبادی

یہ شمس آباد متو کے باشندے اور نہایت مخلص غازی تھے۔ متعدد لڑائیوں میں شریک رہے۔ چھتر بائی کے محاصرے کے دوران میں ایک مرتبہ غازیوں نے قلعے پر حملہ کیا اور سیڑھیاں لگا کر دیوار پر چڑھنے لگے تو اتفاق سے جس سیڑھی کے قریب کالے خاں تھے، وہ چھوٹی نکلی اور اس پر جو غازی سب سے پہلے چڑھا تھا، اس کا قد بھی چھوٹا تھا، لہٰذا اس کا ہاتھ دیوار کی منڈیر تک نہ پہنچ سکا اور حملہ ناکام رہا۔ کالے خاں لمبے قد کے آدمی تھے۔ انہیں خیال ہوا کہ اگر میں پہلے چڑھتا تو ہاتھ بڑھا کر منڈیر پکڑ لیتا۔ میرے چڑھ جانے کے بعد دوسرے غازیوں کے لئے بھی چڑھنے کی صورت نکل آتی اور یورش ناکام نہ رہتی۔ اس خیال نے ان کے دل پر ایسا قابو پایا کہ واپس وطن جانے کیلئے تیار ہو گئے۔ ساتھیوں نے بہت سمجھایا، سید صاحب نے بھی نصیحت فرمائی، لیکن کالے خاں پر کچھ اثر نہ ہوا۔ لاہور پہنچے تو ان کا ایک دیرینہ دوست مل گیا۔ اس نے حالات سن کر کہا کہ ہم لوگ تو سید صاحب کی خدمت میں پہنچنے کے لئے دعائیں مانگ رہے ہیں، تم بڑے کم نصیب ہو

کہ انہیں چھوڑ کر چلے آئے۔ کالے خاں پر اس کا ایسا اثر ہوا کہ ایک یابو خرید لیا اور وہیں سے لوٹ گئے۔

شہادت

سید صاحب امب سے پنجتار آ گئے تھے کہ کالے خاں دوبارہ پہنچے۔ جاتے ہی عرض کیا یابو میرے کسی بھائی کو دے دیجئے، کیوں کہ میں اس کے لئے گھاس وغیرہ کے انتظام کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا اور سارا وقت آپ ہی کی خدمت میں گزارنا چاہتا ہوں۔ سید صاحب نے فرمایا: مضائقہ نہیں۔ جنگ ہوئی تو آپ کو گھوڑا دوں گا۔

مایار کی جنگ میں سید صاحب نے عبداللہ والیا کا گھوڑا کالے خاں کو دے دیا۔ خان نے رکاب میں پاؤں رکھا تو کہا، ضرورت کے وقت اپنا سر دشمن کی توپ کے منہ میں دے دوں گا۔ جنگ کے دن غازی تورو سے نکل کر چھلپانی کو عبور کر کے مایار کی طرف بڑھے تو کالے خاں گھوڑے پر سوار سب سے آگے تھے۔ درانی توپوں کے گولے پے بہ پے آ رہے تھے۔ علاقہ میدانی تھا۔ چھپنے یا مورچہ بنانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس اثناء میں ایک گولہ آیا اور کالے خاں سے تھوڑے فاصلے پر گرا۔ پھر اچھلا اور بہادر غازی کے پہلو میں لگا۔ ان کے مہلک زخم آیا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ انہیں اٹھا کر مایار گاؤں میں پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ تیماردار انہیں مسجد کے حجرے میں لے گئے۔

گولہ لگنے کے وقت ہی سے ان پر نزع کی کیفیت طاری تھی۔ چپ چاپ لیٹے تھے بولتے تو صرف پوچھتے: بھائیو! لڑائی کا کیا حال ہے؟ درانیوں کے پہلے اور دوسرے حملے کے دوران میں انہیں بتایا گیا کہ جنگ جاری ہے اور فریقین ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہیں۔ وہ سن کر آہستہ آہستہ اللہ اللہ کہتے رہے۔ جب درانی شکست کھا کر میدان چھوڑ گئے تو تیمارداروں نے بتایا، بھائی کالے خاں! اللہ تعالی نے حضرت کو فتحیاب کیا۔ بشارت

سنتے ہی کالے خاں نے کہا: الحمد للہ۔ ساتھ ہی دم نکل گیا۔ کتنی قابل رشک زندگی تھی، جس میں آخری سانس تک زبان پر خدا کا ذکر تھا۔ دل میں اس کے سوا کوئی آرزو نہ تھی کہ راہِ حق کے غازی فتح پائیں۔ کتنی قابل رشک موت تھی کہ دم رضائے خدا میں پورا ہوا۔

سید صاحب کی شانِ تربیت

راویوں نے بیان کیا ہے کہ شروع میں ٹھوڑی منڈاتے تھے۔ سید صاحب نے کبھی نہ ٹوکا اور عادت شریفہ یہی تھی کہ بار بار ٹوکتے نہ تھے۔ جزئیات میں حسنِ تربیت سے لوگوں کو پابند شریعت بناتے تھے۔ ایک روز کالے خاں نے ٹھوڑی منڈائی۔ اتفاق سے سید صاحب آگئے اور ٹھوڑی دست مبارک سے پکڑ کر فرمایا: خان بھائی! آپ کی ٹھوڑی کیا چکنی چکنی ہے۔ کالے خاں چپ رہے۔ معمول کے مطابق آٹھویں دن حجام خط بنانے کیلئے آیا تو اسے لوٹا دیا کہ میری ٹھوڑی کو حضرت کا ہاتھ لگ چکا ہے، اب تیرا ہاتھ نہ لگنا چاہیے۔

چھبیسواں باب:

حسن علی، احمد بیگ، نورداد خاں

شیخ حسن علی کا خاندان

شیخ حسن علی کا وطن کیا تھا، جو جہان آباد (یوپی) سے تین کوس پر ہے۔ یہ پڑھے لکھے نہ تھے، لیکن طبیعت میں دین داری کا خاص جوہر درخشاں تھا۔ نواب وزیر الدولہ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی بے عمل عالم سے نماز پنج گانہ کی کیفیت سنی اور اس کے پابند ہو گئے۔ بعد ازاں اس عالم کو بھی پابندِ نماز بنا دیا۔ شرک و بدعات کے رد میں بہت سرگرم تھے۔ لوگوں نے ان کی سرگرمی کو کیفیتِ جنون پر محمول کیا اور زنجیریں پہنا دیں۔ سید صاحب ایک مرتبہ دورہ کرتے ہوئے ان کے ہاں پہنچے تو ان کی حالت کا شہرہ سن کر دیکھنے کے لئے گئے۔ شیخ حسن علی نے بیعت کی اور ردِ بدعات میں شمشیر برہنہ بن گئے۔

حج اور ہجرت

سید صاحب حج کے سفر پر نکلے تو شیخ حسن ان کے استقبال کے لئے کھنہ پہنچ گئے اور اپنے ساتھ گاؤں لے گئے۔ اس مقام پر سید صاحب تین روز ٹھہرے رہے۔ اس اثناء میں مہمان داری کا پورا انتظام شیخ حسن علی نے کیا۔ پھر اپنے پانچ بھائیوں اور کنبے کی مستورات کو لے کر حج کیلئے ساتھ ہو گئے۔ بھائیوں کے نام یہ ہیں: شیخ عبدالعزیز، شیخ عبدالرحمن، شیخ عبدالباقی، شیخ عبدالصمد اور حاجی پیر محمد۔ ایک بھتیجے کا ذکر آتا ہے، جس کا نام عبدالقادر تھا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس کے فرزند تھے۔ شیخ صاحب کی ایک بیٹی تھی جو

سفر حج میں بہ مقام میرزاپور بہ عارضہ ہیضہ فوت ہوئی۔ حج سے واپسی کے بعد سید صاحب ہی کے ساتھ ہی رہے۔ ساتھ ہی ہجرت کر کے سرحد گئے۔ سید صاحب ان سے عموماً خانگی انتظامات کا کام لیتے تھے۔ دو بھائی حاجی پیر محمد اور شیخ عبدالصمد سید صاحب کے اہل خانہ کے ساتھ سندھ میں رہے اور وہیں فوت ہوئے، باقی سید صاحب کے ساتھ جہاد میں شریک رہے۔ شیخ حسن علی اوتمان زئی پر شبخون میں شریک تھے۔ رات کے وقت راستہ بھول جانے کے باعث مجاہدین کو سخت تکلیفوں سے سابقہ پڑا تھا۔ پانی نہ ملا اور بعض غازی حد درجہ پریشان ہو گئے۔ بڑی مشکل سے پانی پر پہنچے۔ اس سفر میں شیخ حسن علی کا پتہ دیر تک نہ ملا اور سید صاحب نے سوار تلاش کیلئے بھیجے۔ اس طرح یہ ملے اور بخیر وعافیت لشکر میں واپس آئے۔

سازش کی خبریں

جس زمانے میں سلطان محمد خاں درانی بعض دوسرے خوانین کے ساتھ مجاہدین کے قتل کی سازش میں معروف تھا، شیخ حسن علی اور ان کا پورا خاندان سید صاحب کے حکم سے دکھاڑا میں مقیم تھا جو پنجتار کے قریب ایک پہاڑی مقام ہے۔ وہاں سید صاحب کے شہید بھانجے سید احمد علی کے صاحبزادے سید موسیٰ عرف حسن مثنیٰ بیمار تھے اور سید صاحب کی اہلیہ بھی وہیں مقیم تھیں۔ سازش کی ابتدائی خبر شیخ حسن علی کو دکھاڑا کی مسجد کے امام سید اصغر سے معلوم ہوئی تھی اور شیخ نے اپنے بھائی کے ہاتھ یہ پیغام بھیج دیا تھا، لیکن سید صاحب نے فرمایا کہ یہ خبر صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ شیخ حسن علی نے سید اصغر کے اصرار پر دوبارہ پیغام بھیجا، لیکن سید صاحب کو صحت کا یقین نہ آیا۔

سید صاحب راج دواری سے پچوں گئے تو شیخ حسن علی اور ان کے خاندان کو بعض دوسرے اصحاب کے ساتھ بی بی صاحبہ اور دیگر خواتین کی حفاظت کیلئے چھوڑ دیا تھا۔ واقعۂ بالاکوٹ کے بعد شیخ حسن علی نے ہندوستان واپس آنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم

تو اپنے اللہ سے عہد کر چکے ہیں، اپنی عمر جہاد میں صرف کریں گے۔ کابل وقندھار اور سندھ وعرب میں امام کی تلاش کریں گے جب ملے گا تو فرض بجالائیں گے۔

ٹونک میں سکونت

چند سال انہوں نے سرحد میں گزارے، پھر ٹونک آرہے۔ دو بھائی بھی ساتھ تھے۔ نواب وزیر الدولہ نے معقول وظیفہ مقرر کرنا چاہا، یہ راضی نہ ہوئے، اپنی اقل ضروریات کا حساب لگایا اور فرمایا کہ یہ تھوڑی سی رقم مل جائے تو گزارہ ہوتا رہے گا۔ علماء سے پوچھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرے کے مطابق ایک مکان بنوالیا تھا، اسی پر قانع رہے۔ اس میں ایک بانس باہر نکلا ہوا تھا۔ اتفاق سے ایک مرتبہ وہ بانس ان کی آنکھ میں گھس گیا اور ڈھیلے کو گزند پہنچا۔ لوگوں نے علاج کے لئے کہا، بولے جس نے یہ حال کیا ہے وہی اچھا بھی کر دے گا۔ چنانچہ علاج کے بغیر ہی ان کی آنکھ بالکل اچھی ہوگئی۔

اخلاق وعادات

نواب وزیر الدولہ سے ملاقات ہوتی تو ہمیشہ کہتے، وزیر محمد! (بیویوں) میں عدل کیا کرو۔ ایک مرتبہ آپ کے بھائی نے کہا کہ انگریزوں نے ہر اس شخص کی جائداد بحال کرنے کا اعلان کیا ہے، جو ثبوت پیش کر سکے۔ ہمارے پاس ثبوت کے کاغذات ہیں، کیوں نہ انہیں پیش کر کے اپنی زمینیں لے لیں؟ بولے کاغذات میرے پاس لاؤ۔ وہ لائے گئے تو انہیں اٹھا کر چولہے میں ڈال دیا۔ ساتھ ہی کہا کہ جن چیزوں کو خدا کے لئے چھوڑا تھا، انہیں اب کیا لیں۔ سالن یا دال پکواتے تو اس میں پانی بہت ڈلواتے تا کہ بڑھیوں اور ضرورت مندوں کی کچھ خدمت کر سکیں۔ ایک مرتبہ کھانا سامنے آیا تو دیکھا کہ دال ذرا گاڑھی ہے۔ پوچھا: کیا بات ہوئی؟ بیوی نے کہا کہ آپ کیلئے الگ نکال لی ہے۔ بولے یہ تو چار آدمیوں کیلئے کافی ہو سکتی ہے، ساتھ ہی بہت سا پانی اس میں ڈال دیا۔

شانِ ایثار

جہاد کی نیت سے ہمیشہ اونٹ پالتے تھے۔ لوگ اپنے کاموں کیلئے مانگ لے جاتے۔ اگرچہ پڑھے لکھے نہ تھے، لیکن شاہ اسمٰعیل سے قرآن کا درس سن کر بہت کچھ یاد کرلیا تھا اور ٹونک میں خود ترجمہ قرآن کا درس دیتے تھے۔ وہیں وفات پائی۔ تاریخ وفات معلوم نہیں۔ بھائی بھی ٹونک ہی میں جاں بحق ہوئے۔ ہجرت کیلئے نکلتے وقت گھر کا مال ومتاع فروخت کردیا تھا، جو روپیہ ملا وہ سید صاحب کی نذر کردیا۔ بعدازاں بھی جس مجاہد کو ضرورت مند پاتے، اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ نقد دے دیتے۔

میرزا احمد بیگ

وقائع احمدی میں بتایا گیا ہے کہ میرزا احمد بیگ کا اصل وطن بڑھانہ تھا، لیکن لڑکپن ہی میں پنجاب چلے آئے تھے، اس لیے ”پنجابی“ مشہور ہوئے۔

مولوی محبوب علی دہلوی کی مراجعت کے باعث ہندوستان سے قافلوں کی آمد رک گئی تھی تو اخوند عصمت اللہ، اخوند گل، قاضی سید محمد حبان، اکبر خاں وغیرہ کی تجویز یہ تھی کہ سید صاحب تنخواہ دار فوج رکھ لیں۔ منشی خواجہ محمد (حسن پوری) اور سید احمد علی رائے بریلوی نے یہ تجویز سید صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ آپ نے اخوند ظہور اللہ ساکن جہانگیرہ سے فرمایا کہ وطن جائیں اور دو اڑھائی سو آدمی بھرتی کرلیں، چنانچہ انہوں نے جہانگیرہ جا کر بھرتی شروع کردی۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہ فی کس چار روپے تھی اور بعض بیانات میں پانچ روپے بتائی گئی ہے۔ سید صاحب کی خدمت میں اطلاع بھیجی گئی تو آپ نے فرمایا کہ اخوند صاحب تمام آدمیوں کو لے کر کاٹ لنگ پہنچ جائیں، وہاں ان کے واجبات ادا کردیے جائیں گے۔

میاں دین محمد ہندوستان سے واپس آئے تو انہوں نے اس تجویز سے اختلاف کرتے ہوئے عرض کیا کہ ابھی کوئی علاقہ قبضے میں نہیں آیا، ان لوگوں کو تنخواہ کہاں سے دی

جائیگی؟ نیز جتنا روپیہ اب تک انکا واجب الادا ہو چکا ہے، اس میں ہندوستانی مجاہدین سات آٹھ مہینے گزار سکتے تھے۔ چنانچہ غور و مشورہ کے بعد قرار پایا کہ تنخواہ دار فوجیوں کی تنخواہ ادا کر دی جائے اور انہیں جواب دیدیا جائے۔ سید صاحب نے منشی خواجہ محمد اور منشی محمدی کو حکم دیدیا کہ پوری تنخواہ ادا کر کے آدمیوں سے کہو کہ ہماری بات سن کر جائیں۔

دعوت وارشاد

وہ لوگ سید صاحب کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے ان کے روبرو فضائلِ جہاد پر ایک پُرتاثیر تقریر فرمائی۔ ارشاد ہوا کہ جو لوگ نوکر ہو کر جہاد کرتے ہیں اور ان میں سے کوئی مارا جاتا ہے تو وہ بھی شہید ہوتا ہے مگر کم درجے کا۔ خالصاً لوجہ اللہ جہاد کرنے والوں کے درجہ شہادت کو کوئی نہیں پہنچتا۔

ہمارے بھائی گھروں کے کھاتے پیتے اور خوش حال تھے۔ کئی بیش قرار نوکریاں ترک کر کے آئے، کسی نے جاگیر، زراعت یا تجارت چھوڑی۔ اللہ کے واسطے ہمارے ساتھ رہتے اور فقر و فاقہ سہتے ہیں۔ خوش و خرم، راضی بہ رضا اور صابر بہ قضا ہیں۔ اسی طور پر آپ صاحبان بھی رہیں۔ جو کچھ ہمارے لوگ کھائیں پہنیں آپ بھی کھائیں پہنیں۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم کو کچھ اور کسی طور کی فراغت دے گا، ہم آپ لوگوں کو سوا اس کے کچھ اور بھی دیں گے اور وہ آپ کو نوکری سے زیادہ پڑے گا، مگر اس کا اقرار نہیں کرتے کہ کل کو کوئی دعویٰ کرے۔ (۱)

احمد بیگ کی سبقت

یہ سنتے ہی میرزا احمد بیگ بولے میں حاضر ہوں اور آپ کے ساتھ رہوں گا، تیس چالیس لوگ اور بھی تیار ہو گئے، باقی چند روز کے بعد اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اس

---

(۱) وقائع احمدی۔

جماعت کے امیر میرزا احمد بیگ ہی مقرر ہوئے۔

انہی میں سے ایک جماعت نے ہنڈ میں سلطان محمد خاں درانی کا مقابلہ کیا تھا۔ پھر ایک فرنگی نے انہیں بہ عزت باہر نکالنے کے وعدے پر لڑائی ختم کرائی۔ سلطان محمد خاں نے عہد شکنی کی اور انہیں قید کر لیا۔ چارسدہ میں ایک مکان کو نقب لگا کر وہ باہر نکلے اور آزاد ہو کر سید صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے۔

میرزا کی شہادت

میرزا احمد بیگ تمام لڑائیوں میں شریک رہے۔ جنگ بالاکوٹ میں وہ اس مقام پر متعین تھے، جہاں سے بالاکوٹ کا پرانا پہاڑی راستہ نکلتا تھا۔ سوئے اتفاق سے سکھوں نے بھی راستہ اختیار کیا اور سب سے پہلے میرزا احمد بیگ ہی کی فوج سے مڈبھیڑ ہوئی۔ میرزا احمد بڑی مردانگی سے لڑے اور سید صاحب کو خبر بھی بھیج دی لیکن کمک پہنچنے سے پیشتر سکھ فوج کے سیل نے میرزا کی چھوٹی سی جماعت کو پیچھے ہٹاتے ہٹاتے مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچا دیا۔ میرزا کے کچھ ساتھی پہلے نالے پر شہید ہوئے اور غالباً وہیں دفن ہوئے۔ اس مقام کو آج کل شہید گلی کہتے ہیں۔

اس کے بعد میرزا کو بالاکوٹ بلایا گیا۔ وہ خود اور ان کے بقیۃ السیف ساتھیوں میں سے غالباً اکثر بالاکوٹ ہی میں شہید ہوئے۔ میرزا صاحب کی شہادت کی کیفیت یوں بیان کی گئی ہے:

> جب میدانِ جنگ میں یہ افواہ مشہور ہوئی کہ سید صاحب کا کچھ پتہ نہیں چلتا تو میرزا صاحب سر پیٹتے ہوئے دیوانہ وار میدان میں پھرنے لگے، اسی حالت میں خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوئے۔

نور داد خاں

یہ رائے بریلی کا باشندہ تھا اور وہاں کے زمینداروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کی بیعت

کا واقعہ بڑا عجیب ہے۔ سید صاحب راجپوتانہ اور دہلی میں کئی سال گزار کر وطن پہنچے تو جو عزیز اُن کے حصے کی جائداد سے فائدہ اٹھا رہے تھے، انہوں نے بہ طیبِ خاطر اپنے حصے کی زمینیں اور باغات ایک سال کیلئے سید صاحب کے حوالے کر دیے تاکہ ان کا حق ادا ہو جائے۔ سید صاحب نے خربوزے کاشت کرائے۔ اتفاق سے لوہائی پور (رائے بریلی) کے ایک پٹھان پیرداد خاں کی گائے باڑے میں گھس آئی۔ نگہبانوں نے گائے کو باڑے سے ہانک کر باہر نکال دیا اور اتنا بھگایا کہ اس میں چلنے کی سکت نہ رہی۔

پیرداد خاں نے یہ واقعہ سنا تو اس درجہ جوش میں آگیا کہ سید صاحب کے پاس پہنچ کر شکایت کی۔ اس کا لہجہ اتنا درشت تھا کہ نیازمند سخت غصے میں آگئے، تاہم سید صاحب پیکرِ حلم بنے رہے اور فرمایا: نگہبانوں نے بہت برا کیا۔ میں انہیں منع کر دوں گا۔ بھائی صاحب! خفگی چھوڑیے۔ گائے کو کوئی نقصان پہنچا تو اس سے بہتر گائے معاوضے میں دوں گا۔

واقعہ بیعت

پیرداد خاں کا غصہ فرو نہ ہوا۔ سید صاحب کے پاس ایک نورس آم اور ایک خربوزہ آیا ہوا تھا۔ آپ نے تربوزہ پیرداد خاں کو دینا چاہا، اس نے غصے میں انکار کر دیا۔ سید عبدالرحمٰن (خواہر زادہ سید صاحب) کہتے ہیں، میں کوئی چیز لانے کیلئے گھر گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو دیکھا کہ غلام رسول خاں جو سید صاحب کے گھوڑوں کی خبر گیری کرتا تھا، رو رہا ہے۔ میں نے پوچھا کیا ہوا؟ اس نے سارا قصہ سنایا اور بولا کہ مجھ سے پیرداد خاں کی سخت کلامی برداشت نہ ہو سکی اور اسے تنبیہ کرنے کیلئے آگے بڑھا۔ حضرت نے مجھے جھڑک کر پیچھے ہٹا دیا۔

رائے بریلی کے ایک صاحب شیخ امان اللہ بھی سید صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ وہ کبیر السن ہونے کی وجہ سے بہت محترم مانے جاتے تھے۔ انہوں نے بھی نرمی سے پیرداد

خاں کو سمجھایا لیکن اس کی روش نہ بدلی۔ خاندان کے آدمیوں میں سے سید علم الہدیٰ اور سید محی الدین یہ حالات دیکھ کر غصے میں آگئے اور بولے کہ ہم پیرداد خاں سے سمجھیں گے۔ سید صاحب نے فرمایا: چپ رہیے اور کچھ نہ کہیے۔ ایسا نہ ہو کہ پیرداد خاں جمعہ اور جماعت چھوڑ دے۔ سید عبدالرحمٰن آئے تو پیرداد خاں جا چکا تھا۔ وہ جوش میں بولے کہ پیرداد خاں بے ادبی کر کے سلامت چلا گیا، میں ہوتا تو دیکھتا۔ سید صاحب نے فرمایا: تو بچہ ہے، تجھے کیا معلوم؟ ایسا نہ ہو کہ تیری کسی حرکت کے باعث پیرداد خاں کا جمعہ اور جماعت فوت ہو جائے۔

سید صاحب تکیہ شریف سے روزانہ اپنی ہمشیر کی ملاقات کیلئے شہر جایا کرتے تھے۔ دوسرے دن گئے تو ہمشیر سے ملنے کے بعد پیرداد خاں کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔ وہ سید صاحب کو دیکھتے ہی زنانے میں چلا گیا۔ آپ گھوڑے سے اتر کر دروازے پر بیٹھ گئے اور فرمایا: خاں صاحب! آج تو خطا معاف کرائے بغیر واپس نہ جاؤں گا۔ اس اثناء میں چند آدمی جمع ہو گئے۔ وہ پیرداد خاں کو ملامت کرتے ہوئے سید صاحب کے پاس لائے۔ آپ نے معانقہ کیا اور کہا: خاں صاحب! خطا معاف کر دیجئے آپ کی گائے مر جاتی تو اس سے بہتر گائے خدمت میں پیش کر دیتا۔

شہادت

پیرداد خاں کا معاملہ ختم ہو گیا۔ اس کے بھائی نورداد خاں نے سید صاحب کا حلم و انکسار اور پیرداد خاں کا کبر دیکھا تو اسی وقت یہ کہتے ہوئے بھائی سے علیحدگی اختیار کر لی: ایسے فرشتہ سیرت بزرگ سے تکبر غضبِ الٰہی کا موجب ہے۔ اسی وقت سید صاحب سے بیعت کر لی۔ جہاد میں برابر ساتھ رہا۔ بالاکوٹ کے معرکے میں دادِ شجاعت دے کر مرتبۂ شہادت پر فائز ہوا۔

ستائیسواں باب:

فیض علی، امجد علی، مصطفیٰ، شاہ سید

میر فیض علی

میر صاحب گورکھپور کے رئیس اعظم ذوالفقار علی خاں کے فرزند ارجمند تھے۔ سید صاحب سے بیعت کے بعد اپنی زندگی خدمت دین کیلئے وقف کر دی۔ آپ کے ساتھ ہجرت کی۔ چونکہ عالم تھے، اس لئے منشی خانے سے وابستہ ہوئے۔ دورانِ جہاد میں اتنی مشقتیں اٹھائیں کہ وضع وہیئت بدل گئی۔ چنانچہ سید جعفر علی نقوی جہاد کیلئے سرحد پہنچے اور امب میں میر فیض علی سے ملاقات ہوئی تو سابقہ معرفت کے باوجود انہیں پہچان نہ سکے۔ ان کی جفاکشی کا یہ حال تھا کہ امب میں فصل کاٹنے کے بعد مجاہدین غلہ ڈھونے لگے تو میر فیض علی نے زیادہ بوجھ اٹھالیا اور انہیں بڑی تکلیف ہوئی۔ سید صاحب نے حکم دے دیا کہ جو لوگ منشی خانے سے وابستہ ہیں وہ غلہ نہ ڈھوئیں۔ میر فیض علی اس کے بعد بھی اپنے کام میں لگے رہے۔ ان سے کہا گیا کہ معافی کے بعد آپکو مشقت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ فرمایا: فرضیت تو ساقط ہو گئی، مگر میں بہ نظر استحباب یہ کام انجام دے رہا ہوں۔

پھولڑہ پر یورش

شوال ۱۲۴۵ھ کے اواخر یا ذی قعدہ کے اوائل میں پھولڑہ پر یورش کا فیصلہ ہوا تو سید احمد علی رائے بریلوی لشکر کے امیر مقرر ہوئے۔ انہوں نے چاہا کہ سید جعفر علی نقوی کو بطور منشی اپنے ساتھ لے جائیں جو نئے نئے سرحد پہنچے تھے۔ میر فیض علی کو اس لئے ساتھ

نہ لے جانا چاہتے تھے کہ پرانے منشی ہیں اور خط وکتابت کے طور طریقوں سے واقف ہونے کی بنا پر مرکز میں ان کی زیادہ ضرورت ہے۔ یہ معاملہ سید صاحب کے پاس پہنچا تو انہوں نے سید جعفر علی نقوی اور میر فیض علی دونوں کو بلا کر پوچھا کہ کون لشکر کے ساتھ جانا پسند کرتا ہے؟ دونوں نے عرض کیا: جیسے حکم ہو۔ سید صاحب نے میر فیض علی سے فرمایا کہ آپ کا یہ بھائی لمبی مسافت طے کر کے یہاں پہنچا ہے، تکان ابھی دور نہیں ہوئی۔ بہتر یہ ہے کہ آپ چلے جائیں۔ انہوں نے عرض کیا: بہ سر و چشم۔

اس طرح میر فیض علی سید احمد علی کے ساتھ پھولڑہ گئے اور امیر لشکر سے پیشتر پہنچ کر دامنِ کوہ سے فاصلے پر میدان میں ڈیرے ڈال دیے۔ سید احمد علی نے پھولڑہ پہنچ کر فرمایا کہ میدان سے اٹھ کر دامنِ کوہ میں ٹھہرنا چاہیے۔ میر فیض علی نے جواب دیا کہ ہم جہاں ٹھہرے ہیں، وہاں مورچے بنا لئے ہیں۔ اب اس جگہ کو چھوڑنا مناسب نہ ہوگا۔

شہادت

لڑائی کی مفصل کیفیت ”سید احمد شہید“ میں بیان ہو چکی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سکھوں نے اچانک صبح کی نماز کے وقت حملہ کیا۔ وہ سب سوار تھے۔ میدان میں اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ مجاہدین نے مختلف ٹولیوں میں بٹ کر ان کا پیچھا کیا۔ وہ ایک دم اکٹھے ہو گئے اور مجاہدین متحدہ حیثیت میں ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ جا بجا شہید ہو گئے۔ ان میں امیر لشکر اور بہت سے دوسرے اکابر بھی تھے۔ میر فیض علی نے بھی اسی جنگ میں شہادت پائی اور پھولڑہ ہی کی خاک میں محوِ آرام ہیں۔ وہ بہت بڑے رئیس کے فرزند تھے اور کوئی دنیوی غرض انہیں سرحد نہ لے گئی تھی۔ صرف ایک آرزو تھی کہ کلمۂ حق بلند ہو اور دین کی خدمت انجام پائے۔

امجد علی

یہ غازی پور کے رئیس شیخ فرزند علی کے بیٹے تھے۔ شیخ صاحب سفر حج سے پیشتر بیعت کر چکے تھے۔ سفر حج میں ان کے مختار میرزا محی الدین بیگ نے غازی پور میں سید صاحب کے قافلے کے لئے قیام و طعام کا انتظام کیا۔ آگے بڑھے تو شیخ موصوف کے فرزند محمد امیر نے مہمان داری کا فرض انجام دیا، جو باڑا نام مقام میں مقیم تھا۔

سید صاحب ہجرت کیلئے تیار ہوئے تو شیخ فرزند علی نقد کے علاوہ وردی کے بہت سے کپڑے، دو خوب صورت گھوڑے اور چالیس خوب صورت قلمی قرآن لے کر آئے، وہ ساتھ جانا چاہتے تھے، سید صاحب نے روک دیا اور فرمایا کہ اپنے فرزند امجد علی کو چاہیں تو بھیج دیں۔ شیخ نے جگر بند کا ہاتھ پکڑ کر سید صاحب کے حوالے کرتے ہوئے عرض کیا، خادم حاضر ہے۔

مجروحیت

جنگ اکوڑہ سے مجاہدین کے جہاد کا آغاز ہوا۔ شیخ امجد علی ان خوش نصیبوں میں سے تھے، جنہیں اس جنگ کے لئے چنا گیا۔ وہ اس میں زخمی ہوئے اور جنگ شیدو تک بسلسلۂ علاج نوشہرہ میں رہے۔ جنگ شیدو میں اس لئے شریک نہ ہو سکے کہ یہ تندرست نہ تھے۔ پھر دوسرے زخمیوں کے ساتھ نوشہرہ سے چنگلئی (خدو خیل) پہنچ گئے۔ سید صاحب کے دورۂ سوات میں بھی ساتھ نہ تھے۔

زندہ شہید

جب پشاور کے فیصلے کے لئے سید صاحب نے خمر کو مرکز بنایا تو شیخ امجد علی بھی ساتھ تھے۔ جنگ اتمان زئی میں شریک ہوئے۔ عالم خاں رئیس اتمان زئی خود سید صاحب کو

ساتھ لے گیا تھا۔ فتح قریب تھی تو عالم خاں کی نیت میں فتور پیدا ہو گیا۔ سید صاحب کو وہاں سے واپس ہونا پڑا، تمام مورچوں میں پیغام بھیج دیا گیا کہ مجاہدین آہستہ آہستہ ہٹ کر درختوں کے اس جھنڈ میں پہنچ جائیں، جو اتمان زئی سے نصف میل کے فاصلے پر تھا۔ سب واپس چلے گئے، صرف چند مجاہد مورچوں میں رہ گئے، جن میں سے شیخ امجد علی، حافظ رحیم بخش الہ آبادی اور ایک ہندو رفیق راجا رام (ساکن بیسواڑہ) بہ طور خاص قابل ذکر ہیں۔ انہیں خبر نہ مل سکی۔ صبح کے وقت یہ بستی میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مجاہدوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں، چنانچہ یہ لوگ بعد میں سید صاحب کے پاس پہنچے۔ آپ نے شیخ امجد علی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے فرمایا: شیخ بھائی ہمارے ''زندہ شہید'' ہیں۔ جس نے شہید نہ دیکھا ہو انہیں دیکھ لے۔ چنانچہ اسی وقت سے شیخ امجد علی کو تمام مجاہدین ''زندہ شہید'' کہنے لگے۔

شہادت

بعد کے مجاہدات میں شریک رہے، اگرچہ ان کی تفصیل معلوم نہیں۔ بالاکوٹ میں سید صاحب کے ساتھ شہادت پائی۔

حافظ مصطفیٰ

یہ مولوی الٰہی بخش کاندھلوی کے پوتے اور شیخ محمد احسن کے صاحبزادے تھے۔ مولوی الٰہی بخش صاحب نے شاہ عبدالعزیز سے تعلیم پائی تھی۔ آخری عمر میں سید صاحب سے بیعت کی، اس بیعت کے اثرات بیان کرتے ہوئے فرمایا: پہلے ہم جو کچھ کرتے رہے تھے وہ دلیا تھا، اسے آٹا سید صاحب ہی نے بنایا۔ مولانا روم کی مثنوی کے تکملے کے لئے جسے عام طور پر ساتواں دفتر کہا جاتا ہے، مولوی صاحب موصوف بہت مشہور ہیں۔

شانِ استقامت

حافظ مصطفیٰ مولوی احمد اللہ ناگپوری کی جماعت میں شریک تھے۔ جب سید صاحب نے امب سے شاہ اسمٰعیل کو اور چھتر بائی سے مولوی خیر الدین شیر کوٹی کو اپنے پاس بلا لیا تو شاہ صاحب امب کا انتظام شیخ بلند بخت دیو بندی کے حوالے کر آئے تھے۔ مولوی خیر الدین نے اپنی جگہ حافظ مصطفیٰ کو قلعہ دار بنا دیا تھا۔ پائندہ خاں تنولی نے گڑھی کا محاصرہ کر لیا جو چالیس روز جاری رہا، لیکن وہ گڑھی نہ لے سکا۔ اس دوران میں حافظ صاحب کو نوکری کا لالچ بھی دیا۔ انہوں نے جواب میں کہلا بھیجا:

> ”فرماں بردار حضرت امیر المومنین ہستم بدوں حکم آں جناب گڑھی را خالی نہ خواہم کرد۔ ما برائے جہاد فی سبیل اللہ آمدہ ایم نہ برائے نوکری۔ کسے طالب مال و دولت باشد البتہ نوکری بکند، ما طالب راہ خدا ایم“(۱)

ترجمہ: میں حضرت امیر المومنین کا فرماں بردار ہوں۔ ان کے حکم کے بغیر گڑھی خالی نہ کروں گا ہم خدا کی راہ میں جہاد کیلئے آئے ہیں، نہ کہ نوکری کے لئے۔ جو شخص مال و دولت کا طلب گار ہو وہ بے شک نوکری کرے گا۔ ہم خدا کی راہ کے طلب گار ہیں۔

دانش و تدبر

پائندہ خاں نے ایک تنولی عورت کو رشوت دے کر ساتھ ملا یا۔ اس کا شوہر حافظ مصطفیٰ کے ماتحت جمعدار تھا۔ اس طرح لشکر اسلام میں خلل پیدا کرنا چاہا، لیکن یہ تدبیر کارگر نہ ہو سکی۔ عبد الکریم نام ایک مخلص کو پوری کیفیت معلوم ہو گئی۔ اس نے قبل از وقت حافظ صاحب کو آگاہ کر دیا۔ انہوں نے حسنِ تدبیر سے کام لیتے ہوئے اس جمعدار کی جگہ

---

(۱) منظورہ۔

بدل دی، جس کے ذریعے سے سازش کو کامیاب بنانا منظور تھا۔

شہادت

جب سید صاحب نے ہجرت ثانیہ کی تیاری کی تو سید اکبر شاہ ستھانوی کو حکم بھیج دیا کہ خود جا کر امب اور چھتر بائی کے مجاہدین کو نکال لائیں اور ہمارے پاس بھیج دیں۔ چنانچہ حافظ مصطفیٰ اور شیخ بلند بخت برڈھیری میں سید صاحب کے پاس پہنچے۔ حافظ صاحب نے بالاکوٹ میں سید صاحب کے ساتھ شہادت پائی۔

ملا شاہ سید

یہ چیڑ منگ (درہ نندھیاڑ) کے علاقے سے تھے۔ معلوم نہیں کب سید صاحب کے پاس آئے۔ ان کا ذکر پہلے پہل شاہ اسمٰعیل کے ان مراسلوں میں آیا ہے جو ضلع ہزارہ میں مجاہدین کی ابتدائی پیش قدمی کے وقت لکھے گئے۔ ان مراسلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا شاہ سید اور سید محمد مقیم رام پوری اس اقدام کے سلسلے میں شاہ اسمٰعیل کے شریک کار تھے، اس لئے کہ مختلف مراسلے تینوں کی طرف سے لکھے گئے۔ ایک مراسلے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ اسمٰعیل سید محمد مقیم کو لشکر گاہ میں چھوڑ کر ملا اسمٰعیل اخوند زادہ اور ملا شاہ سید کے ساتھ عبدالغفور خاں والیٔ اگرور کے پاس گئے۔ اسی میں مذکور ہے:

> ''سید شاہ را برائے دعوت مسلمین آں قرب و جوار کہ برادری عبدالغفور اند، لاکن تابع نیستند، فرستادہ خود بہ معسکر مراجعت نمودم۔ از یں روز تا ایں روز کہ روز چہارم است کسے از وشاں نہ رسیدہ''(۱)

ترجمہ: سید شاہ (ملا شاہ سید) کو قرب وجوار کے مسلمانوں میں تبلیغ کے لئے بھیج دیا۔ یہ لوگ عبدالغفور خاں کی برادری کے ہیں، لیکن اس کے تابع

---

(۱) مکاتیب شاہ اسمٰعیل ص: ۲۱۵۔

نہیں۔ خود میں (شاہ اسمٰعیل) لشکر گاہ میں واپس آگیا۔ آج تک چوتھا دن ہے۔ ان کی طرف سے کوئی آدمی نہیں آیا۔

شہادت

ملا شاہ سید یورش ہنڈ میں شاہ اسمٰعیل کے ساتھ تھے۔ ہنڈ فتح ہو گیا اور خادے خاں رئیس ہنڈ کے اقربا اس کے قتل کی بنا پر لوگوں کو برانگیختہ کرنے لگے۔ یہ حالت دیکھ کر شاہ صاحب نے ملا شاہ سید کو خط دے کر پنجتار بھیج دیا تاکہ سید صاحب حقیقی حالات سے آگاہ ہو جائیں۔ ساتھ ہی پنجتار سے شالیں طلب کر لیں۔ پنجتار سے دو شالیں ۱۲ رصفر ۱۲۴۵ھ (۱۳ راگست ۱۸۲۹ء) کو خچروں پر لاد کر بھیج دی گئیں۔ دس بارہ مجاہدین بھی ساتھ تھے، جن میں سے ایک کالے خاں شاہین چی تھا اور دوسرے ملا شاہ سید۔ انہوں نے رات شاہ منصور میں گزاری، جو ہنڈ سے چار کوس ہے۔ خادے خاں مقتول کے اقربا کو خبر مل گئی۔ وہ پچیس تیس سوار لے کر ہنڈ سے آدھ کوس پر گھات میں بیٹھ گئے اور اچانک مجاہدین کی چھوٹی سی جماعت پر حملہ بول دیا۔ بارہ برس کے ایک لڑکے نے دوڑ کر ہنڈ خبر پہنچائی وہاں سے مجاہدین موقع پر پہنچے۔ اس سے پیشتر زیادہ تر مجاہدین شہید ہو چکے تھے۔ کالے خاں سسک رہا تھا اس نے بتایا کہ شالوں کو بچانے کی کوئی صورت نہ رہی تو میں نے انہیں پاس کے کنوئیں میں ڈال دیا۔ پہلے بندوقیں چلتی رہیں، پھر تلواروں کی نوبت آئی۔ ملا شاہ سید نے کئی آدمیوں کو مارا اور زخمی کر دیا۔ ان پر ہجوم ہوا تو وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے کنوئیں میں جا گرے۔ دشمنوں نے اوپر سے دو تین پتھر ڈال دیے۔ یوں اس نیک دل مجاہد نے شہادت پائی۔ شاہ صاحب نے ان کی میت کنوئیں سے نکلوائی، باقی شہداء کی میتوں کے ساتھ چارپائیوں پر ڈال کر ہنڈ لائے اور وہیں انہیں سپرد خاک کر دیا۔

اٹھائیسواں باب:

امام الدین، اولاد حسن، غلام علی

مولوی امام الدین بنگالی

آپ موضع حاجی پور ضلع سدارم (بنگال) کے باشندہ تھے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے کسب علوم کیا۔ سید صاحب راجپوتانہ سے دہلی پہنچے تو بہت سے لوگ بیعت ہونے لگے۔ مولوی امام الدین بھی آپ کی مجلس میں بیٹھتے اور باتیں کرتے، لیکن بیعت کی طرف رغبت نہ ہوئی۔ کچھ مدت بعد سید صاحب ایک مرتبہ رائے بریلی سے لکھنؤ گئے اور وہاں چند ماہ قیام کیا۔ اتفاق سے مولوی امام الدین بھی پہنچ گئے۔ سید صاحب بیعت لینے میں مصروف تھے۔ خدا جانے کیا بات ہوئی کہ مولوی امام اندین یہ کیفیت دیکھتے ہی بیعت کیلئے تیار ہو گئے اور کم وبیش تین روز آپ پر استغراق کی حالت طاری رہی۔ صرف نماز کے اوقات میں افاقہ ہوتا، اس وقت سید صاحب کا دامن تھام لیا۔ پھر ان کی شہادت تک ساتھ نہ چھوڑا۔ ان کا ذکر عموماً توجہ دینے کے سلسلے میں آتا ہے۔ یعنی سید صاحب سے جو بیعت توبہ کرتا تھا، اسے توجہ دینے کا حکم مولوی امام الدین صاحب کو ملتا تھا۔ مثلاً چارسدہ میں سید میر خاں درانی کو۔

نواب وزیر الدولہ نے ''وصایا'' میں لکھا ہے کہ مولوی صاحب نے ''صراطِ مستقیم'' کئی مرتبہ خود سید صاحب سے پڑھی۔ آپ عجیب وغریب حقائق بیان فرماتے۔ مولوی امام الدین نے تمام حقائق محفوظ کر رکھے تھے اور اس کتاب کی شرح میں موصوف کو خاص دستگاہ حاصل تھی۔

سفر حج میں رائے بریلی سے سید صاحب کے ساتھ نکلے تھے۔ کلکتہ پہنچے تو اجازت لے کر والدہ سے ملنے کے لئے وطن گئے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ انہیں بھی حج کے لئے ساتھ لے آنا۔ وہ تو نہ آئیں، لیکن ان کے ساتھ تیس چالیس آدمی زیارت اور بیعت کی غرض سے آ گئے۔ مخا میں یہ تہبند باندھ کر حوض میں نہانے لگے تو لوگ انہیں پکڑ کر قاضی کے پاس لے گئے، اس لئے کہ ان لوگوں میں کپڑا باندھ کر نہانے کا دستور نہ تھا۔ آخر قاضی کو حکم دینا پڑا کہ جب تک ہندوستانی حاجی مخا میں موجود ہوں کوئی عرب کپڑا باندھے بغیر حوض میں نہ نہائے۔

مراجعت

بالاکوٹ کے بعد مولوی صاحب وطن چلے آئے۔ پھر ٹونک میں سکونت اختیار کر لی۔ نواب وزیر الدولہ نے ”صراطِ مستقیم“ ان سے پڑھی۔ جس زمانے میں نواب موصوف اپنی اہم کتاب ”وصایا“ مرتب کر رہے تھے، مولوی صاحب زندہ تھے۔ نواب صاحب لکھتے ہیں کہ وہ مسندِ ارشاد پر فائز ہیں اور بے شمار خلقت ان کے خوانِ ہدایت سے مستفید ہو رہی ہے۔ بارہا دیکھا کہ ذکر جہر کی تعلیم کے وقت جونہی اللہ کا نام پاک ان کی زبان پر آتا، ظاہری ہوش و حواس کی قید سے نکل کر باطنی انوار میں ڈوب جاتے۔

آپ کے بھائی علیم الدین بھی جہاد میں شریک تھے اور بالاکوٹ کی جنگ میں شہید ہوئے۔

سید اولاد حسن قنوجی

آپ کا سلسلہ نسب امام علی نقی سے ملتا ہے۔ اوچ کے مشہور شیخ سید جلال الدین گل سرخ بخاری اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت بھی آپ کے اجداد میں سے تھے۔ آپ کے والد سید اولاد علی خاں حیدر آباد میں امیر کبیر نواب شمس الامراء کی سرکار سے وابستہ

ہو گئے تھے اور ان سے دور کی عزیز داری بھی تھی۔ انہیں کی سفارش سے نظام علی خاں والیٔ دولت آصفیہ نے انور جنگ بہادر کا خطاب عطا کیا اور گولکنڈہ کا قلعہ دار بنا دیا۔ پانچ لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر ملی۔ ایک ہزار سوار و پیادہ کے وہ سالار تھے۔ انہوں نے پہلا نکاح وطن میں کیا تھا، دوسرا حیدر آباد میں۔ نواب سکندر جاہ آصف ثالث کے عہد میں فوت ہوئے۔ حیدر آبادی بیگم سے کوئی اولاد نہ تھی۔ سید اولاد حسن پہلی بیگم کے بطن سے تھے۔

جہاد اور دعوت وارشاد

۱۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں پائی۔ لکھنؤ میں مولوی محمد نور اور مرزا حسن علی محدث سے بھی اکتساب علم کیا۔ پھر دہلی میں شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر محدث اور شاہ عبدالعزیز محدث سے حدیث، فقہ، تفسیر اور دوسرے اسلامی علوم پڑھے۔ چند پشتوں سے ان کا خاندان شیعیت کا پابند چلا آتا تھا۔ خود انہوں نے طریق اہل سنت اختیار کیا۔ سید صاحب سے بیعت کی اور جماعت مجاہدین میں شامل ہو گئے۔ ان سابقین اولین میں شریک تھے جو سید صاحب کے ساتھ جہاد کیلئے گئے۔ کچھ مدت بعد سید صاحب نے انہیں دعوت وتبلیغ کی غرض سے واپس بھیج دیا۔ ان کی عمر عزیز کے باقی اوقات اسی پاک مشغلے میں صرف ہوئے۔ خود سید صاحب ایک مکتوب میں انہیں لکھتے ہیں:

> "آنچہ از مصروفیت خود در تبلیغ احکام رب العٰلمین ترقیم قلم اخلاص رقم نمودہ بودند۔ ازیں جہت فرحت بسیار گردید۔ جزاکم اللہ خیرالجزاء ہر یکے از مومنین مخلصین خصوصاً علمائے اعلام ومشائخ ذوی الاحترام را لازم است کہ احکام حضرت جوادرا بر بندگانِ وے شائع وذائع گردانند۔ (۱)

ترجمہ: آپ نے خدا کے حکموں کی تبلیغ کے سلسلے میں اپنی مصروفیت کے متعلق جو کچھ لکھا، اس سے بہت خوشی حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ

---

(۱) سیرت والا جاہی حصہ اول۔

نیک جزا دے۔ تمام مخلصین مسلمانوں خصوصاً بڑے بڑے عالموں اور محترم پیروں کے لئے لازم ہے کہ خدا کے احکام اس کے بندوں میں پھیلائیں۔

وفات

سید صاحب کی شہادت سے سات سال بعد ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۸ء) میں وفات پائی اور قنوج میں دفن ہوئے۔ متعدد کتابیں لکھیں۔ ان کے دو فرزند تھے: ایک سید احمد حسن عرشی جو عربی، فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ انہیں میرزا غالب سے تلمذ حاصل تھا۔ تیس برس کی عمر میں حج کے لئے روانہ ہوئے۔ بڑودہ پہنچ کر سخت بیمار ہو گئے اور وہیں ۲۵ر نومبر ۱۸۶۰ء کو وفات پائی۔

دوسرے فرزند سید صدیق حسن تھے، جنہوں نے بھوپال پہنچ کر بڑا عروج پایا۔ نواب شاہجہاں بیگم والیہ بھوپال سے ان کا عقد ہوا۔ نواب امیر الملک والا جاہ کا خطاب ملا۔ عربی، فارسی اور اردو میں اپنی دینی، علمی اور ادبی تصانیف کے باعث مشہور خواص و عوام ہیں۔

والد کے ترکے کا معاملہ

سید اولاد حسن بڑے ہی نیک طبع اور خوش سیرت بزرگ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ والد کی وفات کے بعد انہیں حیدر آباد بلالیا گیا تھا، لیکن وہ نہ گئے اور والد کا ترکہ چھوڑ دیا۔ میرے نزدیک واقعے کی صورت یہ ہے کہ حیدر آباد کے نظامِ جاگیرداری میں بھی اسی طریقے پر عمل ہوتا تھا، جو مغلوں کے زمانے میں رائج تھا۔ یعنی امراء کی وفات پر ان کا پورا مال و اسباب سرکاری خزانے میں داخل ہو جاتا تھا۔ البتہ اولاد کیلئے حسبِ استعداد ملازمت کا انتظام کر دیا جاتا تھا۔ انور جنگ کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی۔ سید اولاد حسن ملازمت کیلئے تیار نہ ہوئے، لہٰذا انھیں حیدر آباد سے کچھ ملنے کی امید نہ ہو سکتی تھی۔

ایک غلط روایت

سیرت والا جاہی میں مرقوم ہے کہ سید صاحب نے ایک موقع پر پدری میراث کے ترک کا سبب پوچھا اور کہا کہ آج وہ روپیہ موجود ہوتا تو مسلمانوں کے کام آتا۔ سید اولاد حسن نے جواب دیا کہ میرے والد شیعہ تھے۔ معلوم نہیں ان کا مال میرے لئے حلال ہے یا حرام۔ اگر حرام ہے تو اس لائق نہیں کہ اسے حاصل کروں۔ اگر حلال ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے عوض مجھے علم کی دولت عطا کر دی۔ (۱)

ممکن ہے سید صاحب نے مزاحاً کبھی ایسی بات کہی ہو، ویسے مشتبہ اموال کے متعلق ان کا طریق عمل روز روشن کی طرح آشکارا ہے۔ انہوں نے اکسٹس بروک کی بیوی حیات النساء بیگم اور ایسے ہی کانپور کی ایک خاتون کے اموال بے تکلف ٹھکرا دیے تھے۔ پھر وہ سید اولاد حسن کے پدری ترکے کی نسبت ایسی کوئی بات کیوں کر فرما سکتے تھے؟ اس قسم کے بعض واقعات لوگوں نے ارادت مندوں کی حیثیت بلند کرنے کی غرض سے لکھ دیے اور یہ نہ سوچا کہ خود پیر و مرشد کی حیثیت پر ان سے کیسی زد پڑتی ہے۔

شیخ غلام علی الہ آبادی

ان کا اصل وطن مہر وندہ (ضلع الہ آباد) تھا، بہت بڑے امیر تھے۔ وطن میں جو مکان بنوایا تھا وہ قلعے کی طرح مضبوط تھا اور اسے کوٹ گڑھی کہتے تھے۔ اب وہ بالکل مسمار ہو چکا ہے۔

شیخ صاحب بالکل ابتدائی دور میں سید صاحب سے وابستہ ہو گئے تھے، اسی وقت سے پوری زندگی اسلامی سانچے میں ڈھل گئی۔ ان کے پاس بیسیوں سنہری اور روپہلی حقے تھے، سب تڑوا کر دریا میں بہا دیے۔ ایک راوی کا بیان ہے کہ ایسا مخلص بے ریا اور محب باصفا آج تک نہیں دیکھا۔

---

(۱) سیرت والا جاہی حصہ اول ص: ۵۰۔

سید صاحب سے عقیدت

شیخ صاحب مہاراجہ بنارس کی طرف سے عملدار تھے۔ سید صاحب حج کے لئے نکلے تو الہ آباد میں قیام وطعام کا پورا بندوبست شیخ صاحب ہی نے کیا۔ سید صاحب کو ایک کوٹھری میں ٹھہرا دیا۔ قافلے کے لئے مہاراج کی بارہ دری خالی کرالی۔ ایک ایک وقت میں متعدد کھانے لاتے جن پر روزانہ کم از کم ایک ہزار روپیہ خرچ ہوتا۔ یہ اس زمانے کا خرچ ہے، جب جنسیں ارزاں تھیں۔ دو مرتبہ سید صاحب سے ملنے کیلئے آتے اور اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ نذر ضرور لاتے۔ دورانِ قیام میں کم از کم بیس ہزار روپے کی چیزیں اس طرح سید صاحب کی خدمت میں پہنچائیں۔ رخصت کے وقت ایک بڑا خیمہ اور بارہ چھوٹے خیمے پیش کیے۔ سید صاحب کے تمام رفیقوں کو ایک ایک جوڑا جوتا، مردوں کو دو دو پاجامے، دو دو انگرکھے، دو دو ٹوپیاں اور ایک ایک چادر۔ عورتوں کو دو دو پاجامے، دو دو کرتے اور دو دو دوپٹے دیے۔ سب کو فی کس ایک روپیہ، سید صاحب کے اقربا کو دس دس روپے دیے اور علماء کی خدمت میں بھی ان کی حیثیت کے مطابق نذریں پیش کرتے۔

ایک روز سید صاحب کی بیویوں کو اسّی اسّی روپے دے گئے۔ ہر کھانے کے ساتھ ایک سو چالیس روپے نقد پیش کرتے۔ تمام اہل قافلہ کو احرام کی چادریں دیں، سید صاحب کی خدمت میں مشروع، کمخواب، پشمینے، خیتو، ڈھاکہ کی ململ، محمودی، بناری اطلس وغیرہ کے تھان پیش کیے۔ ان کے علاوہ ساڑھے چار ہزار روپے نقد اور کشمیری شال دی۔ دو نہایت عمدہ مطلّا قرآن مجید پیش کیے۔ حج سے واپسی پر بھی اسی فداکاری سے حق خدمت ادا کیا۔

خدمت

سید صاحب جہاد کیلئے نکلے تو شیخ صاحب قسم قسم کے اسلحہ، خیمے، کپڑوں کے تھان،

کتابیں، برتن، سید صاحب کے لئے پوشاکیں اور نقد روپیہ لائے۔ ایک خیمہ مسجد کی شکل کا خاص سید صاحب کیلئے تیار کرایا اور مع فرش نذر کیا۔ جب سنا کہ سید صاحب راجپوتانہ کے راستے جائیں گے تو بیسیوں چھوٹے ڈولچے بنوائے اور ان کے لئے لمبی لمبی رسیوں کا انتظام کیا۔ یہ سب چیزیں جماعت مجاہدین میں تقسیم کردیں۔ سید صاحب فتح پور پہنچے تو شیخ صاحب دوبارہ زیارت کے لئے آگئے اور پورے قافلے کی مہمان داری اپنے ذمے لے لی۔ ہر سال سید صاحب کے لئے عمدہ سے عمدہ پوشاکیں تیار کرا کے سرحد بھیجتے رہتے تھے اور جو قافلہ سرحد جاتا تھا، اس کیلئے اسلحہ، سواری یا دوسری ضروری چیزوں کا سامان کردیتے تھے۔ چنانچہ سید جعفر علی نقوی ان سے ملتے ہوئے گئے تو شمشیر، کٹار، سپر، جاجم اور دیگچے، طباق، پیالے وغیرہ انہیں دیے۔

شہادت

کچھ مدت کے بعد شیخ صاحب مالی مشکلات کا شکار ہوگئے۔ راجا نے تاوان کی بھاری رقم ان کے ذمے ڈال دی۔ اس سلسلے میں ان کی گڑھی پر ایک لاکھ روپیہ قرض ہوگیا۔ ان کا بڑا لڑکا ان غیر مشروع مشاغل کا عادی ہوگیا تھا، جو اس عہد کے امراء کی اولاد میں عام تھے۔ اس وجہ سے شیخ صاحب بہت دل گرفتہ رہتے تھے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد غالباً راجا کے آدمیوں نے ان پر چڑھائی کردی۔ الٰہ آباد اور بنارس کے درمیان لڑائی ہوئی۔ اسی معرکے میں شیخ صاحب نے شہادت پائی۔ آپ کی میت ہاتھی پر واپس آئی۔ گڑھی کے قریب دفن ہوئے۔ قبر خام ہے، نہ اس پر کوئی عمارت ہے نہ احاطہ۔

آخری دور میں انتہائی سادگی اختیار کرلی تھی۔ موٹے کپڑے کا لباس پہنتے، چھوٹی سی چارپائی پر سوتے، جس پر کوئی بستر نہ ہوتا، تاکہ پاؤں نہ پھیلا سکیں، جلد آنکھ کھل جائے اور رات کا زیادہ حصہ عبادت میں صرف ہو۔

انتیسواں باب:

مختلف اصحاب (۱)

نواب احمد علی خاں

یہ رام پور کے فرمانروا تھے۔ شجرۂ نسب یہ ہے: نواب احمد علی خاں بن نواب محمد علی خاں بن نواب فیض اللہ خاں بن نواب علی محمد خاں بانی ریاست رام پور۔ نواب احمد علی خاں بہت کم سن تھے، جب ان کے والد نواب محمد علی خاں مقتول ہوئے۔ ۲۸ ر نومبر ۱۷۹۴ء سے احمد علی خاں کی فرمانروائی کا آغاز ہوا، کمسنی کے زمانے میں ان کے والد کے چچیرے بھائی نواب محمد نصر اللہ خاں تمام امور کے کفیل رہے۔ ۲۴ ر نومبر ۱۸۱۱ء سے نواب احمد علی کو پورے اختیارات حاصل ہوئے۔ ۲۵ ر جولائی ۱۸۴۰ء کو انہوں نے بہ عارضہ استسقا وفات پائی۔

بیعت جہاد

نواب نے غالباً اسی زمانے میں سید صاحب سے ارادت کا علاقہ پیدا کیا تھا، جب کہ آپ مستقل تحریک شروع کر چکے تھے اور دوآبہ گنگا جمنا کا دورہ ختم کر کے وطن جاتے ہوئے رام پور ٹھہرے تھے۔ آپ سرحد چلے گئے تو نواب موصوف نے ۳ ر ذی الحجہ ۱۲۴۳ھ (۱۶ ر جون ۱۸۲۸ء) کو ایک مکتوب آپ کے نام بھیجا جس میں لکھا کہ میرے دل میں ابتدا ہی سے خاندانِ رسالت کی محبت موجزن ہے اور محبت وعقیدت کا یہ عالم ہے گویا میرے بدن کے ہر بال سے "انا المحب" کا دعویٰ فوارے کی طرح جوشاں ہے۔ ہر وقت یہ مصرعہ زبان پر رہتا ہے:

من دوست دودمانِ آلِ رسولؐ

آپ کے ساتھ محبت کیوں نہ ہو، جو آلِ رسول سے ہونے کے علاوہ:

> ”حامل خلافت وحامی شریعت وماحی مراسم بدعت وآثار ضلالت ہستند چونکہ جہاد فی سبیل اللہ مثل صلوٰۃ وصیام برکافۂ انام ایں ملت از جملہ فرائض موکد اسلام است۔ بناءً علیہ درظہر الغیب مطابق سنت سید المرسلین علیہ وآلہ الف الف صلوٰۃ رب العٰلمین بردست مولوی حیدر علی صاحب کہ خلیفہ آنجناب است بہ آنحضرت بیعت بر جہاد نمودم وخود را بایں وسیلہ جمیلہ درزمرۂ مجاہدین فی سبیل اللہ داخل نمودم کہ در وقت مناسب بہ سرو چشم حاضرم۔
>
> از دوست یک اشارہ وز مابہ سر دویدن و آنحضرت دعا فرمائید کہ مالک حقیقی ایں عزیمت مارا بہ انجام رساند“(۱)

ترجمہ: خلافت کے حامل شریعت کے حامی نیز بدعت کے طور طریقوں اور گمراہی کے نشانوں کو مٹانے والے ہیں۔ چوں کہ خدا کی راہ میں جہاد، نماز اور روزے کی طرح ملت اسلامیہ کے تمام افراد پر پختہ فرض ہے لہٰذا میں نے سید المرسلین (ان پر اور ان کی آل پر رب العٰلمین کی طرف ہزار ہزار درود و سلام ہوں) کی سنت کے مطابق غائبانہ مولوی حیدر علی کے ہاتھ پر بیعت جہاد کرلی ہے جو آپ کے خلیفہ ہیں۔ اس وسیلے سے میں مجاہدین فی سبیل اللہ کے گروہ میں شامل ہوگیا ہوں۔ مناسب وقت پر بہ سر و چشم حاضر ہو جاؤں گا۔ دوست کی طرف سے اشارہ ہوتے ہی ہم سر کے بل دوڑیں گے۔ آپ بھی دعا فرمائیں کہ مالک حقیقی ہمارے اس ارادے کو پورا کرے۔

قاضی احمد اللہ میرٹھی

قاضی احمد اللہ میرٹھی اور ان کے والد قاضی حیات بخش نے اس زمانے میں بیعت

---

(۱) مکاتیب شاہ اسمٰعیل ص: ۲۴۴۔

کی تھی جب سید صاحب نے گنگا و جمنا کے دوآبے کا دورہ کیا تھا۔ دورے کے آغاز کی خبر مل چکی تھی۔ قاضی صاحب روزانہ پچاس آدمیوں کے ساتھ استقبال کی غرض سے کئی میل باہر نکل جاتے اور انتظار کے بعد واپس چلے آتے۔ پانچویں روز سید صاحب تشریف فرما ہوئے۔ سفر حج میں بھی مع والد شریک تھے اور انہیں اس جماعت کا امیر بنایا گیا تھا، جو عطیۃ الرحمٰن نامی جہاز پر سوار تھی اور یہ جماعت سرسٹھ آدمیوں پر مشتمل تھی۔

قاضی صاحب اس زمانے میں ستر مجاہدین کے ساتھ سرحد پہنچے تھے، جب سید صاحب سوات کا دورہ کر رہے تھے۔ راویوں نے لکھا ہے: وہ بڑے عالم، پرہیزگار، حافظ قرآن اور حضرت کے کمال کے معتقد تھے۔ لشکر میں جمعہ اور عیدین کی نمازیں وہی پڑھاتے تھے۔ خطبہ بھی پڑھتے اور کبھی کبھی عام نمازیں بھی پڑھاتے۔ جنگ بالاکوٹ میں سید صاحب کے ساتھ شہید ہوئے۔

سید اسمٰعیل رائے بریلوی

ان کا خاندان معلوم نہ ہو سکا۔ راوی کا بیان ہے کہ سید موصوف:

> "بڑے شجاع، طاقت ور، بہادر، حضرت کے نہایت معتقد صادق، مخلص بے ریا، جاں نثار، محب سلامت کردار، خیر خواہ، فرماں بردار، دین دار، پرہیزگاری میں یگانہ، دانش و ہوشیاری میں یکتائے زمانہ۔ حضرت کے نزدیک بڑے معزز و ممتاز اور ہمدم و ہمراز تھے۔"

سید صاحب کے ساتھ ہجرت کر کے گئے۔ تمام معرکوں میں شریک رہے۔ جماعت خاص میں شامل تھے۔ پنجتار میں سید صاحب کی اقامت کیلئے جو برج مخصوص تھا، اسکے سامنے میدان تھا، جس میں سید اسمٰعیل رائے بریلوی کا ڈیرہ تھا۔ اہل سمہ نے سازش کر کے مجاہدوں پر جا بجا قاتلانہ حملے کیے تھے تو مختلف جماعتوں کو خبر پہنچانے اور پنجتار لانے کا کام سید موصوف ہی کے سپرد ہوا تھا۔ بالاکوٹ میں سید صاحب کے ساتھ شہید ہوئے۔

صوفی نور محمد بنگالی

بڑے مخلص، بے ریا، دیندار اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ جو کچھ ساتھ لائے، پورا کا پورا سید صاحب کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کر دیا۔ آپ نے کچھ خرچ کے لیے دے دیا۔ باقی بیت المال میں داخل کر دیا۔ مزید حالات معلوم نہ ہو سکے۔

شیخ منور علی قدوائی

یہ بڑے مخلص مجاہد تھے۔ گڑھی امب کے جس مکان میں سید صاحب رہتے تھے، اس کے سامنے شیشم کا ایک اونچا درخت تھا۔ پاس کے دالان میں مختلف اصحاب کے بستر تھے۔ ان میں شیخ منور علی بھی تھے۔ کسی کے لئے جگہ مقرر نہ تھی، جو جہاں چار پائی ڈال لیتا، سو رہتا۔ ایک روز شیخ صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے، وہ جس جگہ روزانہ چار پائی بچھاتے تھے، اس جگہ کسی دوسرے بھائی نے بچھالی۔ شیخ صاحب آئے تو فرمایا: یہ میری جگہ ہے۔ جواب ملا کہ جگہ مقرر تو ہے نہیں، میں نے چار پائی بچھالی آپ کسی دوسری جگہ انتظام فرمالیں۔ شیخ صاحب کے دل میں خدا جانے کیا سمائی کہ اپنی چار پائی میں ایک رسا باندھا۔ اس کا ایک سرا پکڑ کر درخت چڑھ گئے اور کھینچ کر چار پائی کو ایک بڑی شاخ پر جمایا اور رسے سے باندھ کر اس پر لیٹ گئے۔ اب تمام بھائی ان کی منت سماجت کرنے لگے۔ وہ غصے میں تھے نہ مانے۔ سید صاحب باہر تشریف لائے تو معاملہ ان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے پوچھا: شیخ بھائی! چار پائی درخت پر کیوں بچھائی؟ انہوں نے عرض کیا۔ حضرت! اب میرے لئے زمین پر جگہ نہیں رہی۔ آج آسمان کی طرف پہلی منزل ہے۔ کل جو کچھ پیش آئے گا دیکھ لوں گا۔

یہ سن کر سب بے اختیار ہنس پڑے۔ سید صاحب نے فرمایا: شیخ بھائی! اتر آیئے۔ آپ کیلئے زمین ہی پر جگہ نکل آئے گی۔ چنانچہ چار پائی ایک اچھی جگہ بچھوا دی۔ مزید

حالات معلوم نہ ہو سکے۔

اخوند فیض محمد

یہ غالباً سرحد ہی کے باشندے تھے، وطن کا صحیح علم نہ ہو سکا۔ جب خواجہ خیل (سوات) میں سلیمان شاہ والیٔ چترال (کاشکار) کے پاس سفیر بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا تو اخوند صاحب ہی اس منصب کیلئے تجویز ہوئے۔

''وقائع'' کا بیان ہے کہ آپ نماز عشاء سے فارغ ہوئے تو خواجہ خیل کے مختلف لوگ آپ کے پاس آ کر والیٔ چترال کی باتیں کرنے لگے اور عرض کیا کہ آپ اس ملک میں تشریف لے جاتے تو بہت اچھا ہوتا۔ آپ نے فرمایا کہ یہاں بھی جہاد موجود ہے۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی ملک میں ہم سے اپنی رضا مندی کا کام لے، البتہ ہم دعوتِ جہاد اور ترغیب غزا کی غرض سے چند لوگ وہاں ضرور بھیجیں گے۔ (۱)

چنانچہ دوسرے دن اپنے خاص آدمیوں سے مشورے کے بعد اخوند فیض محمد کو اس کام کے لئے تجویز کیا۔ سلیمان شاہ کے لئے ایک قلمی قرآن مجید، ایک جوڑی پستول اور ایک پیش قبض بہ طور تحفہ بھیجی۔

اخوند صاحب چند آدمیوں کے ساتھ چترال گئے اور سید صاحب پنجتار پہنچ چکے تھے۔ جب یہ واپس آئے، سلیمان شاہ نے بھی چند چیزیں بطور تحفہ بھیجیں۔ مثلاً: ایک قرآن مجید خوش خط اور مطلا، ایک پیش قبض فولادی، شیر ماہی کے دستے کی جس کی تہنال اور مہنال نقرئی تھی۔ تسمے کے بجائے اس میں کلابتون اور ریشم کے گوندھے ہوئے ڈورے تھے اور دستے کے حلقے میں کلابتون اور ابریشم کا جھبا تھا۔ (۲)

اخوند صاحب اس کے بعد بھی دو تین مرتبہ چترال گئے اور آئے۔ مزید معلوم ہوا کہ ان کا اصل وطن غزنی شہر یا آس پاس کا علاقہ تھا، اس لئے کہ بعض روایتوں میں انہیں

---

(۱) وقائع ص: ۳۸۲۔

(۲) وقائع ص ۵۲۲۔

اخوند فیض محمد غزنوی لکھا ہے۔ نیز وہ واقعہ بالاکوٹ کے بعد اس جماعت میں شامل تھے جو شیخ ولی محمد کی سرکردگی میں اس غرض سے سوات گئی تھی کہ سید صاحب کی چترالی بی بی صاحبہ کو سندھ پہنچانے کی تدبیر کرے۔ جب کوئی صورت نہ بن سکی تو یہ جماعت سوات سے بونیر لوٹ گئی۔ بعد ازاں شیخ ولی محمد کو فتح خاں پنجتاری نے اپنے ہاں بلا لیا۔

امجد خاں

یہ گھتنی (گوتنی) کے باشندے تھے۔ سید صاحب نے انہیں ایک جیش کا امیر بنادیا تھا۔ غالباً آپ کے ساتھ سرحد پہنچے۔ سوات کے دورے میں شریک تھے۔ درش خیل میں انہیں کے کہنے پر مولوی فتح علی ایک پیسے کا آٹا بنئے کی دکان سے لینے گئے تو اس نے سوات کے اوزان کے مطابق سات سیر آٹا دیا جو ٹونک کے اوزان کے مطابق ساڑھے تین سیر ہوا۔ غالباً شنکیاری کی جنگ تک سرحد میں موجود تھے۔ اس جنگ میں سید جعفر علی نقوی جہاد کے لئے روانہ ہوئے اور گھتنی پہنچے، اس زمانے میں امجد خاں تازہ تازہ سرحد سے آئے تھے۔

امام الدین بمبئی والے

یہ سید صاحب کے مخلص مرید اور بڑے دیندار بزرگ تھے۔ جب خیر الدین نے اٹک پر حملے کی تجویز پیش کی تھی تو سید صاحب نے مولوی امام الدین ہی کو دو آدمیوں کے ساتھ بہ تبدیل لباس اٹک بھیجا تھا، تا کہ حالات کی چھان بین کرائیں۔ انہوں نے دس دن اٹک میں گزار کر تمام حالات دریافت کیے۔ انہیں کی رپورٹ پر ایک خاص جیش اٹک بھیجا گیا، جس کے حالات ''سید احمد شہید'' میں تفصیلاً مذکور ہیں۔ مولوی صاحب موصوف نے بالاکوٹ میں شہادت پائی۔

حاجی زین العابدین

اس زمانے میں سید صاحب سے ارادت پیدا ہوئی جب آپ نواب امیر خاں کے لشکر میں تھے اور حاجی زین العابدین بھی سپاہیوں میں شامل ہوئے۔ ابتدا میں لا ابالی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک موقع پر سید صاحب کی مجلس میں پہنچے اور آپ کی نظر پڑی تو کایا پلٹ گئی۔ نواب وزیر الدولہ نے کیا خوب لکھا ہے:

روزاں وشباں بہ گردِ مرداں می گرد ◆ مردے گردی چو گردِ مرداں گردی

ٹونک میں اقامت اختیار کرلی تھی۔ سید صاحب کی خاندانی دلق انہیں کے پاس تھی۔ ایک مرتبہ ٹونک سے باہر بیٹھے بیٹھے حج کا خیال آیا، وہیں سے روانہ ہو گئے۔ دلق سید برکت علی بن سید محمود کے ہاتھ نواب وزیر الدولہ کے پاس بھیج دی کہ وہ اسے سید صاحب کی اہلیہ محترمہ کے یہاں پہنچا دیں۔ نواب نے وضو کیا اور دلق کا بقچہ اپنے سر پر رکھ کر پیدل سید صاحب کی اہلیہ کے مکان پر پہنچے اور خود یہ گراں قدر تحفہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔ سیدہ اتنی خوش ہوئیں کہ اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر نواب صاحب کو کھلایا۔

سید عبد الرؤف

یہ ہابڑہ علاقہ سرحد کے باشندے تھے۔ ابتدا ہی میں سید صاحب سے وابستہ ہو گئے تھے۔ جنگ شیدو کے بعد چنگئی کے سفر میں سید صاحب کے ہمراہ رہے۔ اتمان زئی کی جنگ میں بھی ساتھ تھے اور عالم خاں رئیس اتمان زئی کی نیت بدل جانے کی پہلی اطلاع انہیں نے سید صاحب کو پہنچائی تھی۔

ایک مرتبہ سید صاحب کے پاس شکایت کی کہ شاہ اسمٰعیل مجھے گھر جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ دنیا داروں کے نوکر کبھی بلا اذن نہیں جاتے، پھر

سب کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

> "کون کس کام کے لائق ہے، اس کا فیصلہ امام کے ہاتھ ہے۔ جو لوگ میرے ساتھ رہیں گے، وہ مولوی ہوں یا ملا، ان سے جہاد کا کام لینے میں رعایت نہ کروں گا۔ جہاد میں ملا اور سید کو دوسروں سے آگے رہنا چاہیے۔"

محمد عرب اور فرج اللہ

یہ عرب سے سید صاحب کے ساتھ آئے تھے۔ بڑے مخلص اور نہایت عقیدت مند تھے۔ لشکر اسلام کا نشان فتح اللہ انہیں کے پاس رہتا تھا۔ پھر یہ نشان فرج اللہ کے حوالے ہو گیا۔ والدہ نے یہ کہہ کر فرج اللہ کو سید صاحب کے حوالے کیا تھا کہ آپ کی زندگی ٹھیک کاموں میں گذرے گی۔ اس نے اہل سمہ کی سازشِ قتل میں شہادت پائی۔

داراب اور غریب اللہ

یہ دونوں علاقہ گورکھپور کے تھے۔ شیخ داراب امب میں سید صاحب کے ساتھ تھے۔ مغرب کے بعد اندھیرا ہو گیا تو سید جعفر علی نقوی کی تلاش میں نکلے جو سید صاحب کے پاس بالا خانے میں تھے۔ راستے میں ایک کوٹھری کی چھت ٹوٹی ہوئی تھی، انہیں خیال نہ رہا اور چلتے چلتے اس میں گر گئے۔ سید صاحب نے گرنے کی آواز سنی تو فوراً باہر تشریف لائے اور پوچھا: بھائی! کون ہے۔ شیخ داراب نے اپنا نام اور پتا بتا دیا۔ پھر پوچھا: بھائی! چوٹ تو نہیں لگی؟ شیخ نے عرض کیا آپ کی دعاء سے محفوظ رہا۔

غریب اللہ کا ذکر جنگ بالاکوٹ کے بعد آیا۔ وہ یوں کہ سید جعفر علی نقوی کے بیان کے مطابق غریب اللہ نے مراجعت کا ارادہ کر لیا اور نقوی سے کہا کہ کوئی خط اپنے والدین کو دینا چاہو تو لے جاؤں۔ چنانچہ نقوی کے والدین کو سید صاحب کی شہادت کی پہلی خبر غریب اللہ ہی کے ذریعے سے ملی تھی۔

تیسواں باب:

مختلف اصحاب (۲)

حاجی بہادر شاہ خاں

سید صاحب کے قدیم مخلصین میں سے تھے۔ ایک مرتبہ انہیں ہندوستان بھی بھیجا گیا تھا۔ سکھوں سے مصالحت کی گفتگو میں یہ مولوی خیرالدین شیرکوٹی کے رفیق تھے۔ انتظامِ عشر کے بعد انہیں تحصیل کیلئے گڑھی امان زئی میں مقرر کر دیا گیا تھا۔ جس زمانے میں اہل سمہ نے مجاہدین کے قتل کی سازش مکمل کر لی تھی۔ حاجی بہادر شاہ خاں سید صاحب سے ملنے کیلئے پنجتار آئے ہوئے تھے۔ وہ گڑھی امان زئی واپس جاتے ہوئے اسمعیلہ پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے بہ اصرار روک لیا۔ وہ لوگ حاجی صاحب کے بڑے عقیدت مند تھے۔ پرتکلف کھانا کھلایا۔ عشاء کی نماز میں انہیں امام بنایا۔ جب وہ پہلی رکعت کے سجدے میں گئے تو موضع کے خان اسمٰعیل نے تلوار سے ان کا سر قلم کر ڈالا۔ مولانا مظہر علی اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کے بعد اہل سمہ کے قاتلانہ حملوں کا آغاز حاجی بہادر شاہ خان ہی سے ہوا۔

سدم کے شہداء

گڑھی امان زئی علاقہ سدم کی تحصیل پر حاجی بہادر شاہ خاں کے علاوہ حاجی محمود خاں بھی مقرر تھے اور وہ پندرہ مجاہدوں کے ساتھ سدم میں مقیم تھے۔ بلوے کے آثار نمودار ہوئے تو محمود خاں اپنی جماعت کو لے کر جواں کے بیٹے اور بھائی کے شمول سے سترہ پر پہنچ

چکی تھی، باہر ندی پر جا ٹھہرے۔ مبین خاں رئیس سدم نے پاس جا کر ایسے انداز میں اظہار خیال کیا کہ مجاہدین فریب میں آ گئے۔ ان سے بہ لطائف الحیل ہتھیار لے لئے گئے۔ پھر ایک دم ان پر حملہ بول دیا گیا۔ سید جعفر علی نقوی نے لکھا ہے کہ سب کو انتہائی بے رحمی سے قتل کیا۔ بعض کو زمین پر گرا کر بھیڑ بکری کی طرح ذبح کر ڈالا۔ ان میں سے صرف دو بچ سکے۔ شہداء میں سے مندرجہ ذیل کے سوا کسی کا نام معلوم نہ ہو سکا:

حاجی محمود خاں، ان کا بیٹا یوسف خاں، بھائی عظیم اللہ خاں، دو بھتیجے برہان الدین اور عبدالوہاب، کریم بخش جراح، استاد خدا بخش ملکیت ساکن جھاؤں۔

قابل غور امر یہ ہے کہ محمود خاں اہل سدم کے ہم قوم تھے ان کے بھائی عظیم اللہ خاں کو خود ان کے خسر نے ذبح کیا اور اپنی بیٹی کو بیوہ بنا دیا۔

شیوہ کے شہداء

موضع شیوہ میں جو مجاہدین مامور تھے، ان میں سید امیر علی بلوے کے ابتدائی آثار دیکھتے ہی گھوڑے پر سوار ہو کر پنجتار چلے گئے، اس لئے کہ ان کے پاس بیت المال کے پانچ ہزار روپے جمع تھے اور بیت المال کے روپے کی حفاظت ان کے نزدیک جان پر مقدم تھی۔ حافظ عبدالعلی پھلتی انہیں گاؤں سے باہر پہنچا گئے اور خود یہ کہتے ہوئے واپس چلے گئے کہ اس نازک وقت میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ راتوں رات گاؤں کا محاصرہ کر لیا گیا۔ تمام مجاہدین میں سے صرف ایک شیخ گلاب بچ کر پنجتار پہنچے۔ شہداء میں سے صرف حافظ عبدالعلی، حافظ عبداللہ، شیخ ناصر الدین اور مولوی محمد رمضان کے نام معلوم ہو سکے۔ حافظ عبدالعلی پھولڑہ کی جنگ میں بھی شریک تھے۔ وہاں سے سلامت اسب پہنچے تو خاص رفیقوں کی مجلس میں بار بار حسرت سے کہا کرتے تھے کہ شہادت نصیب نہ ہوئی۔ کیا معلوم تھا کہ ان کی شہادت غیروں کے ہاتھ سے نہیں، اپنوں کے ہاتھوں سے

مقدر تھی۔

ترلانڈی اور ترکئی کے شہداء

ترکئی اور یاردہین کے شہداء میں سے محمد حسین، مولوی امیرالدین اور ریاست علی موہانی کے نام معلوم ہیں۔ ریاست علی نہایت خوش گلو تھے اور جنگ کے موقع پر جہادیہ خوش آہنگی سے پڑھا کرتے تھے۔ ترلانڈی میں کم از کم پانچ ہزار سوار تھے۔ ان میں سے صرف ایک لکھمیر خاں سلامت بچے۔

مینئی کے شہداء

مینئی میں میر حامد علی جھنجھانوی پن چکیوں کے انتظام پر مامور تھے۔ ان کے ساتھ بیس پچیس آدمی رہتے تھے۔ وہ سید صاحب کا حکم پاتے ہی آٹا لے کر پنجتار چلے گئے۔ صرف تین آدمیوں کو غلے کی حفاظت کے لیے چھوڑ گئے۔ عین اسی وقت پیر خاں مورائیں پینتیس مجاہدوں کے ساتھ کھتل سے مینئی پہنچ گئے۔ انہیں خطرے کی اطلاع مل چکی تھی، لیکن لمبی منزل طے کر کے آئے تھے، اس لیے ستانے کی غرض سے ٹھہر گئے اور مسجد میں رات گزاری۔ راتوں رات مسجد کا محاصرہ کر لیا گیا۔ پینتیس مجاہدوں میں دو غلے کے گودام میں پہنچ گئے تھے: ایک یوسف علی خاں اور دوسرے حبیب خاں بیر وال۔

جن مجاہدوں کو میر حامد علی خاں چھوڑ گئے تھے ان میں سے صرف دو کے نام معلوم ہیں: ایک خدا بخش رام پوری، دوسرے داؤد خاں خورجوی۔ غرض یہ چار (خدا بخش، داؤد خاں، یوسف علی خاں اور حبیب خاں) ایک ملا کی خیر خواہی کے باعث بچ گئے۔ مسجد کے تینتیس مجاہدوں میں سے صرف آٹھ سلامت رہے، باقی سب نے مینئی میں جامِ شہادت نوش کیا۔

سید چراغ علی شاہ

یہ پٹیالہ کے باشندے تھے۔ اکثر مہموں میں شریک رہے۔ اتمان زئی پر پیش قدمی کے دوران میں بیت المال کی بہت بڑی رقم بمقام ٹوپی دفن کر دی گئی تھی۔ اتمان زئی سے مراجعت پر جس جماعت کو یہ رقم لانے کیلئے بھیجا گیا، ان میں سید چراغ علی شاہ بھی شامل تھے۔ گویا یہ معتمد علیہ مجاہدوں میں شمار ہوتے تھے۔ یوم بالاکوٹ کی صبح کو سکھ فوج مٹی کوٹ کے ٹیلے پر نمودار ہوئی تو اکثر مجاہدین کھانا کھا چکے تھے۔ سید چراغ علی شاہ نے کھیر چولہے پر چڑھا رکھی تھی۔ کفگیر ہلاتے جاتے اور وقتاً فوقتاً نظر اٹھا کر سکھوں کو دیکھ لیتے۔ اچانک ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی۔ کفگیر اٹھا کر دیگچی پر مارتے ہوئے کہا: بس اب حور ہی کے ہاتھ سے کھانا کھائیں گے۔ پھر تیزی سے مٹی کوٹ کے ٹیلے کی طرف دوڑ پڑے۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہوا اور کسی کو انہیں روکنے کا موقع نہ مل سکا۔ تھوڑی دیر میں اتنی دور جا چکے تھے کہ انہیں روکنا بے سود معلوم ہوا۔ اسی حالت میں گولی لگی اور شہید ہو گئے۔ یوم بالاکوٹ کے یہ پہلے شہید تھے۔

باقر علی عظیم آبادی

یہ مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کے چچیرے بھائی تھے۔ سفر ہجرت کے دوران میں کھنیسر اور براڑی کے مقامات پر لوگ غلط فہمی میں جماعت مجاہدین کو قزاقوں اور رہزنوں کا قافلہ سمجھ بیٹھے اور مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ دونوں جگہ سید صاحب نے شیخ باقر علی ہی کو ترجمان کے ساتھ بھیجا کہ لوگوں کی غلط فہمی کو دور کر دیں۔ انہیں رسد کی تقسیم میں مولانا محمد یوسف پھلتی کا معاون بنا دیا گیا تھا۔ اس لئے قاسم غلہ کے لقب سے مشہور تھے۔ جنگ اکوڑہ سے جہاد کا آغاز ہوا۔ مولوی باقر علی اس میں شریک تھے۔ سکھ لشکر گاہ سے جو پہلی گولی آئی وہ انہیں کے لگی۔ زخم کاری تھا، بیٹھ گئے اور بولے: بھائیو! میرا

کام تمام ہوا۔ اب مجھ سے ہتھیار لے لو، یہ اللہ کا مال ہے۔ ساتھ ہی ان کی روح اعلیٰ علیین میں پہنچ گئی۔ سید صاحب کی جماعت کے وہ پہلے فرد تھے جنہیں خلعتِ شہادت نصیب ہوا۔ ان کے پاس ایک تلوار تھی اور دو پستول اور ایک بندوق۔ پستولوں میں سے ایک کا نام عبداللہ رکھا تھا اور دوسرے کا بسم اللہ۔

مولوی طالب علی

یہ مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے چھوٹے بھائی تھے۔ صرف اٹھارہ انیس برس کی عمر تھی۔ سید صاحب کے ساتھ سرحد پہنچے، جنگِ شیدو کے بعد ورمِ جگر وطحال میں مبتلا ہو کر بمقام چنگلئی فوت ہوئے۔

کریم بخش گھاٹم پوری

یہ سید صاحب کے ابتدائی رفیقوں میں سے تھے۔ ہجرت میں ساتھ تھے۔ سید حمید الدین کے ایک مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب امیر خاں نے ٹونک سے کچھ چھکڑے بار برداری کے لئے سید صاحب کے ساتھ کر دیے تھے۔ ایک چھکڑا سید صاحب کا بھی تھا۔ اجمیر سے پالی پہنچ کر معلوم ہوا کہ چھکڑے ریت میں کام نہ دے سکیں گے، لہٰذا انہیں واپس کرنا پڑا۔ کریم بخش ہی ان کے ساتھ ٹونک واپس آئے تھے اور سید حمید الدین نے ایک خط اس غرض سے انہیں دے دیا تھا کہ اجمیر پہنچ کر ڈاک میں ڈال دیں۔

یقین ہے کہ یہ چھکڑے ٹونک پہنچا کر جلد واپس چلے گئے ہوں گے۔ جنگ مایار کے موقع پر یہ بھی تورو میں تھے۔ اُدھر لڑائی شروع ہوئی اِدھر انہوں نے اپنے ساتھیوں کے لئے روٹیاں پکائیں اور کمر میں باندھ کر میدانِ جنگ کی طرف چلے۔ راستے میں درانی سوار مل گئے جو لشکرِ اسلام کے سواروں سے لڑتے بھڑتے آ رہے تھے۔ کریم بخش ان میں گھر گئے، کسی نے تلوار مار کر انہیں شہید کر ڈالا۔

جنگ مایار میں جو مجاہدین تورو سے قریب شہید ہوئے تھے، ان سب کو قصبے کے شمالی و مغربی کونے میں ایک بڑی قبر کھدوا کر دفن کیا گیا تھا، انہیں میں کریم بخش بھی تھے۔

حافظ جانی و حافظ مانی

یہ دونوں پانی پت کے تھے، بڑے پرہیز گار اور مطیع و فرمانبردار، غالباً اہل لشکر ان سے قرآن بھی پڑھا کرتے تھے۔ سید حمید الدین کے ایک مکتوب سے واضح ہوتا ہے کہ سید احمد علی (خواہر زادہ سید صاحب) کے فرزند سید ابوالقاسم سفر ہجرت میں انہیں تین پارے روزانہ سنایا کرتے تھے۔

قاضی علاء الدین بگھروی

یہ مولانا عبدالحئی کے شاگرد اور وقت کے ممتاز عالم تھے۔ سید صاحب کے ایماء سے اسلامی مسائل نظم کر رہے تھے تاکہ عام خواندہ مسلمان انہیں بہ آسانی یاد کر لیا کریں۔ اس کے ابتدائی شعر یہ تھے:

کروں حمد اس ذات بے عیب کی ✿ صمد اور غنی عالم الغیب کی
جو محتاج ہرگز کسی کا نہیں ✿ اسی کے ہیں محتاج سب ہر کہیں

جتنا حصہ نظم کر لیتے تھے، وہ شاہ اسماعیل کو سنا دیا کرتے تھے تاکہ کوئی غلطی یا خامی حتی الامکان باقی نہ رہے۔ بالاکوٹ میں شہادت پائی اور رسالہ مکمل نہ ہو سکا۔

مایار کے شہداء

جنگ مایار کے بعض ممتاز شہداء کے حالات الگ لکھے جا چکے ہیں۔ باقی اصحاب میں سے بعض کی کیفیت یہ ہے:

۱۔ **مولوی عبدالرحمٰن ساکن تورو:** یہ ابتدا ہی سے سید صاحب کے ساتھ ہو گئے۔ سفارت و مصالحت کے کام زیادہ تر انہیں سے لئے جاتے تھے۔ مایار میں ان کا سر تن سے الگ ہو چکا تھا۔

۲۔ **شیخ عبدالحکیم پھلتی:** ان کا سر بھی تن سے الگ ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے ڈھونڈ کر لائے اور اسے تن سے ملا کر دفن کیا۔

۳۔ **لعل محمد:** وطن معلوم نہ ہو سکا۔ یہ سید صاحب کے باورچی خانہ سے متعلق تھے۔

۴۔ **شیخ عبدالرحمٰن رائے بریلوی:** جنگ میں سخت زخمی ہوئے، تورو لا کر ان کے زخم سیے گئے۔ کچھ باتیں بھی کیں، پانی بھی پیا، پھر جاں بحق ہو گئے۔ شہدائے مایار میں سے یہی تھے جنہیں غسل بھی دیا گیا اور کفن بھی پہنایا گیا۔

کنیرڑی کے شہداء

ان میں سے امام خاں کے حالات الگ لکھے جا چکے ہیں۔ باقی شہداء کے نام یہ ہیں:

(۱) سید ظہور اللہ بنگالی۔ (۲) فیض اللہ بنگالی۔

(۳) حاجی عبداللہ رام پوری۔ (۴) سید مدد علی۔

(۵) سید دلاور علی: ان کے گولی لگی تو یہ گرے، رفیقوں نے ہاتھ پکڑ لئے نیچے سے پائندہ خاں تنولی کے آدمی ان کے پاؤں پکڑ کر کھینچنے لگے۔ امام خاں نے ذرا آگے بڑھ کر بندوق سر کی تو ان کی کنپٹی میں گولی لگی اور وہ بھی شہید ہو گئے۔

چھتر بائی کے شہداء

چھتر بائی کی محافظ فوج کے سر عسکر شاہ اسمٰعیل شہید تھے۔ حافظ عبداللطیف نیوتنوی نے ایک مرتبہ بطور خود مجاہدین سے کہہ دیا کہ نماز عصر کے بعد گڑھی پر حملہ ہو گا۔ مجاہدین

سمجھے کہ شاہ صاحب کا حکم ہوگا، حالانکہ وہ اس سے بالکل بے خبر تھے۔ حملہ ناکام رہا اور اس میں چند مجاہدین شہید ہوئے جن میں سے شیخ علی محمد کے حالات الگ لکھے جا چکے ہیں۔ اخوند زعفران کے بیتنڑے میں آگ لگ گئی اور جسم جگہ جگہ سے جل گیا۔ کچھ مجاہدین زخمی بھی ہوئے، مثلاً نہال خاں، ملا گلزار قندھاری، رحیم بخش بناری۔

سید مردان علی شاہ

یہ رضوی سید تھے۔ جدِ اعلیٰ بہ عہد فیروز تغلق مشہد سے ملتان آئے۔ پھر دہلی ٹھہرتے ہوئے جھجر میں مقیم ہوگئے۔ سید مردان بن علی مختلف شہروں میں پھرتے رہے۔ لکھنؤ میں سید صاحب سے بیعت کی تھی اور باقاعدہ خلافت نامہ حاصل کیا۔ یہ بھی ان اصحاب میں سے تھے، جنہیں سید صاحب نے تبلیغ جہاد کے لئے مقرر فرما دیا تھا۔ گرد و نواح کے علاقے میں دورہ کرتے جھجر، ریواڑی، الور اور تجارہ کے مسلمان ان کے وعظ و تبلیغ سے بہت متاثر ہوئے۔ یہ جماعت مجاہدین کیلئے رقمیں اور آدمی فراہم کرتے تھے۔ ریواڑی اور اطراف کے سیدوں، قاضیوں اور دوسرے افراد نے ایک مرتبہ اجتماع منعقد کرکے فیصلہ کیا تھا کہ مسلمانوں میں جو غیر اسلامی رسمیں رائج ہو چکی ہیں، انہیں حتمی طور پر ترک کر دیا جائے۔ یہ سید مردان علی شاہ ہی کی تبلیغی کوششوں کا ایک کرشمہ تھا۔

سید مردان علی شاہ کے پاس ایک خاص بیاض تھی، جس میں سید صاحب کا خلافت نامہ درج تھا، نیز ان کے سفرِ حج اور مجاہدانہ سرگرمیوں کی تفصیلات مرقوم تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں جھجر بری طرح تباہ ہوا، اس میں یہ بیاض بھی ضائع ہوگئی۔ سید مردان علی شاہ کے فرزند ارجمند سید قاسم علی شاہ نے پھر محنت و کوشش سے بیاض تیار کر لی تھی۔ وہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ نقلِ وطن میں ضائع ہوگئی۔ سید قاسم علی شاہ کے نواسے سید صادق علی شاہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور آج کل سندھ میں مقیم ہیں۔ (۱)

---

(۱) سید مرادن علی شاہ کے متعلق یہ حالات مجھے پروفیسر محمد سلیم صاحب لیکچرار گورنمنٹ کالج میرپور خاص سے معلوم ہوئے۔

اکتیسواں باب:

مختلف اصحاب (۳)

مولوی محمد حسن

مولوی صاحب موصوف رام پور منہاران کے تھے۔ شاہ اسماعیل شہید اور مفتی الٰہی بخش کاندھلوی سے علم کی تکمیل کی۔ (۱) بیان کیا جاتا ہے کہ ابتدا میں نازک طبع اور نفاست پسند تھے، اگرچہ ''ارواحِ ثلاثہ'' میں ان کی نازک مزاجی کے علاج کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے وہ کسی لحاظ سے بھی قابل قبول نہیں۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ دورانِ جہاد میں انتہائی سادگی سے زندگی گزاری، یہاں تک کہ اپنے لیے سونے کی بھی کوئی خاص جگہ مقرر نہ کی۔ سید صاحب کی باتیں سننے کے شوق میں پاس بیٹھے رہتے، نیند آتی تو وہیں زمین پر سو جاتے۔

مولوی محبوب علی دہلوی قافلہ لے کر سرحد پہنچے تو راستے کی تکلیفوں سے اس قدر پریشان ہوئے کہ واپسی کا قصد کر لیا اور مجاہدین سے بھی کہنا شروع کر دیا کہ گھر واپس چلو اور اقربا کے جو حقوق تمہارے ذمے ہیں، انہیں ادا کرو۔ دوسرے مجاہدین کے علاوہ مولوی محمد حسن نے بھی اس موقع پر مولوی محبوب علی سے گفتگو کی تھی:

محمد حسن: حضرت! آپ کس دلیل سے مجاہدین کے قیام کو لغو ٹھہراتے ہیں؟

محبوب علی: آخر میاں کس کافر سے جنگ درپیش ہے؟

محمد حسن: جنگ کو قتال کہتے اور اس کا موقع گاہے گاہے آتا ہے۔ جہاد یہ ہے کہ اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے سعی کی جائے۔ یہاں سب لوگ اس کام میں مصروف ہیں، آپ انکے

---

(۱) ارواح ثلاثہ

فعل کو عبث قرار دیتے ہیں؟ اگر کسی روز کافروں سے مقابلہ پیش آ جائے اور آپ دہلی میں ہوں تو کونسی کرامت سے دور دراز کا راستہ طے کرتے ہوئے اس میں شریک ہو سکیں گے؟

مولوی محبوب علی یہ دلیل سن کر لا جواب ہو گئے۔

شہادت

فتح امب کے بعد پائندہ خاں تنولی سے مصالحت کی گفتگو شروع ہو گئی تو ایک مرتبہ شیخ ولی محمد پھلتی اور مولوی خیر الدین شیر کوٹی کے علاوہ مولوی محمد حسن کو بھی سید صاحب نے پائندہ خاں کے پاس بھیجا تھا اور وہ سید صاحب کی مجلس شوریٰ کے بھی مستقل رکن تھے، یعنی تمام اہم مشوروں میں شریک ہوتے تھے۔

سید احمد علی رائے بریلوی کو سالارِ اعلیٰ بنا کر پھولڑہ بھیجا گیا تو مولوی محمد حسن کو ان کا مشیر خاص مقرر کر دیا گیا۔ یہ اور رحیم بخش جراح جنگ کے وقت پاس کھڑے تھے۔ جب سید احمد علی کی شہادت کا علم ہوا تو ایک دم گھمسان کے رن میں گھس گئے اور مردانگی سے لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ پھولڑہ ہی کے گنج شہیداں میں سید احمد علی اور دوسرے رفقاء کے ساتھ دفن ہوئے۔ ''منظورہ'' کا بیان ہے کہ شاہ اسماعیل کے بعد لشکر اسلام میں عجز، علم، خاکساری اور قابلیت کے لحاظ سے مولوی محمد حسن جیسا کوئی نہ تھا۔

میرزا عبدالقدوس کشمیری

یہ جنگ پھولڑہ میں شریک تھے۔ اگرچہ پیدل تھے، لیکن دیر تک سکھ سواروں کا مقابلہ کرتے رہے۔ جب کوئی سکھ سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا ان کی طرف آتا تو دسترس میں آتے ہی بجلی کی سرعت سے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لیتے اور چشم زدن میں تلوار سے اس کا سر اڑا دیتے۔ کوئی سوار نیزہ تان کر آتا تو اس کا مقابلہ بھی خوب کرتے۔ اگر نیزہ دائیں جانب ہوتا تو اس کے قریب پہنچتے ہی یہ اچھل کر بائیں جانب ہو جاتے۔ نیزے کا

رخ بائیں جانب ہوتا تو دائیں جانب چلے جاتے۔ پہلے نیزہ کاٹتے پھر سوار کا سر قلم کرتے۔ کئی سواروں کو موت کے گھاٹ اتارا، آخر خود بھی جامِ شہادت پی کر زندۂ جاوید گروہ میں شامل ہوگئے۔

میر احمد علی بہاری

بڑے خوش رو اور سرو قامت جوان تھے اور حد درجہ دلیر و جواں مرد۔ تلوار اور بندوق چلانے میں یکساں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ بہت سے سکھوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ آخر دشمن سواروں کے ایک گروہ نے انہیں زغے میں لے لیا۔ میر صاحب بولے: ذرا ٹھہر جاؤ، میں بھاگ نہ جاؤں گا، مجھ پر گولی نہ چلاؤ اور میری شمشیر زنی کے جوہر دیکھ لو۔ پھر خاصی دیر تک تمام سواروں سے تنہا لڑتے رہے، جس پر ان کی تلوار پڑ جاتی یا تو سر قلم ہو جاتا یا بازو کٹ جاتا یا پاؤں اڑ جاتا۔ آخر ایک سکھ نے گولی مار کر انہیں شہید کر دیا۔

امام خاں سہرامی اور شیخ برکت اللہ بھی پھولڑہ ہی میں شہید ہوئے۔ آخر الذکر کے سینگڑے میں آگ لگ گئی جس سے سارا جسم جل گیا، اسی حالت میں انہیں شہید کیا گیا۔

شہیدانِ ڈمگلہ

ڈمگلہ کی جنگ میں صرف دو مجاہدوں کی شہادت کا علم ہو سکا: ایک عبدالخالق محمد آبادی، دوسرے سید لطف علی۔ یہ دونوں سخت زخمی ہو گئے تھے۔ مجاہدین نے واپس جانے سے پیشتر تمام زخمیوں کو اٹھانے کا بندوبست کر لیا، لیکن ان دونوں نے کہہ دیا کہ ہمارے ہتھیار لے لو اور اٹھانے کی تکلیف گوارا نہ کرو۔ ہمیں اسی میدان میں جان دینا پسند ہے۔

قاضی مدنی

سید صاحب کے خاص معتقدوں میں سے تھے۔ ایک مرتبہ شاہ زمان درانی کے

وکیل جمال الدین نے ایک کتے کے سر میں تیر مارا، تیر اسکے سر میں گھس گیا اور وہ پریشان حال اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ سید صاحب بہت ناراض ہوئے کہ ایک بے ضرر جانور کو خواہ مخواہ اذیت پہنچائی۔ قاضی مدنی کتے کے پیچھے بھاگے اور اس کے سر سے تیر نکال کر دم لیا۔

لاہوری قاضی صاحب ہی کا سائیس تھا، جسے ایک مرتبہ عنایت اللہ خاں نے جو جماعتِ خاص کا آدمی تھا، تھپڑ مارا اور مقدمہ قاضی حبان کے سامنے پیش ہوا۔ آخر قاضی حبان نے فیصلہ لاہوری کے حق میں صادر کر دیا۔ اس وقت لاہوری نے عنایت اللہ خاں کو معاف کر دیا۔

ملا اسماعیل اخوندزادہ

ملا صاحب اہل سرحد میں سے تھے۔ جب شاہ اسماعیل کو ابتداء میں ہزارے بھیجا گیا تو یہ بھی شاہ صاحب کے ساتھ تھے۔ انہوں نے اپنے خطوں میں اخوندزادہ کے علم وفضل، اخلاص وتقویٰ، عقل ودانش، حسن تدبیر اور اصابت رائے کی بار بار ستائش فرمائی۔ ایک موقع پر لکھا:

> ''ملا اسماعیل اخوند زادہ نہایت ہوشیار و دیانت دار ہیں اور مشاورت ومصالحت میں پختہ کار۔ وہ ان اطراف (ہزارہ) کے تمام فضلا کے پیش کار ہیں اور جملہ خوانین کے معتمد۔ دین کے کام میں بجان مصروف ہیں اور تالیف وترغیب میں بہ دل مشغول۔''

ارباب فیض اللہ خاں مہمند

یہ ہزار خانی (نزد پشاور) کے رئیس تھے۔ سلطان محمد خاں نے انہیں کے ذریعے سے سید صاحب کے پاس مصالحت کا پیغام بھی بھیجا تھا اور انہیں کے ذریعے سے صلح کی گفتگو پایۂ تکمیل پر پہنچی تھی۔ ارباب نے بات چیت کے دوران میں عرض کر دیا تھا کہ اگر

سلطان محمد خاں اور اس کے بھائی مصالحت کے بعد بھی پرانی روش پر قائم رہیں گے تو میں ان کا ساتھ چھوڑ کر سید صاحب کی رفاقت اختیار کر لوں گا۔

سید صاحب کی طرف سے شاہ اسماعیل نے دو مرتبہ سلطان محمد خاں سے ارباب کے وطن ہزار خانی ہی میں بات چیت کی۔ پھر سید صاحب سے سلطان محمد خاں کی ملاقات قرار پا گئی تو جس طرح سید صاحب کے ساتھ شاہ صاحب اور ارباب بہرام خاں اس ملاقات کیلئے گئے، اسی طرح سلطان محمد خاں کے ساتھ ارباب فیض اللہ خاں اور سردان علی آئے۔ سید صاحب پشاور سے واپس پنجتار جانے کیلئے تیار ہوئے تو ارباب فیض اللہ خاں نے ہزار خانی میں پورے لشکر کے لئے پُر تکلف دعوت کا انتظام کیا۔

کچھ مدت بعد ارباب کو یقین ہو گیا کہ سلطان محمد خاں کے طور طریقوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اغلب ہے انہیں اس سازش کے متعلق بھی سرسری اطلاعات مل چکی ہوں جو مجاہدین کے لئے بے خبرانہ قتل کے متعلق کی جا رہی تھی۔ لہٰذا انہوں نے ایک مخلص دوست کی حیثیت میں مولانا مظہر علی قاضی پشاور کو آگاہ کر دیا کہ ان لوگوں کی نیت میں فتور ہے اور یہ بغاوت کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ سید صاحب کو اطلاع دے کر مناسب ہدایات حاصل کر لیں۔

سلطان محمد خاں نے سازش مکمل ہو جانے کے بعد جہاں مولانا مظہر علی اور ان کے رفیقوں کو خاک و خون میں تڑپایا وہاں ارباب فیض اللہ خاں کو بھی شہید کر ڈالا، اس لئے کہ اسے یقین تھا کہ ارباب بہرحال سید صاحب کا ساتھ دے گا۔

ناصر خاں بھٹ گرامی

یہ بھٹ گرام (علاقہ نندھیاڑ) کے رئیس تھے۔ ابتدائی دور ہی میں سید صاحب سے وابستگی پیدا کر لی تھی اور راہِ وفا پر برابر قائم رہے۔ بالاکوٹ میں سید صاحب کے ساتھ تھے

اور جنگ کے متعلق مختلف مشوروں میں شریک رہے۔ ان کا مورچہ ست بنے کے کنارے شیخ ولی محمد کی جماعت کے بائیں ہاتھ تھا۔ اس جنگ میں ان کا ہاتھ زخمی ہوا۔ پھر جب میدان میں یہ افواہ پھیلی کہ سید صاحب کو گوجر اٹھا کر لے گئے ہیں، تو دوسرے مجاہدین کے ساتھ یہ بھی روانہ ہو کر بالاکوٹ کے عقبی پہاڑ پر پہنچے۔ مجاہدین نے پہلی رات انہیں کے گاؤں میں گزاری تھی۔ یہ بعد ازاں بھی سید صاحب کے رفیقوں کی مدارات واعانت میں سرگرم رہے۔ جنگ بالاکوٹ سے دو تین سال بعد وفات پائی۔

اخوند سید میر

یہ عام طور پر ملا صاحب کوٹھا کے نام سے مشہور ہیں، جو تحصیل صوابی ضلع مردان کا ایک مشہور مقام ہے اور سید صاحب کے مخلص ارادت مند تھے۔ بیعت اقامت شریعت کے بعد انہیں قریہ کوٹھا کا قاضی بنا دیا گیا اور ۱۵ر شعبان ۱۲۴۴ھ کو ان کے نام باقاعدہ قضا نامہ جاری ہوا۔ سید صاحب سے تعلق کی بنا پر ملا صاحب گوناگوں آلام ومصائب کے ہدف بنے۔ ایک موقع پر انہیں وہابیت سے متہم کیا گیا اور ان کی زندگی خطرے میں پڑ گئی، لیکن وہ بہر حال صحیح اسلامی مسلک پر مستقیم رہے۔

اکابر ہند میں سے دو بزرگوں کو ملا صاحب سے خاص تعلق پیدا ہوا: ایک مولانا غلام رسول صاحب قلعہ میہاں سنگھ والے، دوسرے مولانا سید عبداللہ غزنوی۔ مولانا غلام رسول خود اپنا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ میں پہلے اخوند صاحب سوات کے پاس پہنچا جو بڑے زاہد، عابد اور متقی تھے، لیکن سنت سے واقف نہ تھے۔ واپسی پر تربیلہ کے ایک نمبر دار سے ملا صاحب کا ذکر سنا، وہاں پہنچتے ہی تسکین ہوگئی۔ میں نے سلسلہ بیعت دریافت کیا، فرمایا:

''میں بیعت شدہ سید احمد بریلوی مرشد مولوی اسماعیل صاحب شہید کا

ہوں۔ (۱)

ان کے نرینہ اولاد نہ تھی حقیقی بھانجے صاحبزادہ عبداللطیف کو خانہ داماد بنالیا تھا۔ وہ بھی اجل فاضل تھے۔ افسوس کہ جوانی کی حالت میں انہیں شہید کر ڈالا گیا۔ ان کے صاحبزادے (ملا صاحب کے نواسے) صاحبزادہ نواب سر عبدالقیوم صاحب تھے، جنہوں نے ہمارے ملک کی سیاست میں خاصی ناموری حاصل کی اور تعلیمی خدمات کے اعتبار سے بھی وہ "صوبہ سرحد کے سرسید" کہلاتے تھے۔

خواجہ محمد

حسن پوران کا وطن تھا اور سید صاحب کے خاص ارادت مندوں میں شمار ہوتے تھے ہر اہم موقع پر مشیروں یا رفیقوں میں ان کا نام ضرور آتا ہے۔ جنگ بالاکوٹ کے وقت سید صاحب نے جہاں اپنے لئے خاص لباس منتخب فرمایا، وہاں ایک ارخاق، سفید پاجامہ، دستار اور پشاوری لنگی خواجہ محمد کو بھی دی کہ صبح یہی پہننا۔ اسی طرح ایک ارخالق، سفید پاجامہ اور دستار حکیم قمرالدین پھلتی کو عنایت فرمائی۔ خواجہ محمد اور حکیم صاحب دونوں جنگ بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔

مولوی عبدالحق نیوتنوی

ان کے والد بزرگوار شیخ فضل اللہ کا اصل وطن نیوتنہ ضلع اناؤ تھا، لیکن انہوں نے بنارس میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس وجہ سے مولوی عبدالحق دونوں نسبتوں سے مشہور ہوئے۔ سید صاحب کے ساتھ ابتدائی دور ہی میں وابستہ ہو گئے تھے۔ سفر حج میں ساتھ تھے۔ مزاج میں تیزی بہت تھی جاتے جاتے کلکتہ میں بعض آدمیوں سے مذہبی جھگڑا ہوگیا۔ حجاز کی فضا اس زمانے میں اہل نجد کے لئے بڑی ناسازگار تھی۔ کوئی شخص غیر شرعی

---

(۱) سوانح حیات مولانا غلام رسول ص ۱۴۰، ۱۴۱۔

مراسم یا بدعات کے رد و ابطال میں ذرا سرگرمی دکھاتا تو سمجھ لیا جاتا کہ نجدی یا وہابی ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالحق بھی موردِ عتاب بنے اور ان پر مقدمہ قائم ہو گیا۔ مولانا عبدالحی نے ضمانت دیکر چھڑایا پھر خود ہی جواب دہی کی، اس طرح مولوی عبدالحق رہا ہوئے۔ پھر وہ مکہ معظمہ سے صنعا چلے گئے اور قاضی شوکانی سے حدیث کی سند لے کر ہندوستان آئے۔

حافظ عبداللطیف

یہ مولوی عبدالحق کے بھائی تھے۔ ان کے مزاج میں بھی خاصی تیزی تھی۔ قیامِ چار سدہ کے دوران میں ایک شخص پکڑا آیا تھا جس پر جاسوس ہونے شبہ تھا۔ حافظ عبداللطیف نے اسے قتل کر دینے کی تجویز پیش کی تھی، سید صاحب نے اسے چھوڑ دیا۔ سرحد میں ''اسقاط'' رائج تھا یعنی جب کوئی شخص فوت ہو جاتا تو اس کے وارث علماء کی مجلس بٹھاتے اور اس کے گناہوں کی بخشائش کے لئے قرآن دیتے۔ دستور یہ تھا کہ ایک عالم قرآن ہاتھ میں لے کر دوسرے کو دیتا، دوسرا تیسرے کو اسی طرح دور پورا کر کے قرآن پہلے عالم کے پاس آ جاتا۔ سمجھا جاتا کہ یوں متوفی کے گناہ ساقط ہو گئے۔ حافظ عبداللطیف بھی ایک مرتبہ ایسی مجلس میں جا بیٹھے۔ قرآن ان کے پاس آیا تو لے کر چل دیے، اگرچہ ان کا مقصود یہ تھا کہ رسم اسقاط کی غیر شرعی حیثیت واضح ہو جائے، لیکن طریقہ ایسا اختیار کیا جو خواہ مخواہ دوسروں کے لئے رنجش کا باعث ہوا۔

چھتر بائی کا واقعہ

فتح امب کے بعد مجاہدین نے چھتر بائی کا محاصرہ کر لیا تھا۔ شاہ اسماعیل محاصرہ لشکر کے سالار تھے۔ ایک روز حافظ عبداللطیف نے مختلف مورچوں کو پھر پھر کر تاکید کر دی کہ عصر کے بعد گڑھی پر حملہ ہوگا لہٰذا تیار رہو۔ شاہ صاحب اس سے بالکل بے خبر تھے۔ مجاہدین نے سمجھا کہ حافظ صاحب نے شاہ صاحب ہی کا پیغام پہنچایا ہوگا۔ چنانچہ حملہ ہوا۔

جس میں حافظ صاحب خود بھی شریک تھے اور ناکام رہا۔ چند مجاہدین نے شہادت پائی۔ شاہ صاحب نے حافظ عبداللطیف کو سید صاحب کے پاس بھیج دیا اور آپ نے بہت ڈانٹا۔ یہ واقعہ بھی بدنیتی نہیں، صرف سوءِ تدبیر کا نتیجہ تھا۔

مراجعت

جنگِ بالاکوٹ کے بعد حافظ صاحب واپس چلے گئے۔ سید جعفر علی نقوی نے لکھا ہے کہ میرٹھ کی ایک مسجد میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کسی نے کہہ دیا کہ یہ سید کے پاس سے بھاگ کر آئے ہیں۔ بس یہ سنتے ہی حافظ صاحب کو غصہ آ گیا۔ جھٹ منبر پر کھڑے ہو کر وعظ کہنے لگے اور فرمایا:

> ''جہاد محض ان لوگوں ہی پر فرض نہ تھا جو لشکر اسلام میں شامل ہوئے، تمام مسلمانوں پر فرض تھا۔ پس وہ لوگ طاغی ہیں جو مجھے گریزہ (بھگوڑا) کہتے ہیں۔ اگر وہ محمدیوں میں سے تھے تو ادائے فرض میں متقاعد کیوں رہے؟ اگر فرض ادا نہ کیا تو ان کی حیثیت یہود و نصاریٰ کی سی ہے اور ایسے لوگوں سے مجھے کوئی غرض نہیں۔''

یہ سن کر سب لوگ مدارات کے لئے بڑھے لیکن حافظ صاحب یہ کہتے ہی مسجد سے نکل گئے اور کسی کی مدارات قبول نہ کی۔ مزید حالات معلوم نہ ہو سکے۔

خضر خاں قندھاری

یہ یقیناً قندھار یا اس علاقے کے باشندے تھے۔ سید صاحب نے سکھوں سے بالاکوٹ کا قصد فرمایا تو ضیاء الدین پھلتی اور خضر خاں کو تھوڑے آدمیوں کے ساتھ درۂ بھوگڑمنگ کی حفاظت کے لئے بھیج دیا۔ مولوی نصیر الدین منگلوری پہلے سے وہاں موجود تھے۔ خضر خاں نے بڑے ادب سے عذر کیا کہ جنگ درپیش ہے، اس موقع پر حضرت کا

ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ اجازت دیجئے کہ میں ہمرکاب رہوں اور بھوگڑ منگ میں کسی دوسرے آدمی کو بھیج دیجئے۔ سید صاحب نے سمجھایا کہ جہاں بھی آپ کو رکھا جائیگا، آپ جہاد ہی کا فرض انجام دے رہے ہوں گے۔ آخر امتثال امر میں خضر خاں کو بھوگڑ منگ جانا پڑا۔

عبدالرحیم

یہ نومسلم منشی محمدی انصاری کا رفیق تھا۔ منشی صاحب نے اپنی بندوق اسے دے رکھی تھی، لیکن تاکید کردی تھی کہ اگر جنگ چھڑ جائے تو بندوق فوراً میرے پاس پہنچا دینا۔ فتح ہنڈ کے بعد محافظوں کی یورشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ منشی صاحب اور عبدالرحیم ہنڈ ہی میں تھے۔ ایک روز عبدالرحیم اونٹ چرانے کیلئے باہر چلا گیا اور بندوق بھی ساتھ لے گیا۔ اس اثناء میں غنیم کے ایک گروہ نے یورش کردی۔ منشی صاحب بندوق کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ عبدالرحیم جوشِ حمیت میں خود شریک جنگ ہو گیا۔ سوءِ اتفاق سے بندوق کا چقماق گم ہو گیا۔ دوڑا دوڑا قلعہ میں آیا۔ منشی صاحب بندوق اٹھا کر خود جانے لگے لیکن انہیں موزوں چقماق نہ مل سکا۔ مجبوراً مستعملہ چقماق کا ٹکڑا اٹھا کر لگالیا۔ انہیں خیال تھا کہ بندوق خالی ہے۔ عبدالرحیم نے بھی کچھ نہ بتایا۔ منشی صاحب نے لبلبی دبادی تاکہ چقماق کے کارآمد ہونے کا اندازہ کرلیا جائے۔ اس کے چار ٹکڑے ہوگئے۔ منشی صاحب نے ان میں سے بڑا ٹکڑا اٹھا کر دوبارہ لگایا اور کہا کہ اگر یہ آگ دے گیا تو فی الحال اسی سے کام لوں گا۔ عبدالرحیم جانتا تھا کہ بندوق بھری ہوئی ہے لیکن اس نے منشی صاحب کی توضیح کے بعد بھی کچھ نہ بتایا۔ تقدیری بات منشی صاحب نے لبلبی دبائی، بندوق چلی اور گولی عبدالرحیم کے شانے کے نیچے کی ہڈی کو توڑتی ہوئی نکل گئی۔ دوسرے دن اسی صدمے سے وہ نیک دل جاں بحق ہوا۔ ۲۷ رصفر ۱۲۴۵ھ (۲۶ راگست ۱۸۷۵ء)۔

منشی صاحب کو اس واقعہ کا بڑا قلق تھا۔ عبدالرحیم سکرات موت میں بھی منشی صاحب

کو تسلی دیتے ہوئے کہتا رہا: بھائی صاحب! رنج و غم نہ کریں، آپ نے مجھے نہیں مارا، آ
کو کیا معلوم تھا کہ بندوق بھری ہوئی ہے؟ میں بتا نہ سکا جو کچھ پیش آیا وہ تقدیری معاملہ تھا۔

حافظ الٰہی بخش

یہ تیرہ چودہ برس کا لڑکا تھا جو اپنے ماموں نور خاں کے ساتھ علاقہ سدم کے کسی گاؤں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ جب اہل سمہ نے بے خبری میں منتشر مجاہدین پر قاتلانہ حملے کیے، تو جس گاؤں میں نور خاں اور الٰہی بخش ٹھہرے ہوئے تھے وہاں کے لوگوں نے ان پر بھی حملہ کر دیا۔ نور خاں شور و غل سن کر حالات دریافت کرنے کیلئے باہر نکلا۔ بھانجے سے تلوار مانگی۔ تلوار پہنچنے سے پیشتر نور خاں خاک و خون میں لوٹنے لگا۔ ایک بدبخت نے نوعمر حافظ کے سر پر تلوار ماری۔ دوسرے نے روک دیا کہ اسے نہ مارو ہم اسے غلام بنائیں گے۔ یوں حافظ الٰہی بخش کی جان بچ گئی۔ بچانے والا اسے اپنے گھر لے گیا اور بچوں کو قرآن پڑھانے پر لگا دیا۔ حافظ الٰہی بخش پشتو جانتا تھا، لیکن یہ راز کسی پر ظاہر ہونے نہ دیا۔ اس اثناء میں سید صاحب کے پاس پہنچنے کی تدبیریں سوچتا رہا۔

اس کے پاس ایک بالغ شخص بھی قرآن پڑھنے کو آتا تھا۔ اس کے اخلاص کا اندازہ کر کے ہمراز بنایا۔ سید صاحب کے پاس پہنچانے کیلئے پانچ روپے اجرت طے ہوئی۔ موقع پا کر اس کی رہنمائی میں چھپ چھپا کر نکلا، راج دواری میں سید صاحب کے پاس پہنچ گیا اور اپنی اسیری کی کہانی سنائی۔

سر کا زخم بدستور تھا۔ نور بخش جراح نے زخم دیکھا تو کہا کہ پہلے معالج نے بدخواہی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ سر کی ہڈی کا ایک حصہ خراب ہو چکا ہے اور اسے کاٹے بغیر زخم اچھا نہیں ہو سکتا۔ حافظ الٰہی بخش نے صبر و سکون سے ہڈی کٹوا کر پٹی بندھوائی۔ مجاہدین نے چاہا کہ اسے اٹھا کر بستر پر پہنچا دیں، اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ میرے پاؤں زخمی

نہیں ہوئے جو اٹھانے کی ضرورت ہو۔ تھوڑی دیر بستر پر لیٹا رہا۔ پھر خود اٹھ کر ایک ڈیرے پر گیا۔ تمام مجاہدین سے ملا، سب اس کی جرأت اور تحمل شدائد پر حیران تھے۔

سید عبداللہ سیرام پوری

سید عبداللہ کے والد ماجد کا نام سید بہادر علی شاہ تھا۔ معلوم نہیں انہوں نے کس زمانے میں سید صاحب سے ارادت کا رشتہ قائم کیا۔ اتنا معلوم ہے کہ آپ نے انہیں خلافت دے دی تھی۔ سید عبداللہ نے سیرام پور میں ایک مطبع قائم کرلیا تھا، جس میں بہت سی دینی کتابیں چھپیں۔ سید صاحب کے خواہر زادے سید احمد علی سفر حج میں ساتھ نہ آئے تھے بلکہ بعد میں لکھنؤ سے کلکتہ پہنچے تھے، آتے وقت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے ترجمہ قرآن کا ایک قلمی نسخہ بھی ستر روپے میں خرید لائے تھے۔ سید صاحب نے یہ نسخہ طباعت کی غرض سے سید عبداللہ کے حوالے کر دیا تھا۔

شیخ عبداللطیف تاجر

یہ میرزا پور میں رہتے تھے اور وقت کے بہت بڑے تاجر مانے جاتے تھے۔ سید صاحب سفر حج کے لئے نکلے تو شیخ عبداللطیف نے چار ہزار روپے آپ کی خدمت میں پیش کیے اور خود بھی والدہ کو ساتھ لے کر حج کے لئے تیار ہو گئے۔ سید صاحب کلکتہ میں ٹھہرے رہے۔ شیخ عبداللطیف کسی جہاز میں سوار ہو کر آپ سے پہلے مکہ معظمہ پہنچ گئے اور سید صاحب کے ورود پر پہلے دن قافلے کی دعوت کی۔ مدینہ منورہ کے سفر میں غالباً سید صاحب کے ساتھ تھے۔ وہاں سردی زیادہ محسوس ہونے لگی تو شیخ عبداللطیف نے کمبل خرید کر سید صاحب کے تمام ہمراہیوں کے لئے گرم کپڑے سلوا دیے تھے۔ سفر مراجعت میں سید صاحب کا قافلہ میرزا پور پہنچا تو شیخ عبداللطیف پہلے واپس آ چکے تھے۔ انہوں نے قافلے کی دعوت کی۔

منشی امین الدین احمد

یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے وکیل تھے۔ مرکزی عدالت میں تمام مقدمے ان کی وساطت سے پیش ہوتے تھے اور حق وکالت کی اتنی رقم بن جاتی تھی کہ ہر مہینے اختتام پر تیس چالیس ہزار کی تھیلیاں ہاتھی پر لاد کر ان کے گھر پہنچتی تھیں۔

سید صاحب کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ جب معلوم ہوا کہ آپ بڑے قافلے کے ساتھ حج کیلئے آرہے ہیں تو منشی صاحب نے ایک وسیع کوٹھی خرید لی جس کے ساتھ باغ تھا اور اس میں تین تالاب تھے۔ مردانہ کمرے الگ تھے اور زنانہ الگ۔ ہگلی پہنچ کر سب سے پہلے سید صاحب کو مع قافلہ اپنا مہمان بنالیا۔ آپ کے کلکتہ پہنچنے کے دن پینس، ڈولیاں، بگھیاں، کرانچیاں، ہوادار وغیرہ سواری کیلئے اور چھکڑے بار برداری کیلئے لے کر کنار دریا پر پہنچے ہوئے تھے۔ پھر دونوں وقت پورے قافلے کے لئے نہایت پرتکلف کھانا پہنچاتے رہے۔ مثلاً ماہی پلاؤ، بکرے کا پلاؤ، قورما، شیر مال، باقر خانیاں، کئی قسم کے مربے اور کئی قسم کے میٹھے۔

پہلے ہی دن قافلے میں سے ضرورت مندوں کے لئے تین سو روپے کے جوتے اور ایک ہزار کے کپڑے خرید دیے۔ قیام کلکتہ کے دوران میں قافلے کا خرچ منشی صاحب ہی نے برداشت کیا۔ رخصت کے وقت پانچ ہزار روپے، خوبصورت گھڑیاں، رفیقوں کے لئے جوتے اور کپڑے پیش کیے۔ پانچ ہزار یہ کہہ کر دیے کہ ممکن ہے بعض اوقات کسی کو کھانا مزاج کے مطابق نہ ملا ہو اور اس نے پیسے خرچ کر کے بازار سے کھایا ہو۔ غرض سرسری اندازے کے مطابق منشی صاحب کا خرچ چالیس پچاس ہزار سے کم نہ ہوا ہوگا۔ منشی صاحب خود بھی مرید ہوئے اور سید صاحب نے اپنی سرمئی دستار انکے سر پر رکھ دی۔

شیخ علی جان

یہ داناپور میں رہتے تھے۔ اصل وطن ویکھا تھا۔ اس زمانے میں سفر کا سب سے اچھا اور عمدہ ذریعہ کشتیاں تھیں اور ہزاروں لوگ کشتی بانی میں مصروف تھے۔ شیخ علی جان ان کشتی بانوں کے چودھری تھے۔ سید صاحب حج کیلئے گئے تھے تو اس زمانے میں بھی شیخ علی جان کے مہمان ہوئے تھے۔ مراجعت میں بھی ان کے مکان پر ٹھہرے۔ یہیں ایک شخص بہ ارادہ قتل آیا تھا لیکن سید صاحب کا چہرۂ مبارک دیکھتے ہی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ پاؤں پر گر کر معافی مانگ لی۔

سید صاحب کے ساتھ ملاقات سے پیشتر شیخ صاحب کی وضع قطع اس درجہ ہندوانہ تھی کہ نام بتائے بغیر کوئی جان ہی نہ سکتا تھا کہ آپ مسلمان ہیں۔ سید صاحب سرحد چلے گئے تو آپ کے خادمِ خاص میاں دین محمد ایک مرتبہ داناپور بھی پہنچ گئے۔ شیخ علی جان نے محبت سے اپنے پاس ٹھہرایا۔ اپنی طرف سے چھ اشرفیاں اور عیال کی طرف سے چھ سو روپے پیش کیے۔

میاں صاحب فرماتے ہیں کہ شیخ صاحب کی حالت بالکل بدل چکی تھی۔ وہ سچے خدا پرست مسلمان بن چکے تھے۔ مسافروں کی امداد و اعانت کا انہیں بہت خیال تھا۔ ضرورت مندوں کو ان کی ضرورت کے مطابق پانسو روپے تک امداد دینے کے لیے مستعد رہتے تھے۔ ایک باغ انہوں نے صرف اس غرض سے وقف کر دیا تھا کہ آتے جاتے مسافر اس میں آرام سے ٹھہریں۔ قیام کے علاوہ ان کے طعام کا بھی بخوبی بندوبست ہوتا تھا۔ دورانِ جہاد میں اطراف بہار کے ارادت مندوں کی اعانتی رقوم شیخ جان علی کے پاس جمع ہوتی تھیں۔

صدرالدین قصاب

یہ بھی داناپور ہی کے تھے۔ سید صاحب سے انتہائی اخلاص رکھتے تھے۔ عام

مسلمانوں خصوصاً مسافروں کی خدمت میں ہر لحظہ سرگرم رہتے تھے۔ سو پچاس آدمی روزانہ ان کے ہاں کھانا کھاتے۔ اولاد نہ تھی۔ عبدالرحیم نام ایک یتیم بچے کو بیٹا بنا لیا تھا۔ ایک وسیع باغ لگوادیا جس میں آم، نیمبو، نارنگی اور جامن کے درخت تھے اور اسے صرف مسافروں کی مہمان داری کے لئے وقف کر دیا۔ عبدالرحیم کو تاکید کر دی تھی کہ خود دونوں وقت مسافروں کے ساتھ کھانا کھائے۔

بابا بہرام خاں تنولی

یہ علاقہ تنول کے روٴسا میں سے تھے۔ نوجوانی ہی میں سید صاحب سے وابستہ ہوگئے تھے۔ حملۂ اٹک اور جنگ ہنڈ میں بھی شریک تھے۔ بالاکوٹ میں بھی ان کی شرکت مسلم ہے اور سید صاحب کی شہادت کے متعلق ایک روایت ان کی بھی "سید احمد شہیدؒ" میں درج ہو چکی ہے۔ واقعہ بالاکوٹ کے بعد یہ غالباً کسی تحریک میں شریک نہ ہوئے۔ لمبی عمر پا کر ۱۹۲۱ء میں فوت ہوئے۔ میرے عزیز دوست اور بھائی سید مبارک شاہ مرحوم گندنی بابا صاحب کے نواسے تھے۔ سید عبدالجبار شاہ صاحب ستھانوی نے ان کی بہت سی روایات محفوظ کر لی تھیں جو ان کی کتاب "عبرۃ لاولی الابصار" میں درج ہیں۔

محمود خاں لکھنوی

بالاکوٹ کے شہداء میں سے بعض اکابر کے حالات الگ لکھے جا چکے ہیں۔ اکثر کے متعلق اس کے سوا کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ انہوں نے شہادت پائی۔ جن اصحاب کے متعلق مختصر سی معلومات مل سکیں ان کا حال ذیل میں درج ہے:

جب سکھ شکست کھا کر پہاڑ پر چڑھے اور مجاہدین نے ان کا تعاقب کیا تو تلوار دانتوں میں دبا کر اور ایک سکھ کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر نیچے کھینچنے لگے۔ سکھ کا ایک ساتھی اوپر کھینچ رہا تھا۔ آخر محمود خاں نے ایسا زور مارا کہ سکھ کو نیچے کھینچ لائے۔ دونوں لوٹتے پوٹتے

نالے میں گرے اور ختم ہو گئے۔

مہربان خاں

یہ بانگر منو کے تھے۔ میاں نجم الدین نے دیکھا کہ زخموں سے نڈھال ہو کر چت پڑے ہیں۔ آنکھیں کھولیں تو پانی مانگا۔ میاں صاحب نے کہا کہ یہاں پانی کہاں سے لاؤں۔ بولے اگر پانی نہیں لا سکتے تو میری گردن میں روپوں کی حمائل ہے اسے کھول کر لے جاؤ۔ میاں صاحب عجلت میں یہ کام بھی انجام نہ دے سکتے تھے۔ مہربان خاں نے آخر یہ کہا کہ آپ جلد نکل جائیں، یہ میدان ہی میں جاں بحق ہوئے۔ پیر خاں مورائیں کی جماعت میں شامل تھے۔ شہادت کے وقت چالیس سال کی عمر ہوگی۔

حسن خاں بنارسی

یہ زخموں سے چور ہو گئے تو میدانِ جنگ سے آہستہ آہستہ بالاکوٹ پہنچ گئے، وہاں پہنچتے ہی خون بہنے سے غنودگی طاری ہو گئی۔ ایک سکھ نے ان کا تفنگچہ اتارنا چاہا تو یہ ہوشیار ہو گئے، لیٹے لیٹے تلوار اٹھا کر سکھ کو قتل کر دیا، دوسرے سکھ نے انہیں شہید کر ڈالا۔

باقی اصحاب

باقی شہداء کی کیفیت یہ ہے:

۱۔ عبدالقادر غازی پوری کے سر میں گولی لگی۔

۲۔ غازی الدین جن کا وطن معلوم نہ ہو سکا۔

۳۔ اللہ بخش باغپتی نے گھمسان کے رن میں گھس کر شہادت پائی۔

۴۔ مولوی محمد قاسم پانی پتی کے چھوٹے بھائی محمد حسن۔

شادل خاں گنج پوری

یہ سید صاحب کے قدیم رفیقوں میں سے تھے۔ ان اصحاب میں شامل تھے جو دہلی سے دوآبے کا دورہ شروع ہونے کے وقت سید صاحب کے ہمرکاب تھے۔ جنگ شیدو میں سید صاحب زہر کے باعث سخت بیمار ہو گئے تو شاہ اسماعیل نے انہیں ہاتھی پر سوار کرایا۔ خود سید صاحب نے فرمایا کہ جو سفید گھوڑا ہمیں فتح خاں نے دیا ہے، اس پر شادل خاں گنج پوری سوار ہو، اور فتح خاں کے سواروں میں شامل رہے۔

سید صاحب نے اپنے بھانجے سید حمید الدین کو ہندوستان بھیجا تو وہ شادل خاں کو بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ غالباً یہ دوبارہ میدانِ جہاد میں نہ پہنچ سکے اور سید حمید الدین ہی کے ساتھ ٹونک میں رہے۔

فقیر محمد خاں آفریدی

شعر وادب میں یہ نام کے بجائے تخلص یعنی گویا کی بنا پر زیادہ مشہور ہیں۔ یہ ابتداء میں نواب امیر خاں کے رفیق تھے۔ وہیں سید صاحب سے گہرا تعلق پیدا ہوا۔ پھر یہ لکھنؤ میں ملازم ہو گئے اور بڑا عروج حاصل کیا۔ حسام الدولہ خطاب پایا۔ سلطنت اودھ کے ممتاز سالارانِ فوج میں سے تھے۔ سید صاحب سے ان کی عقیدت مدت العمر قائم رہی۔ معتمد الدولہ آغا میر نے انہیں کی وساطت سے نصیر آباد کے معاملے میں سید صاحب کے طرزِ عمل کی حمایت کی تھی اور لکھنؤ بلایا تھا۔ رخصت کے وقت پانچ ہزار روپے بطور نذر پیش کیے تھے جو سید صاحب نے فقیر محمد خاں ہی کے پاس چھوڑ دیے۔ آپ حج کے لیے روانہ ہوئے تو سید احمد علی یہ رقم لے کر کلکتہ پہنچے۔ ان کی اولاد ملیح آباد میں رہتی ہے۔ شبیر حسن خاں جوشؔ ان کے پوتے ہیں۔

استاد یوسف آہن گر

ان کے حالات کہیں سے معلوم نہ ہو سکے۔ روایتوں میں ایک سے زیادہ مرتبہ ان کا ذکر آیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ انہیں اسلحہ سازی میں خاصی مہارت حاصل تھی۔ اغلب ہے ان سے بندوقوں اور تلواروں کی اصلاح و درستی کا کام لیا جاتا ہو، یا یہ گنڈاسے بناتے ہوں، جو سید صاحب کے لشکریوں کا ایک خاص ہتھیار تھا۔ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ یہ واپس ہو گئے یا سرحد ہی میں فوت ہوئے۔

بتیسواں باب:

مختلف اصحاب (۴)

مولانا حیدر علی رام پوری

یہ مولانا سید محمد علی رام پوری کے بھائی تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت معلوم نہ ہو سکی۔ ابتدائے عمر ہی میں رام پور چلے گئے۔ خود عربیت میں مولانا سید غلام جیلانی رام پوری، مولانا عبدالرحمٰن کوہستانی اور شیخ رستم علی رام پوری کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ میں ملا مبین سے تعلیم حاصل کی، پھر دہلی میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالعزیز سے استفادہ کیا۔ نیز حکیم شریف خاں صاحب سے طب پڑھی۔ ''تذکرہ علمائے ہند'' میں مرقوم ہے کہ علم طب میں انہیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ سید ابوالحسن علی فرماتے ہیں کہ ذکاوت، سرعت ادراک، جامعیت معقول و منقول، کتاب و سنت اور اختلاف ائمہ سے واقف، تبحر علمی میں سرآمد روزگار اور علوم حکمیہ میں بحرِ ذخار تھے۔ (۱)

مولانا سید غلام جیلانی کی صاحبزادی سے شادی کی۔ کلکتہ بھی گئے۔ نواب احمد علی خاں فرمانروائے رام پور کے زمانے میں ٹونک پہنچ گئے۔ نواب موصوف نے انہیں کے ہاتھ پر نیابتاً بیعت جہاد کی تھی۔ اس سلسلے میں نواب کا مکتوب ان کے حالات میں درج ہو چکا ہے۔ نواب وزیر الدولہ نے ربیع الاول ۱۲۶۰ھ (مارچ ۱۸۴۴ء) میں انہیں عہدہ دیوانی پر مامور فرما دیا۔ (۲) اس عہدے کے فرائض انجام دینے کے علاوہ درس بھی دیتے تھے اور طبابت بھی کرتے تھے۔ ۱۹؍ ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ (۱۸؍ اگست ۱۸۵۶ء) کو ٹونک میں

---

(۱) ''سیرت سید احمد شہید'' طبع دوم ص: ۳۹۳۔

(۲) ''حدیقۂ راجستان ٹونک'' ص: ۳۳۔

وفات پائی۔(۱) سید صاحب کے خلفائے خاص میں سے تھے۔ ''تذکرہ علمائے ہند'' میں ان کی دو کتابوں کا ذکر ہے:

۱۔ ''صیانت الناس عن وسوسۃ الخناس'' بہ زبان اردو۔

۲۔ ''رسالہ رفع الیدین'' بہ زبان فارسی۔(۲)

مولانا غلام جیلانی رام پوری

یہ وقت کے اکابر علماء میں سے تھے۔ ابتدا ہی میں سید صاحب سے گہرا تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ حسنِ عقیدت کا یہ عالم تھا کہ سید صاحب رام پور سے روانہ ہونے لگے تو مولوی غلام جیلانی باوجود علم و فضل اور باوصف کبرسنی رکاب میں پیادہ پا دوڑا کیے۔ سید صاحب نے منع فرمایا تو آپ تعمیلِ حکم میں ٹھہر گئے اور روتے ہوئے بولے:

> ''اے کاش! جوانی کی قوت ہوتی تو رکابِ عالی میں برابر دوڑتا رہتا۔''

سید صاحب کے مجموعۂ مکاتیب میں ان کے نام ایک خط بھی ہے، جو ۷/ذی الحجہ ۱۲۴۲ھ کو تختہ بند علاقہ بنیر سے بھیجا گیا تھا۔ مولوی صاحب نے لکھا تھا کہ بہت سے مخلص لوگ جہاد کے لئے تیار ہیں، لیکن ان کے پاس سامانِ سفر موجود نہیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ یہ امر باعث حیرت ہے۔ توکل اور ایمان بالقدر کو مدارِ کار بنائیں۔ تمام مومنوں میں نفیرِ عام کی صدا بلند کریں اور وہ خدا پر بھروسا کرتے ہوئے چلے آئیں۔

مولوی کرامت علی جون پوری

مولوی صاحب موصوف جون پور کے محلہ ٹولہ میں ۱۸/محرم الحرام ۱۲۱۵ھ (۱۱/جون ۱۸۰۰ء) کو پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب پینتیس واسطوں سے حضرت صدیق اکبر تک پہنچتا ہے۔ علومِ دینیہ مولانا قدرت اللہ ردولوی سے، فن حدیث مولانا احمد اللہ انامی سے اور

---

(۱) ''حدیقۂ راجستان ٹونک'' ص:۴۳۔　(۲) ''تذکرہ علمائے ہند'' ص:۵۵۔

معقول مولانا احمد اللہ چریاکوٹی سے حاصل کیے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں سید صاحب سے بیعت کی اور آپ نے مولوی صاحب کو دعوت و تبلیغ پر مقرر فرما دیا۔

پہلے جون پور میں تبلیغ دین اور ردِ بدعات کا کام انجام دیتے رہے۔ پھر بنگال چلے گئے اور زندگی کے باقی ایام وہیں دعوت و تبلیغ میں بسر کیے۔ کم و بیش اکاون سال خدمت دین کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ جا بجا درس گاہیں قائم کیں۔ عموماً کشتی پر سفر کرتے تھے۔ اس میں بھی درس و تدریس برابر جاری رہتی۔ ۳/ربیع الآخر ۱۲۹۰ھ (۳۱/مئی ۱۸۷۳ء) کو رنگ پور میں وفات پائی۔ وہیں دفن ہوئے۔ ان کے دو فرزند تھے: مولانا حافظ احمد اور مولانا حافظ عبدالاول۔ دونوں علم و فضل میں ممتاز زمانے جاتے تھے۔ ان کا بھتیجا مولوی محمد محسن بھی وقت کا بہت بڑا عالم تھا۔ مولوی کرامت علی صاحب نے بے شمار کتابیں لکھیں۔ چوالیس کتابوں کی فہرست ''تذکرہ علمائے ہند'' میں درج ہے۔

مولانا عبدالقیوم بڑھانوی

یہ مولانا عبدالحئی کے اکلوتے فرزند تھے۔ عہد طفلی میں سید صاحب کیساتھ سرحد گئے۔ مولانا عبدالحئی نے خہر میں وفات پائی تو مولانا عبدالقیوم کو ان کے ماموں کے ساتھ ہندوستان بھیج دیا تاکہ والدہ ماجدہ کیلئے تسلی کا سامان بن سکیں۔ مولانا عبدالحئی نے اسی زمانے میں بیعت کرا دی تھی جب سید صاحب دو آبے کا دورہ کرتے ہوئے بڑھانہ پہنچے تھے۔

سرحد سے ہندوستان آ کر شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب سے علم حاصل کیا۔ اس کے بعد غالباً مکہ معظمہ چلے گئے۔ شاہ محمد اسحاق کی صاحبزادی سے ان کی شادی ہوئی۔

نواب سکندر جہاں بیگم والیہ بھوپال حج کیلئے مکہ معظمہ گئیں تو مولانا کے زہد و تقویٰ اور علم و فضل کو دیکھ کر بھوپال تشریف لانے کی زحمت دی۔ آپ آئے اور خاصی مدت تک وہاں مقیم رہے۔ ایک مرتبہ بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ اپنی اہلیہ کو محل میں بھیجیں۔ آپ نے

انکار کر دیا۔ موصوفہ نے پیغام بھیجا کہ خود ان سے ملاقات کیلئے آنا چاہتی ہوں تو کہا: آپ پردہ نہیں کرتیں، اسلئے اجازت نہیں دے سکتا۔ برقعہ اوڑھ کر آئیں تو ملاقات کر سکتی ہیں۔

جس حد تک مجھے علم ہے، خرابی صحت کی بنا پر بڑھانہ آ گئے تھے اور یہیں ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں فوت ہوئے غالباً اڑسٹھ سال کی عمر پائی۔

مولوی خرم علی بلہوری

بلہور کان پور کے مضافات میں سے ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے لکھنؤ میں سید صاحب سے بیعت کی تھی۔ اس کے بعد خدمت دین میں مشغول ہو گئے۔ مشہور ہے کہ سید صاحب کے ساتھ جہاد کیلئے سرحد گئے تھے۔ وہاں سے واپس آ گئے۔ غالباً سید صاحب نے انہیں دعوت و تبلیغ کیلئے مقرر کر دیا۔ رد بدعت اور احیاء سنت میں بہت سرگرم تھے۔ ۱۲۵۰ھ میں نواب ذوالفقار بہادر رئیس باندہ کے حکم سے ''در المختار'' شرح ''تنویر الابصار'' کا ترجمہ شروع کیا۔ محرم ۱۲۷۱ھ میں کتاب الحج تک ترجمہ مکمل کر چکے تھے، اسی سال وفات پائی۔ مولوی محمد احسن نانوتوی نے مولوی خرم علی صاحب کے وارثوں سے اس کتاب کا حق تالیف خرید لیا اور ''غایت الاوطار'' کے نام سے اسے شائع کر دیا۔ یہ ترجمہ ناتمام رہا۔

''مشارق الانوار'' کا بھی ترجمہ کیا۔ ''نصیحت المسلمین'' ان کی مشہور کتاب ہے۔ ''جہادیہ'' منظوم ہے، جس میں جہاد کے فضائل بیان کیے ہیں۔ سید صاحب کے لشکر میں ''جہادیہ'' جنگ کے وقت پڑھی جاتی تھی۔

مولوی سخاوت علی جون پوری

جون پور سے گیارہ میل جنوب میں منڈیاہو نام ایک قصبہ ہے، جہاں مولوی صاحب موصوف ۱۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے۔ وقت کے مشاہیر علماء سے علم حاصل کیا۔ سید

صاحب سے بیعت کی۔ ساری عمر حسبۃً للہ درس وتدریس میں گزار دی۔ جون پور کی مسجد شاہی میں ایک مدرسہ قرآنیہ بھی قائم کیا تھا، جس نے بہ کثرت حفاظ پیدا کیے۔

نواب ذوالفقار بہادر والیٔ باندہ نے اپنے ہاں دو سو روپے ماہانہ پر بلا لیا تھا۔ کچھ مدت بعد والدہ کی پیری کا خیال کرتے ہوئے وطن واپس آ گئے۔ آخر عمر میں ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔ وہیں ۱۲ رشوال ۱۲۷۴ھ (۲۰ رمئی ۱۸۵۸ء) کو انتقال کیا اور جنت المعلیٰ میں دفن ہوئے۔ ان کے دو فرزند پہلی شادی سے تھے اور دو دوسری شادی سے۔ مولانا ابو بکر محمد شیث مرحوم ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی، مولوی سخاوت علی کے پوتے اور مولوی ابو الخیر مکی کے صاحبزادے تھے۔ مولوی فتح علی جون پوری جو جہاد میں سید صاحب کے ساتھ تھے، مولوی سخاوت علی کے اقربا میں سے تھے۔

مولوی حبیب اللہ قندھاری

افغانستان کے علماء میں یہ پہلے شخص ہیں جن میں حدیث کا صحیح ذوق پیدا ہوا، اور ان سے یہ ذوق افغانستان میں پھیلا۔ موصوف نے اس زمانے میں سید صاحب سے استفادہ کیا تھا، جب آپ بہ سلسلہ ہجرت قندھار پہنچے تھے۔ مولانا سید عبداللہ غزنوی نے بھی مولوی حبیب اللہ قندھاری ہی سے مختلف مسائل حل کیے اور غالباً انہیں کے ذریعے سے ”تقویۃ الایمان“ کا فارسی ترجمہ مولانا عبداللہ کی نظر سے گذرا۔

مولانا عبداللہ علوی

یہ مئو قائم گنج ضلع فرخ آباد کے باشندے تھے۔ مدت تک دہلی میں رہے۔ شاہ اسماعیل شہید سے علم حاصل کیا اور سید صاحب کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کر لی تھی۔ نظم ونثر میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ مولوی امام بخش صہبائی انہیں کے شاگرد ہیں۔ طبابت میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ آخر عمر میں نواب سید محمد علی خاں بہادر شمس آبادی کے ہاں ملازم ہو گئے

تھے۔ وہیں ۱۲۶۲ھ بہ عارضہ تپ محرقہ وفات پائی۔(۱) اصلاً فارسی کے شاعر تھے، کبھی کبھی اردو میں بھی کہہ لیتے تھے۔

حکیم مومن خاں مومنؔ

حکیم غلام نبی خاں کے فرزند تھے۔ ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۱ء) میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالقادر سے عربی کی کتابیں پڑھیں۔ والد اور چچا سے طب کی تعلیم پائی۔ نجوم میں کمال حاصل کیا، لیکن شہرت کی بنیاد ان کی شاعری ہے۔ فارسی کلام بھی بہت پختہ تھا۔ افسوس کہ فارسی دیوان صرف ایک مرتبہ چھپا، اب ناپید ہے۔ اردو کلیات میں غزلیں، قصیدے، مثنویاں، رباعیاں اور قطعات سب کچھ موجود ہے۔

سید صاحب سے بیعت کی۔ آپ کی مدح میں مومن نے جو کچھ کہا، وہ اس کتاب میں دوسری جگہ درج ہوتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مومن کا دل سید صاحب کے عشق سے لبریز تھا۔ ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) میں وفات پائی۔ مہدی پورہ میں شاہ ولی اللہ کے خاندانی مقبرے کے پاس دفن ہوئے۔

میاں دین محمد

یہ سید صاحب کے خادمِ خاص تھے۔ جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں یہ اصلاً غیر مسلم تھے۔ سید صاحب نے انھیں اپنی تربیت میں لے لیا اور اس زمانے میں مسلمان کیا جب آپ نواب امیر خاں کے ساتھ تھے۔ اس وقت سے میاں دین محمد سید صاحب کے ساتھ رہے۔ سید صاحب کے ساتھ جہاد پر گئے اور وہاں سے کئی مرتبہ انھیں ہندوستان بھیجا گیا۔ سید صاحب کے تمام نیاز مند اُن کی بہت عزت کرتے تھے۔ بڑی بڑی رقمیں

---

(۱) ''تذکرہ شمع انجمن'' ص: ۳۱۸۔ نساخ نے تاریخ وفات ۱۲۶۳ھ لکھی ہے (''سخن شعراء'' ص: ۳۴۳) لیکن نواب صدیق حسن خاں کی روایت زیادہ مستند ہے۔

انہیں کے ذریعے سے سید صاحب کی خدمت میں پہنچیں۔ آخری عمر میں ٹونک گئے غالباً وہیں وفات پائی۔ نواب وزیر الدولہ نے ان کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔

میاں جی نظام الدین چشتی

یہ بڑھانہ کے باشندے اور سید صاحب کے خاص رفیق تھے۔ زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔ جنگ بالاکوٹ سے ایک دن پہلے سید صاحب نے کنہار کا پل تڑوا دیا تھا۔ اس موقع پر میاں جی نظام الدین بھی موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ جب لڑائی کی نوبت آئی اور میں نے جناب الٰہی میں دعاء کی تو اک گونہ تسکین پیدا ہو گئی، میں سمجھ لیتا کہ انجام بخیر ہوگا۔ موجودہ جنگ کے سلسلے میں کئی مرتبہ مراقبہ بھی کیا اور دعاء بھی، لیکن تسکین کی کوئی صورت نہ نکلی۔ خدا جانے کیا پیش آنے والا ہے۔

یہ امر یقینی ہے کہ میاں جی نظام الدین چشتی بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔ جو لوگ سید صاحب کے غائب ہو جانے کا عقیدہ رکھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ میاں جی نظام الدین چشتی بھی ساتھ ہی غائب ہوئے اور ساتھ ہی ظاہر ہوں گے۔

شیخ محمد تقی

یہ انگریزی فوج میں گوشت کے ٹھیکیدار تھے اور اس زمانے میں سید صاحب سے بیعت کی جب آپ نے نواب امیر خاں سے الگ ہو کر جہاد کی مستقل تنظیم کی تھی اور تبلیغی واصلاحی دوروں کا آغاز ہوا تھا۔ بعد میں انہوں نے کمسریٹ کے ٹھیکے بھی لئے اور بہت دولت پیدا کی۔ ۲۱؍ دسمبر ۱۸۵۵ء کو شیخ صاحب نے اپنی غیر منقولہ جائداد کا ایک حصہ جس کی قیمت کا اندازہ اس زمانے میں سوا لاکھ سے کم نہ تھا، دینی اور خیری امور کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اسی جائداد کا ایک حصہ انارکلی لاہور کی وہ عمارت بھی تھی جو سرائے محمد شفیع کے نام سے مشہور رہی اور اب عالی شان ہوٹل کی صورت میں منتقل ہو چکی ہے۔ محمد شفیع شیخ محمد

تقی کا بڑا بیٹا تھا۔ وہ ۱۸۶۴ء کے مقدمہ اعانت مجاہدین میں ماخوذ ہوا تھا، اس کے حالات کتاب کی آئندہ جلد میں بیان ہوں گے۔ شیخ محمد تقی نے ۱۸؍ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو وفات پائی۔ آپ سید صاحب کے بڑے ہی مخلص ارادت مند تھے۔

متفرق اصحاب

بعض اصحاب کے حالات معلوم نہ ہو سکے، سرسری کیفیت ذیل میں درج ہے:

۱۔ **اخوند ظہور اللہ:** جہانگیرہ صوبہ سرحد کے باشندے تھے۔ ابتدا سے سید صاحب کے ساتھ رہے۔ تنخواہ دار فوج انھیں نے بھرتی کی تھی۔

۲۔ **عبدالقیوم اور امانت علی:** مجروحینِ اکوڑہ کی تیمارداری کے لیے نوشہرہ میں ٹھہرے رہے۔

۳۔ **حیات خاں اور برکت اللہ:** یہ دونوں واقعۂ حضرو کے بعد جنگِ بازار میں شہید ہوئے۔

۴۔ **شیخ فیض الدین، محمد صالح اور رمتا:** شیخ فیض الدین بنگال کے اور باقی دو سندھ کے تھے۔ یہ جنگِ بازار میں مجروح ہوئے۔

۵۔ **حاجی عبداللہ رام پوری:** یہ جہاد میں ساتھ رہے۔ واقعہ بالاکوٹ کے بعد ٹونک میں چلے آئے تھے۔ نواب وزیر الدولہ نے انھیں غالباً رسالدار بنا دیا تھا۔ انھوں نے ٹونک میں وفات پائی۔

خاتمہ

یہ سید صاحب کے ان رفیقوں کی سرسری سرگزشت تھی، جو ان کی زندگی میں شہید یا فوت ہوئے یا ان کے ساتھ شہادت پائی، یا جنھوں نے سید صاحب کے بعد تحریک کے

کسی شعبے میں حصہ نہ لیا، یا بدرجہ آخر سمجھ لیجیے کہ روایات و بیانات کا جو ذخیرہ ہمارے سامنے آیا، اس میں سید صاحب کی شہادت کے بعد ان کا کوئی ذکر موجود نہیں۔

ہم نے صرف ان مجاہدین کا ذکر کیا، جن کے متعلق کم یا زیادہ حالات معلوم ہو سکے۔ ممکن ہے بعض اہم اصحاب نظر انداز ہو گئے ہوں۔ مقصود استقصاء نہ تھا، بلکہ صرف یہ آرزو تھی کہ سید صاحب کی تربیت کے کچھ نمونے سامنے آ جائیں تا کہ اندازہ ہو سکے کہ اس پاک نفس وجود نے کیسی جماعت تیار کر دی تھی، جس کی مثال ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں بہت ہی کم ملے گی۔

اب صرف ایک مرحلہ باقی رہ گیا اور وہ یہ کہ اس جماعت نے سید صاحب کی شہادت کے بعد ہندوستان کے اندر اور باہر اسلام و اسلامیت کے احیاء کی خاطر کیسی کیسی قربانیاں پیش کیں، تو یہ سرگزشت آپ اس کتاب کی آئندہ جلد میں ملاحظہ فرمائیں گے جو ۱۸۳۱ء سے ۱۹۳۴ء تک کے حالات پر مشتمل ہے۔

ضمیمہ (۱)

جہادیہ (فارسی)

اردو کا جہادیہ "سید احمد شہید" میں مکملاً درج ہو چکا ہے۔ وہ مولانا خرم علی بلہوری نے نظم کیا تھا اور بعض اصحاب اسے میدان جنگ میں بدیں غرض خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے کہ مجاہدین کے دلوں میں اسلامی جہاد کا جوش تازہ ہو اور وہ اس کے مقاصد و حدود سے آگاہ رہیں۔ ایک جہادیہ کسی صاحب نے فارسی میں بھی نظم کر دیا تھا۔ اس میں ناظم کا نام یا تخلص حسن بتایا گیا ہے۔ بعض اصحاب کے نزدیک یہ جہادیہ بھی مولوی خرم علی ہی کا ہے، لیکن انہوں نے حسن تخلص کبھی استعمال نہ کیا۔ ممکن ہے، یہ جہادیہ اس بزرگ نے مرتب کیا ہو جس نے ایک قصیدہ سفرِ حج سے مراجعت کے موقع پر پیش کیا تھا اور اس کے منتخب اشعار "سید احمد شہید" میں درج ہو چکے ہیں۔ بہر حال وہ جہادیہ بھی بطور تبرک یہاں درج کیا جاتا ہے۔ اس کی شعریت اگرچہ چنداں جاذب نہیں، تاہم مطالب کی حقانیت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔

بعد حمد خدا و نعتِ رسول ❁ بشنو ایں نظم را بہ سمع قبول
ایں رسالہ جہادیہ رنگیں ❁ می نویسد قلم نہاد جبیں
بہر دیں نے برائے طمع بلاد
جنگ با اہل کفر و اہل عناد

اہل اسلام گفتہ اند جہاد ۞ غیر ایں ہرچہ ہست، ہست فساد
آنچہ خوبیش از کلامِ خدا ۞ و ز کلامِ رسول شد پیدا

مابیاں مے کنیم سبے تقصیر
اندکے زاں بہ یاد خویش بگیر

فرض شد بر ہمہ جہاد کنوں ۞ کہ ز حد شد بروں فساد کنوں
کافراں را ببیں تو در بازار (۱) ۞ دعوتِ کفر مے کنند اظہار
بہرِ سامان او شتاب کنید ۞ عزِ دیں گر درونِ دل دارید
گرد بر پائے کس براہِ جہاد ۞ گرفتار است شد زنار آزاد
ہر مسلماں کہ او براہِ خدا ۞ کرد یک لحظہ جنگ را برپا
روضۂ خلد شد مکانِ او ۞ عیش و آرام یافت جانِ او
اے برادر شنو حدیثِ رسول ۞ از من خستہ مباش ملول
زیرِ سایہ سیوف جنت داں ۞ کہ درآں نیست شک و ریب و گماں
ہرکہ در راہِ حق ز مال و زر ۞ از دل و جاں کند نثار گہر
عوضش ہست صد بہ حشر اندر ۞ بہر او می دہند زاں بہتر
او اگر خرچ کرد و زد شمشیر ۞ ہمچوں مرداں درونِ جنگ دلیر
عوضش می دہند ہفت ہزار ۞ بے کم و کاست داں و بے تکرار
ہرکہ از مالِ خویش و ز اسباب ۞ بہر غازی تہیہ کرد شتاب
ہمچو غازی ورا دہند ثواب ۞ در قیامت برائے آں دریاب
ہرکہ نے مالِ خرچ کرد و نہ جنگ ۞ می شود وقت موت حالش تنگ
ہرکہ در راہِ حق شدہ مقتول ۞ ہست او زندہ ہم شد او مقبول

---

(۱) یہ غالباً عیسائی مشنریوں کی طرف اشارہ ہے۔

شادماں است درمیانِ جناں ◆ رزق او می رسد بہ او بر آں
مدت العمر ہرچہ شد ز انساں ◆ غیر حقِ عبادت از عصیاں
محو گردید جملہ بہرِ شہید
کہ برائے خدا سرش ببرید
فتنۂ قبر و صور و ہم محشر ◆ از چنیں صدمہ ہائے پُر ز خطر
نیست خوفے شہید را زنہا ◆ بہر او ہست جنت الماویٰ
دوست دارد خدا مجاہد را ◆ کہ چو دیوار کرد صف برپا
ہمچو دیوار پختہ و مضبوط
جملہ باید بہ یک دگر مربوط
چوں شنیدید اے مسلماناں ◆ از بیانِ جہاد و خوبیٔ آں
سوئے میدان راہ را گیرید ◆ خان و ماں را بہ یاد خود نارید
مال و اولاد و خانمان و زن ◆ حب ایں جملہ را بروں افگن
در رہِ حق بہ شادی و خنداں ◆ بہ شتابی بروں روید دواں
مال و اولاد ہمرہست اے دلدار ◆ نہ دہند ایں رہائیے ہشدار
گر بمانی تو زندہ جاں آئی ◆ بہ سوئے خانہ شاماں آئی
ور بمردی تو جنت الماویٰ
جائے تو ہست ہست خوش آنجا
دین اسلام سست گشت ببیں ◆ غلبۂ کفر شد عیاں بہ زمیں
پیشوایانِ دین کہ بگزشتند ◆ کافراں را بہ امر حق کشتند
غلبۂ دیں بزورِ شمشیر است ◆ ہر کہ گیرد بدست آں شیر است
سستی ار پیشوا ہمی کردند ◆ گوے سبقت دریں نمی بردند

ہند آباد کے شدے نہ اسلام ❁ دین اسلام می شدے گمنام
تابہ کے درمیانِ خانہ چو زن ❁ می نشینی بہ حب اہل وطن
غیر افسوس ثمرۂ سستی ❁ نیست حاصل ترا بکن چستی

غیرتے کن مکن تو نامردی
زود خیز و بیا اگر مردی

زود سوئے امام خود بروید ❁ کافراں را کشید و خوش بزنید
بے امام ایں نمی شود حاصل ❁ شرط اول امام داں غافل
جملہ بیعت بدست او بکنید ❁ بعد ازاں در جہاد خوش بروید
ورنہ موتیست موتِ نادانی ❁ علم آموز گر نمی دانی
واجب آمد بہ خلق نصبِ امام ❁ کہ بود از قریش آں خود کام

گر عداند کے امامِ زماں
موتِ او موتِ جاہلیت داں

چوں کہ دو صد گزشت بعد ہزار ❁ کرد پیدا خدا چنیں سردار
ہست از آلِ احمد مختارؐ ❁ نام او ہمچو نامِ پاک اے یار

بس پریشاں بدند اہل ایماں
شکر حق را کہ شد امامِ زماں

اکنوں اے مومناں پاک نہاد ❁ وقت آمد کہ می شود دل شاد
جان خود در رہش نثار کنید ❁ برسر اہل کفر تیغ زنید
حضرت مولوی کتاب مخواں ❁ گیر شمشیر و رو سوئے میداں
وقت جانبازی است نے تقریر ❁ غیر شمشیر در خیال مگیر
چوں توئی رہنمائے دین متیں ❁ پیش دستی نما چو زن منشیں

گر تو رفتی روند ہمراہست
خادماں ساکنانِ درگاہت
اے کہ در راہِ فقر استادی ❀ بہرِ تسخیر نفس استادی
عملِ نفس کش نما اے یار ❀ کہ بود بہتر از جہاں آں کار
گوشۂ خانہ را مگیر چو زن ❀ چلہ بگزار و خیمہ بیروں زن
اے جواناں چو شیر حملہ کناں ❀ یا چو رستم بہ قوت و ساماں
قوت و زور بہر چیست بگو؟ ❀ جرأتِ حملہ بہر کیست بگو؟
گر سر کافرے جدا کردی ❀ یا سر خویش دادی و مردی
ہر دو صورت برائے تو بہتر ❀ شادماں باش اے نکو اختر
گر بکشتی میسر آمد کار ❀ ور بمردی شہادت است اے یار
می ندانی کہ لذتِ دنیا ❀ عاقبت می شود جدا و بیا
لشکر موت ملک جانت را ❀ می کند غارت و برد از جا
چوں مقرر شدہ ترا بردن ❀ جانِ من حبِ جاں ز دل برکن
بہرِ تو بہتر است اے خوش رائے ❀ کہ برائے خدا دہی جاں را
اے کہ صدہا ز جنگ باز آیند ❀ اے کہ صدہا بہ خانہ می میرند
وقتِ موت شنو تو اے غافل ❀ شد معیّن مترس اے عاقل
تا زمانے کہ موت نیست ترا ❀ مردنت مشکل است اے خوش رائے
موت وقتیکہ آیدت اے یار ❀ تراں رہائی بہ خانہ نے ہشدار
تو مترس از سفر و کلفتِ او ❀ مرد شو راحت از دلِ خود شو
ہرچہ انساں کند شود عادت
می تواند گزشتن از راحت

بہر طمعے ہزارہا ز سیاہ ✿ سرِ خود را دہند شاں بے
اے عجب آنکہ تو مسلمانی ✿ حیلہ ہائے دروغ می رانی
در رہِ حق چرا چنیں و چناں ✿ حیلہ ہا را تو آوری بہ میاں
غرہ گشتی چرا بدیں دنیا ✿ شد فراموش از دلت عقبیٰ
حب اہل و عیال کرد بروں ✿ از دلت حب حق ہمیں اکنوں
تا بہ کے درمیان خانہ نہاں ✿ بہر اولاد و زن شوی پنہاں!
چوں رہی تو زموت خویش بداں ✿ گر بمانی درونِ خانہ نہاں
اگر امروز با رضائے دلی ✿ در رہِ حق دہی تو جاں بہ خوشی
باز فردا تو درمیانِ جناں ✿ راحت وعیش می کنی اے جاں
گر گزاری تو لذتِ دنیا ✿ بہر مولا کہ ہست آں اولیٰ
باز دائم بہ جنت اے خوش نام ✿ عیش وآرام بہر تست مدام
سرزدہ پازدہ بہ خانہ خویش ✿ مردنت بہتر است اے دلِ ریش
یا براہ خدا دہی جاں را ✿ بہتر از بہر تست اے خوش رائے
گر ندادی تو جاں براہِ خدا ✿ بس پشیماں شوی بروزِ جزا

باز ایں روے خود چہ بنمائی
بہ پیمبرؐ بہ روزِ رسوائی

لیک شرط است زیرِ حکمِ امام ✿ کہ بمانی تو دائما خوش کام
ورنہ جنگیدن و زدنِ شمشیر ✿ ہیچ سودے نمی دہد بہ دلیر
ہر کہ خود یکہ جنگ کرد و بمرد ✿ خونِ او ناحق است حسرت برد
آں کہ داند خوب مولا را ✿ ہم پیمبرؐ شفیع روزِ جزا

از دل و جاں قبول قولِ امام ۞ می نمایند خوش روند بہ کام
اہل اسلام را بود کافی ۞ اے حسنؔ ایں پیام بس وافی
بر مناجات کن تو ختم کلام
بہر تو بہتر است اے خوش نام
اے خداوندِ خالقِ ثقلین ۞ اے خداوندِ مالکِ کونین
اے خداوندِ آسمان و زمیں ۞ اے خداوندِ انس و عرش بریں
دہ تو توفیق اہل ایماں را ۞ تا بہ راحت دہند خوش جاں را
قوتِ خود بدہ و زور آور ۞ اہل اسلام را بکن یاور
وعدۂ فتح خویش کن اتمام ۞ آنچہ کردی بہ فضل خود انعام
ہند را پُر نما تو از اسلام ۞ اے شہنشاہِ مالکِ انعام
کس نیاید ندا بجز اللہ
کن قبول ایں دعاء تو یا اللہ

ضمیمہ (۲)

سید عبداللہ سیرام پوری

سید عبداللہ ابن سید بہادر علی کے حالات اختصاراً اوپر درج ہو چکے ہیں۔ کتاب حوالہ مطبع ہو چکی تھی کہ صدیق مکرم جناب محمد یونس صاحب نے کانپور سے اس قرآن مجید کے آخری عبارت نقل کر کے بھیج دی جو سید عبداللہ نے سیرام پور میں چھاپا تھا۔ پھر اصل قرآن مجید ارسال فرما دیا۔ اس سے جو نئے حالات معلوم ہوئے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ سید عبداللہ کے اجداد مدینہ شریف سے نکل کر ترمذ میں آباد ہوئے۔ پھر لاہور میں رہے۔ وہاں سے سوانا میں مقیم ہو گئے۔

۲۔ سید موصوف نے کلکتہ میں سید صاحب سے بیعت کی تھی اور حج کے لئے ساتھ گئے تھے۔

۳۔ سید احمد علی شاہ عبدالقادر کے ترجمہ قرآن پاک کا جو نسخہ خرید کر لائے تھے، سید عبداللہ نے مکہ معظمہ میں اس کی نقل حاصل کی تھی۔

۴۔ اس میں ترجمہ بہ طور تفسیر لکھا ہوا تھا یعنی متن کے ٹکڑے نقل کر کے ان کی تفسیر کی گئی تھی۔ سید عبداللہ نے پڑھنے والوں کی سہولت کے لئے اسے بین السطور لکھوا دیا۔

۵۔ جہاں جہاں کسی مقام پر شبہ ہوا تفسیر عزیزی وغیرہ سے مدد لے کر سمجھا اور ایک اور ترجمے سے بھی مدد لی جو سید عبداللہ کے والد سید بہادر علی نیز بعض دوسرے علماء نے حل کر کیا تھا۔

۶۔ ترجمے کے چھاپنے میں جو اہتمام کیا گیا، وہ محتاجِ بیان نہیں۔

۷۔ کاتب نے ۴؍ربیع الاول ۱۲۴۸ھ (یکم اگست ۱۸۳۲ء) کو کتابت متن و ترجمہ سے فراغت پائی اور قرآن مجید کی طباعت ۲۷؍جمادی الاولیٰ ۱۲۵۴ھ (۱۸؍اگست ۱۸۳۸ء) کو مکمل ہوئی:

ذیل میں وہ عبارت تبرکاً نقل کی جاتی ہے جو سید عبداللہ نے قرآن مجید مترجم کے ساتھ چھاپی تھی۔ اس کے بعض الفاظ مشتبہ ہیں۔ لیکن میرے پاس ان کی تصحیح و توضیح کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ مولوی محمد یونس اس عنایت بیگانہ کے لئے یقیناً دلی شکریے کے مستحق ہیں۔ اس مضمون میں ذیلی عنوان میں نے لگائے ہیں تاکہ پڑھنے میں سہولت رہے:

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

بعد حمد حق جل وعلا و نعت خاتم الانبیاء سرور اصفیاء کے احقر العباد سید عبداللہ ابن سید بہادر علی بن سید حسن بن سید جعفر مدنی، پیچھے اس کے ترمذی، پیچھے اس کے لاہوری، پیچھے اس کے سواتی، سب مومنوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے۔ جب اس وقت میں خاکسار نے دیکھا کہ اکثر مسلمان اس سبب سے کہ احتساب اس ملک سے **موقوف** ہوگیا اور صحبت اور آمیزش میں غیر قوم کے پھنس گئے اور خطرہ اللہ و رسول اور حاکم کا دل سے جاتا رہا۔ اسلام کی مستقیم سڑک چھوڑ کر بدعت کے طریق میں گئے اور بے مزاحمت غیر جو چاہا من مانتا کرنے لگے اور جن کو بڑے مسلمان مرد آدمی عرف میں کہتے ہیں اور وہ اپنے تئیں پڑھا عالم جانتے ہیں، انہوں نے بھی طریق وعظ و نصیحت اور سکھانا پڑھانا دینداری کے احکام کا ان کو دنیا کی عزت اور دولت اور جاہ طلبی کے سبب موقوف کیا۔ اس باعث سے نہایت غم اور غصہ اس خاکسار کی خاطر میں گذرتا تھا۔

ترجمے کی نقل

بعد چند روز کے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ایسا اتفاق ہوا کہ جناب پیر و مرشد برحق امیر المومنین امام المسلمین حضرت سید احمد صاحب دام اقبالہ و برکاتہٗ حج کے ارادے سے یہاں تشریف لائے۔ یہ خاکسار اور سیکڑوں مسلمان اس جناب پاک کی بیعت کی نعمت حاصل کر کے ان کے ہمرکاب حرمین شریفین کی زیارت سے کامیاب ہوئے اور یہ ترجمہ ہندی قرآن شریف کا جو مولانا شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی مرحوم نے کیا ہے، سید احمد علی صاحب جو حضرت پیر و مرشد کے بھانجے ہیں، ان کے پاس دیکھ کر کمال شوق سے اس کی نقل اسی مکان متبرک (۱) میں لی اور خیال کیا کہ اگر یہ قرآن شریف مع ترجمہ ہندی اس وقت کے مسلمانوں کو ہاتھ لگے، شاید اپنے پروردگار کا کلام سمجھ کر اس کو دیکھیں اور اس کلام کی برکت سے جو خود خالق کی زبان سے ہے، ان کے دل میں کچھ ہدایت آوے تو آوے، مگر کثرت اس کی بغیر اس کے کہ چھاپا جاوے، نہیں ہو سکتی۔

عزمِ طباعت

تب اس قلیل البضاعت نے بعد مراجعت اس سفر کے مولانا عبدالحیٔ صاحب اور مولانا محمد اسحاق صاحب دہلوی اور مولوی حسن علی صاحب لکھنوی کے ایماء اور استصلاح سے کمر ہمت اپنی مستحکم باندھی اور ارادہ مصمم کیا کہ جس طرح ہو اس کو چھپوانا چاہیے اور قیمت ایسی مقرر کیجیے کہ اپنا خرچ نکل آوے، اور کسی مسلمان بھائی پر جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن سمجھنے کا کچھ بھی ذوق و شوق دیا ہو، لے لینے میں بوجھ نہ پڑے۔ اس میں اکثر کچے مسلمان جو نافہم اور اس کے فوائد دینی سے آگاہ نہ تھے، باوجود اس کے کہ آپ دنیا کی دولت اور یہاں کی زندگی کے آرام اور نام کے واسطے کیا کیا فکریں اور تدبیریں خلاف

---

(۱) مکہ معظمہ

شرع کرتے ہیں اور رات دن اعانت اور استعانت میں گمراہوں سے گھلے ملے رہتے ہیں، بعض ادنیٰ باتوں کا عذر درپیش کرکر اس کے انجام ہونے میں خلل انداز ہوئے بلکہ اس بات پر طعن کرنے لگے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی جو اس خاکسار کے ارادے کے موافق ہوئی تو اسی نے اس کو بخوبی انجام کو پہنچایا اور طعن اور حسد کو انہیں پر پھینکا اور خاکسار کو اس کے ضرر سے بچا رکھا، بفضلہ وکرمہ۔ آخر اس فقیر نے اپنے پروردگار حق پر بھروسا کرکے جان ودل سے ہمت باندھی اور نیت اپنی مسلمان بھائیوں کے نفع دینی پہنچانے پر مضبوط اور خالص کی۔ پھر قریب دو برس کے عرصے میں بہت سے روپے خرچ کرکے بڑی محنت اور جانفشانی سے بے معاونت غیر اس کو انجام دیا۔

اہتمامِ طباعت

اور چھاپے کے وقت خوب اہتمام رکھا گیا کہ کارگیر اس کام کے سب طاہر اور نمازی ہوں اور کسی طرح کی بے احتیاطی اور بے ادبی واقع نہ ہو۔ اس کریم برحق کے فضل سے حسب خواہش دلی جس طرح ارادہ کیا تھا، اسی طرح اتمام کو پہنچا اور چھاپے کے وقت جہاں شبہ گذرتا تھا، کئی قرآن صحیح اور تفسیر عزیزیہ مولانا عبدالعزیز قدس سرہٗ اور تفسیر حسینی اور ایک ترجمہ ہندی اردو کی زبان میں جو اس خاکسار کے والد منشی سید بہادر علی مرحوم اور کئی فاضلوں نے مل کر کلکتہ میں کیا تھا، موجود تھے۔ ان نسخوں کی مدد سے وہ عقدہ حل ہو جاتا تھا، اور اس قرآن شریف کے اشتہار نامے کے جاری ہونے کے وقت سے بھی یہ التزام کیا ہے کہ سوائے اہل اسلام اور کسی قوم کے پاس باوجود فائدہ زاید ہدیہ اس کا نہ ہووے اور اگر کوئی دوسرا دنیا کی طمع سے اپنا دین بیچے اور ایسا کام کرے، وہ جانے اور اس کا ایمان اور اس کا کام۔

کیفیتِ وطن و اجداد

سوانا ایک بستی کا نام ہے، شہر تھانیسر کے تیرہ کوس دکھن، دلی سے پانچ منزل مغرب (۱) جس کو اس خاکسار کے اجداد میں سے حضرت شاہ زید شہید سالار لشکر نے لاہور سے مع اپنی برادری آ کر وہاں کے ہندو راجہ سے جہاد کر کے فتح کیا تھا۔ پھر وہیں شہید ہوئے اور برادری اور اولاد ان کی اس کے گرد و پیش کئی بستیوں پر عمل کر کے وہاں بسی۔ بڑے بڑے سید بزرگ ان کے سلسلہ میں ہوئے، جیسے حضرت سید شاہ میر اور حضرت سید نظام الدین اور سید اعزاز الدین نو بہادر اور سید شاہ محمد حاجی اور سید شاہ ٹھیکھ جن کے مزار کہرام اور ٹھسکے میں ہیں۔ ان بزرگواروں کا سلسلہ حضرت امام علی اصغر سے جو حضرت امام زین العابدین کے چھوٹے بیٹے تھے، جا ملتا ہے۔

اگرچہ خاکسار چند مدت سے بنگالے میں ہے، پر اب تک آمد و شد بھائیوں کی وطن سے یہاں اور قرابت بیاہ شادی کی ان سے جاری ہے۔

فائدہ

ترجمہ اصلی اگرچہ بطور تفسیر کے لکھا ہوا تھا، مگر خاکسار نے رعایت سہولت قراءت کی کر کے اس طور پر چھپایا گیا۔ کیوں کہ تفسیر کے طور پر پڑھنا قرآن شریف کا نظر کو ایک جگہ سے اٹھانا اور دوسری جگہ فاصلے پر جمانا مشکل ہوتا ہے اور ہندی عبارت کو یہاں کے مروج قاعدے سے لکھا کہ ہندی زبان کے ناواقف لوگ تانیث وتذکیر میں غلطی نہ کریں۔ چنانچہ کاف اور جیم اور دال وغیرہ بایائے معروف کو اس طرح لکھا: کی، جی، دی، اور کاف اور جیم اور دال وغیرہ بایائے مجہول کو اس طرح: "کے" "جے" "دے" اور کاف اور جیم اور تا اور با وغیرہ ہندی ثقیلہ کو اس طرح: کھ، جھ، تھ، بھ۔ واؤ اور یائے مجہول جس کے پہلے زیر ہو، اس کی علامت ۸ اور واؤ مجہول جس کے پہلے پیش ہو، اس کی

علامت ○ اور تائے ثقیلہ کی علامت ...... اور رائے ثقیلہ کی علامت ..... اور یائے ساکن جس کے پہلے زبر ہو، اس کو "ہ" مثلث سے لکھا، جیسا ہی ی، اور جائز مطلق آیت وغیرہ نسخہ اوقاف سجاوندی سے لکھا اور رکوعوں کو نسخہ نجوم الفرقان سے صحیح کیا اور قاری کی آسانی کے واسطے ہر صفحہ پر سورہ کا نام اور سیپارے کا ہندسہ لکھا اور آیات کے شمار کے لئے ہر آیت کے مقابلے میں ہندسہ دیا۔ اور فائدوں کو حاشیے میں حرف فا کے برابر رکھا مگر جہاں جگہ نہ ملی تو ہندسہ حوض اور حاشیہ میں دے دیا کہ اس کے فائدے کا ٹھکانا ہاتھ لگ جائے اور ہر سورہ کی بسم اللہ کے اوپر کلمات کی اور حرفوں کی تعداد بھی لکھ دی۔

کہیں فائدہ اصل کتاب سے زیادہ بھی لکھا، خصوصاً شانِ نزول تیسویں سیپارے میں، سو اس کی پہچان کو کتاب کا نام وہاں ذکر کر دیا اور احوال چھاپے کی کتاب کا خصوصاً جس میں اعراب ہوں اور چھاپے کے وقت جو نقص اس میں واقع ہوتا ہے، اس چھاپے کے قرآن شریف کی پہلی جلد کے اخیر میں لکھ دیا۔ مکرر ضرور نہیں۔ منصفوں اور دانش مندوں کی سمجھ کو اس قدر بس ہے۔

شکر وسپاس

ہزار شکر اس پاک پروردگار کا جس نے محض اپنے فضل وکرم سے شہر جمادی الاولیٰ کی ستائیسویں تاریخ اور ہجری کا بارہ سو پینتالیس (۲۴ر نومبر ۱۸۲۹ء) میں اس مطبوعہ قرآن شریف کو مطبع احمدی میں اتمام کو پہنچایا اور اب اس کی جناب باری سے امیدوار ہوں کہ اگر جبلت انسانی کے سبب سے کہیں کچھ بھول چوک یا کسی طرح کی بے ادبی اس خاکسار سے ہوئی ہو تو یا اللہ یا کریم تو اپنے وصف کریمی اور رحیمی پر نظر کر کے اور صفت ستاری اور غفاری کے صدقہ سے اور اپنے رسول مقبولؐ اور ان کی آل اور اصحاب کی عزت اور حرمت کے طفیل اس قصور سے بچائیو اور بخشیو اور میری اس محنت کے کام کو دنیا میں یادگار اور باقیات صالحات ٹھہرائیو، اور آخرت میں اس گنہگار کے ماں باپ کی اور اولاد کی اور بھائی

بندوں کی اور رشتہ داروں کی اور دینی دوستوں کی چھوٹے بڑے، جیتے مرے، سب کی مغفرت کا وسیلہ کیجئے اور ان میں سے جو اَب زندہ ہیں اُن کو اور اس کے پڑھنے والوں کو اور اس کے حکموں پر چلنے والوں کو اور اس چھاپے کے اہلکاروں کو اپنی رضامندی کی راہ پر لا اور ہدایت نصیب کر۔ آمین ثم آمین یارب العالمین۔

الٰہی اس قرآن شریف کے کاتب کو اور اس کے ترجمے اور فائدہ لکھنے والوں کو بھی ان دونوں کے ماں باپ الیٰ علیہم السلام آدم وحوا جو مسلمان ہوں اور ان کی اولاد اور اقربا اور دوستوں سمیت بلا حساب اور بے عذاب بہشت میں داخل کر، آمین۔

مترجم کا ترجمہ اس کاتب نے اس قرآن شریف پر لکھنا ۱۲۴۸ھ شہر ربیع الاول کی چوتھی تاریخ بارہ سو اڑتالیس ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم (یکم اگست ۱۸۳۲ء) جمعرات کے دن اتمام کو پہنچایا۔ الحمد للہ علی اتمامہ وانصرامہ حمدًا فحمدًا ثم حمدا اولی الحمد رب السموات والارض رب العرش الکریم۔ وسلامٌ علی المرسلین والحمد للہ رب العالمین٥

ضمیمہ (۳)

سید جعفر علی نقوی

سید جعفر علی نقوی کے متعلق ان کے خاندان کے ایک فرد سید عبدالسلام (محلہ بشیر گنج کان پور) سے مزید حالات معلوم ہوئے، جو خلاصۃً ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ آٹھویں صدی ہجری میں اس خاندان کا پہلا فرد جس کا نام سید جلال الدین تھا، ہندوستان آیا اور اس کے افراد اجودھیا کے محلہ سید واڑہ میں مقیم رہے۔

۲۔ غالباً گیارہویں صدی ہجری میں اس کی ایک شاخ مجھوا میر میں مقیم ہوئی جو پہلے گورکھپور میں شامل تھا۔ آج کل ضلع بستی میں ہے۔

۳۔ سید جعفر علی کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی خاندان میں کی تھی۔ یہ بی بی عمر میں سید جعفر علی سے بڑی تھیں۔ دوسری شادی سید احمد علی رام پوری کی صاحبزادی سے کی، جن کا نام غالباً فاطمہ بی بی تھا۔ سید جعفر علی نے اپنے ایک گاؤں کی آمدنی میں سے ایک چوتھائی حصہ اس بی بی کے مہر میں لکھ دیا تھا۔ ان کے بھتیجے سید محمد زکریا نے اس کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا۔ خاندان کے لوگوں نے مصالحت کرا دی اور طے ہو گیا کہ سید جعفر علی کے حصے میں سے "۱/۸" بی بی صاحبہ کے پاس رہے اور "۱/۸" سید محمد زکریا کو دے دیا جائے۔

۴۔ سید جعفر علی کی صاحبزادی سیدہ زینب کی شادی محلہ قافلہ ٹونک کے سید

شریف حسن بن سید مہدی حسن سے ہوئی تھی۔ وہی سید جعفر علی کے خلیفہ مقرر ہوئے۔ لاولد رہے اور انہیں سیدہ زینب کے ذریعے سے جو جائداد ملی تھی، وہ اپنے بھائی سید لطیف حسن کے نام ہبہ کردی۔

۵۔ سید جعفر علی کی دونوں بیویاں موجودہ عیسوی صدی کے اوائل تک زندہ رہیں۔ سید عبدالسلام لکھتے ہیں کہ میں نے بچپن میں انہیں دیکھا تھا۔ ان کا دستور یہ تھا کہ نماز فجر کے بعد چارپائی پر بیٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت کرتیں۔ روٹیوں کے ٹکڑے مل کر پاس رکھتیں اور چڑیوں کو ڈالتی جاتیں۔ چڑیاں ان سے اس قدر مانوس ہوگئی تھیں کہ چارپائی اور بدن پر آ بیٹھتیں۔ ان کے انتقال سے دس بارہ برس بعد سیدہ زینب نے وفات پائی۔

۶۔ سید جعفر علی کا حلیہ یہ تھا: دوہرا بدن، خوب قد آور، ڈاڑھی گھنی، گھوڑے کی سواری کے شائق تھے۔ ان کی کچی قبر اب تک محفوظ ہے۔

۷۔ سید عبدالسلام فرماتے ہیں کہ خاندانی روایتوں میں شاہ عبدالعزیز سے تعلیم پانے کا بھی ذکر ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اجازت لیے بغیر چپ چاپ گھر سے نکل کر دلی پہنچ گئے تھے۔ گھر سے جتنے خط ان کے پاس گئے، وہ سب بند کے بند پڑے رہے۔ تعلیم مکمل کر چکنے کے بعد انہیں کھول کر پڑھا۔

میری معلومات کے مطابق یہ روایت صحیح نہیں۔ سید جعفر علی نے تعلیم کی تکمیل لکھنؤ میں کی۔ وہ بہ سلسلہ جہاد امب پہنچے (رمضان ۱۲۴۵ھ) تو پہلی مرتبہ سید صاحب کو دیکھا، البتہ ان کے والد سید قطب علی اور بھائی سید حسن علی تکیے پہنچ کر سید صاحب سے بیعت کر چکے تھے۔

۸۔ سید جعفر علی کے والد سید قطب علی کے بھائی سید احمد علی تھے، ان کے دو فرزند ہوئے: سید اصغر علی اور سید اکبر علی۔ موخر الذکر کے فرزند کا نام سید فرزند علی تھا۔ اصغر علی کے

اخلاف کی کیفیت یہ ہے:

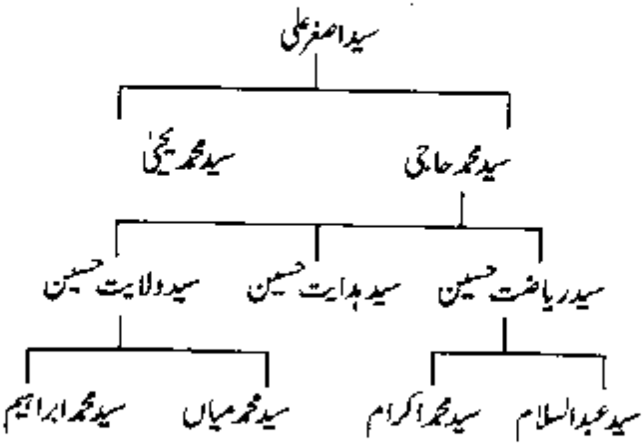
سید اصغر علی
سید محمد حاجی
سید محمد یحییٰ
سید ریاضت حسین
سید ہدایت حسین
سید ولایت حسین
سید عبدالسلام
سید محمد اکرام
سید محمد میاں
سید محمد ابراہیم

ضمیمہ (۴)

شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب

افسوس کہ سید صاحب کے ارادت مندوں میں سے دو ایسی شخصیتوں کے حالات اتفاقیہ نظر انداز ہو گئے جو دورانِ جہاد میں روپے کی فراہمی اور ارسال کے سبب سے بڑے مرکز کے مہتمم تھے، یعنی شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب۔ اس فروگزاشت کی تلافی ضمیمہ میں کی جاتی ہے۔

شاہ محمد اسحاق

شاہ محمد اسحاق کو سرسید احمد خاں نے "زبدۃ المحدثین" لکھا ہے۔ بے ریب وہ آخری دور میں علوم دین کا بہت بڑا سرچشمہ تھے۔ شاہ عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے کہ میری تقریر اسماعیل (شاہ شہیدؒ) نے لے لی، تحریر رشید الدین نے اور تقویٰ اسحاق نے۔

والد بزرگوار کا نام شاہ محمد افضل تھا، جن کا نسب چند پشت اوپر جا کر شاہ عبدالعزیز سے مل جاتا تھا۔ شاہ محمد افضل کے علم و فضل کے علاوہ غالباً ہم نسبی ہی کی بنیاد پر شاہ عبدالعزیز نے اپنی ایک صاحبزادی کا نکاح ان سے کیا۔ جن کے بطن سے شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب پیدا ہوئے۔ شاہ اسحاق کی تاریخ ولادت ۱۱۹۲ھ (۱۷۷۸ء) ہے اور شاہ یعقوب ان سے دو برس چھوٹے تھے۔

شاہ عبدالعزیز نے دونوں نواسوں کی تربیت خود فرمائی اور تعلیم بھی خود ہی دی۔ پھر شاہ اسحاق کامل بیس برس تک جلیل القدر نانا کے سامنے حدیث کا درس دیتے رہے۔ شاہ

عبدالعزیز کا انتقال ۱۲۳۹ھ میں ہوا تو خاندان میں سے مولانا عبدالحئی اور مولانا شاہ اسماعیل علم وفضل کے علاوہ عمر میں بڑے ہونے کے باعث مسندِ درس پر بیٹھنے کے حقدار تھے، لیکن وہ دونوں اپنی زندگیاں سید صاحب کی معیت میں جہاد فی سبیل اللہ کے لئے وقف کر چکے تھے، لہٰذا بالاتفاق شاہ اسحاق کا فرق مبارک دستارِ خلافت سے مزین ہوا۔

روزانہ زندگی

مولوی نجف علی نے ''فیض روح قدسی'' کے نام سے ایک رسالہ عربی میں سید صاحب، شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحئی اور شاہ اسحاق کے حالات میں لکھا تھا۔ اس میں شاہ اسحاق کی روزانہ زندگی کی کیفیت یوں بیان کی ہے:

تہجد پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے سو جاتے، صبح کی نماز مسجد میں باجماعت ادا کرتے۔ پھر گھر چلے جاتے اور لڑکیوں کو تعلیم دیتے۔ سورج دو نیزے بلند ہوتا تو درسگاہ میں تشریف لاتے اور دوپہر تک تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس دیتے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑی دیر کے لئے قیلولہ فرماتے۔ نماز ظہر مسجد میں ادا کر چکنے کے بعد پھر درس کا سلسلہ شروع ہو جاتا، جو نماز مغرب تک جاری رہتا۔ بیچ میں صرف نماز عصر کے لئے تھوڑی دیر ملتوی ہوتا۔ مغرب کی نماز کے بعد گھر جاتے لیکن جلد واپس آ جاتے اور نمازِ عشا تک طلبہ کو مختلف کتابیں پڑھاتے۔ نمازِ عشاء کے بعد استراحت فرماتے۔

کتنی پاکیزہ زندگی تھی، جس کا ایک ایک لمحہ کتاب وسنت کی خدمت کے لئے وقف تھا۔ شاہ عبدالعزیز کے معمول کے مطابق ہفتے میں دو دن وعظ بھی فرماتے۔ تراجم علمائے حدیث میں سرسید احمد خاں کا ایک بیان بہ روایت نواب مصلح الدین احمد درج ہوا ہے، جس کا مفاد یہ ہے کہ میں (سرسید) شاہ اسحاق کے وعظ میں حاضر ہوتا۔ باہر مردوں کا ہجوم ہوتا اور زنانے میں عورتوں کا۔ نہ ڈولیوں کا شمار ہوتا، نہ پالکیوں کا۔ شاہی محلات تک کی

بیگمات آتیں۔ امراء کے ہاں سے کھانے کی دیگیں پک کر آتیں جو طلبہ اور عوام میں تقسیم ہو جاتیں۔ خود شاہ صاحب معمولی چپاتی اور شوربہ گاڑھے کے دستر خوان پر رکھ کر تناول فرماتے۔ (۱)

جہاد میں اعانت

سید صاحب جہاد کے لئے سرحد تشریف لے گئے تو انہوں نے فراہمی اموال کیلئے جابجا مرکز قائم کر دیے تھے اور اپنے خاص داعی بھی مختلف حصوں میں مقرر فرما دیے تھے، جن کی کیفیت بیان ہو چکی ہے۔ مال کی فراہمی کا سب سے بڑا مرکز شاہ اسحاق اور شاہ یعقوب ہی کی تحویل میں تھا اور دونوں بھائیوں کے نام سید صاحب کے مکاتیب کا ذکر کتاب کے ابتدائی حصے میں آ چکا ہے۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ اس مرکز سے کس طرح پابندی کے ساتھ ہنڈیاں سرحد بھیجی جاتی تھیں۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد بقیۃ السیف مجاہدین کی جو جماعت سرحد میں ٹھہر گئی تھی، اس کیلئے بھی زر اعانت کا سلسلہ شاہ اسحاق نے جاری رکھا، چنانچہ شاہ صاحب کے داماد مولوی سید نصیر الدین فرماتے ہیں کہ جب شاہ صاحب وعظ فرماتے تو میں مدرسے کے دروازے پر لوگوں سے چندہ وصول کرتا۔

۱۲۴۰ھ (۱۸۲۵ء) میں اہل و عیال کے ساتھ حج کیا، واپس آ کر پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

ہجرت اور وفات

سید صاحب نے ہجرت و جہاد کے ذریعے سے ایمانی زندگی کا بہترین طریقہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ شاہ اسحاق نے جب دیکھا کہ ہندوستان کو دار الاسلام بنانے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تو مسلمانوں کے سامنے ایمانی زندگی کا دوسرا

---

(۱) تراجم علماء حدیث ہند، ص: ۱۱۷، ۱۱۸۔

طریقہ پیش کر دیا یعنی وہ اہل و عیال کے ساتھ ہجرت کر کے ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں بھی درس جاری کر دیا۔ رجب ۱۲۶۱ھ (جولائی ۱۸۴۵ء) میں وفات پائی اور جنت المعلٰی میں دفن ہوئے۔ غسل کے وقت مکہ معظمہ کے مشہور عالم شیخ عبداللہ سراج نے فرمایا: قسم بخدا اگر یہ بزرگ کچھ مدت اور زندہ رہتے اور میں ان کو حدیث سناتا رہتا جب بھی ان کے مرتبے کو نہ پہنچتا۔

شاگردوں کا شمار نہیں ہوسکتا۔ چوں کہ سارا وقت درس میں گذرتا تھا، اس لئے تصنیف و تالیف کی فرصت نہ مل سکی۔ بعض سوالات کے جواب میں رسالے لکھے ہیں جن میں سے ''مسائل اربعین'' اور ''مائۃ مسائل'' مشہور ہیں۔ ''تذکرۃ الصباح'' بھی انہیں سے منسوب ہے۔

اولاد

اولاد میں ایک صاحبزادہ تھا اور تین صاحبزادیاں۔ صاحبزادے کا نام سلیمان تھا، جس کی وجہ سے شاہ اسحاق کی کنیت ابوسلیمان پڑی، لیکن وہ غالباً جلد فوت ہوگیا۔ صاحبزادیوں میں سے ایک مولانا عبدالحئی کے فرزند ارجمند مولانا عبدالقیوم سے بیاہی گئی۔ دوسری کی شادی شاہ محتشم بن شاہ معظم بن مقرب اللہ بن شاہ اہل اللہ برادر شاہ ولی اللہ سے ہوئی۔ تیسری مولوی نصیر الدین کے گھر کی زینت بنی، جو شاہ رفیع الدین کے نواسے تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ مولوی سید نصیر الدین کی والدہ ابتدا ہی سے اس رشتے کی خواہاں تھیں، لیکن چوں کہ مولوی صاحب موصوف کو تحصیل علم کا شوق نہ تھا اس لئے شاہ صاحب نے رشتے سے انکار کر دیا۔ مولوی صاحب کیلئے یہ انکار تازیانۂ تنبیہ بنا۔ تھوڑی ہی مدت میں محنت و ریاضت سے وقت کے بہت بڑے عالم بن گئے۔ اس وقت شاہ اسحاق نے

رشتہ منظور کر لیا۔ مولوی صاحب نے ۱۲۵۰ھ میں سید صاحب کی تحریک جہاد میں زندگی کی نئی روح پھونکی۔ کئی برس تک سندھ، بلوچستان اور افغانستان میں مصروف تنظیم جہاد رہے، پھر ستھانہ چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ ان کے دو فرزند تھے: عبداللہ اور عبدالحکیم۔ ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔

شاہ محمد یعقوب

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، شاہ محمد یعقوب شاہ اسحاق سے دو برس چھوٹے تھے۔ علم وفضل اور تقویٰ میں بھائی کا نمونہ تھے۔ ۲۷؍ ذی قعدہ ۱۲۸۳ھ (۲؍ اپریل ۱۸۶۷ء) مکہ معظمہ میں وفات پائی۔

شاہ ولی اللہ کی پیش گوئی

نواب صدیق حسن خاں نے ''اتحاف النبلاء'' میں ''قول جلی'' کے حوالے سے شاہ ولی اللہ کی ایک پیشگوئی درج کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو فرزند عطا کیے ہیں (شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالغنی) وہ سب سعید ہیں۔ ان میں مملکیت کی ایک قسم کا ظہور ہوگا۔ تدبیر غیب کا تقاضہ یہ ہے کہ دو اور شخص پیدا ہوں گے جو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں علوم دین کے احیاء کا انتظام کریں گے۔ ان کا نسب والدہ کے ذریعے سے ہمارے ساتھ وابستہ ہوگا۔ (۱)

یہ پیشگوئی نظر بہ ظاہر شاہ اسحاق اور شاہ یعقوب کے ذریعے سے پوری ہوئی۔

ارواحِ ثلاثہ کی روایات

''ارواحِ ثلاثہ'' میں شاہ اسحاق اور شاہ یعقوب کے متعلق بہت سی روایات درج

---

(۱) اتحاف النبلاء، ص: ۴۳۔

ہیں۔ (۱) جن میں سے بعض دلچسپ ہیں۔ مثلاً:

۱۔ شاہ صاحبان حرم شریف میں جاتے تو جوتے بے تکلف باہر چھوڑ جاتے۔ ان کے جوتے کبھی گم نہ ہوئے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن مرحوم نے فرمایا کہ یہ دراصل شاہ عبدالقادر کی تعلیم تھی۔ اکبری میں مسجد میں جوتے چوری جانے لگے تو شاہ صاحب نے لوگوں سے فرمایا کہ اپنے جوتے چوروں کیلئے حلال کر دیا کرو، پھر وہ انہیں نہ لیں گے۔

۲۔ شاہ صاحبان بہت سخی تھے اور اکثر تنگی کی وجہ سے ملول رہتے تھے۔ ایک روز انہیں بہت خوش دیکھا گیا، کسی نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ سکندر آباد کی تحصیل میں حسن پور نام ان کا ایک گاؤں تھا جسے سرکار نے ضبط کر لیا تھا۔ خوشی اس بات کی تھی کہ معاش کا ایک ظاہری ذریعہ ختم ہو گیا اور صرف خدا پر بھروسہ رہ گیا۔

۳۔ شیخ فیض علی نے بیان کیا ہے کہ شاہ عبدالعزیز نے شاہ ولی اللہ کے مزار کے پاس جو مسجد بنوائی تھی، شاہ اسحاق اسے اچھا نہ جانتے تھے۔ فرماتے تھے کہ قبرستان میں مسجد نہ بنوانا چاہیے۔

---

(۱) ملاحظہ ہو ارواح ثلاثہ ص: ۸۰-۹۰۔

ضمیمہ (۵)

متفرق واقعات

بعض احوال و وقائع کتاب کی ترتیب مکمل ہو جانے کے بعد معلوم ہوئے انہیں یہاں درج کیا جاتا ہے۔

مولانا عبدالحیٔ

ایک روایت سے معلوم ہوا کہ حرم پاک میں پہنچے تو سید صاحب نے مولانا عبدالحیٔ اور شاہ اسماعیل سے فرمایا کہ یہ متبرک مقام ہے، وقت فرصت غنیمت ہے۔ کوئی درس شروع کر دینا چاہیے، چنانچہ مولانا عبدالحیٔ نے مشکوٰۃ کا درس شروع کر دیا اور شاہ اسماعیل نے حجۃ اللہ البالغہ کا۔ حج کے بعد بھی یہ درس بدستور جاری رہے۔

سید صاحب کا معمول تھا کہ اکثر نماز عصر کے بعد رکن یمانی کے قریب بیٹھ کر مراقبہ و دعا کرتے۔

شانِ تلقین

سفر منیٰ و عرفات میں مولانا عبدالحیٔ نے اپنے اہل خانہ کو اونٹ پر سوار کرایا، خود بھی سوار ہوئے۔ کچھ رفقاء بھی ساتھ تھے۔ مغرب کی نماز کا وقت آیا تو مولانا نے اونٹوں کے مالک کو آواز دی کہ ذرا ٹھہرو ہم نماز ادا کر لیں۔ اس شخص نے عجلت کے خیال سے ٹھہرنا پسند نہ کیا اور بے احتیاطی سے بولا تم برے لوگ ہو، خدا پھر تمہارا ساتھ نصیب نہ کرے۔

مولانا نے باطمینان نماز ادا کی۔ پھر اونٹوں کے مالک کو سمجھایا کہ بھائی ہم لوگ ہندوستان سے حج و عبادت کیلئے آئے ہیں۔ تم ہم سے نفرت کرتے ہو اور بددعاء دیتے ہو؟ معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں ایمان سے بہرہ نصیب نہیں ہوا۔ دعاء کرو کہ خدا تمہیں ایمان نصیب کرے۔ اس نے بہت معذرت کی اور مولانا سے عرض کیا کہ آپ میرے لئے دعاء فرمائیں۔

سفر ہجرت

مولانا عبدالحئیؒ کو سفر ہجرت میں بڑی مشکلات پیش آئی تھیں۔ خاصا وقت بہاول پور میں گزارا۔ سلخ ربیع الاول ۱۲۴۲ھ میں بھاگ (بلوچستان) پہنچے، تیرہ دن وہاں ٹھہرے رہے، پچیس روز حاجی میں گزارے۔ دو مہینے مٹھری میں قیام کیا۔ ۸؍رجب کو قندھار گئے۔ ۱۶؍رمضان کو وہاں سے چلے تو ۵؍شوال کو کابل پہنچے پھر جلال آباد کے راستے سوات میں سید صاحب سے ملاقی ہوئے۔

مولانا محمد یوسف

مولانا محمد یوسف پھلتی کی والدہ حج کیلئے ساتھ نہ گئی تھیں، عین حج کے دنوں میں ان کے انتقال کی خبر مکہ معظمہ پہنچی، سید صاحب نے حرم پاک میں انکی مغفرت کیلئے دعاء کی۔

ضمیمہ (۲)

قصیدہ

در فضائل حبرِ نبیل مولانا محمد اسماعیل

یہ قصیدہ مولوی محمد حسین صاحب تخلص بہ فقیر نے لکھا تھا اور میرے علم کے مطابق صرف ایک مرتبہ ایک مختصر سے رسالے کے ساتھ چھپا جس کا نام "فضائل عالم باعمل" تھا۔ اس رسالے کے حاشیے پر شاہ محمد فاخر الٰہ آبادی کا "تحفہ زائر" شائع ہوا اور آخر میں یہ قصیدہ۔ قصیدہ بہت لمبا تھا، میں نے بہت سے شعر حذف کر دیے اور صرف وہ شعر چنے جو شاہ شہید کے فضائل سے متعلق تھے۔ یہ قصیدہ اب نایاب ہے امید یہ ہے کہ اس کے مندرجہ ذیل اشعار محفوظ ہو جائیں گے۔

پوچھئے نام تو ہم نام ذبیح اللہ تھے ❁ بوعمر(۱) تھے وہ اگر پوچھئے ان کی کنیت
دیکھنے والے ابھی انکے بہت ہیں موجود ❁ کیجئے تصدیق جو اس عرض میں شک ہو حضرت
عالم ایسے تھے کہ علم کا ان کا نہ ہو بیاں ❁ علماء کو بھی رہی علم سے ان کے حیرت
صرف، نحو میں وہ رتبہ عالی ان کا ❁ ابن حاجب کی نہ تھی عہد میں انکے حاجت

---

(۱) یعنی شاہ صاحب کا نام اسماعیل اور ان کے فرزند ارجمند کا نام عمر تھا، لہٰذا "بوعمر" ان کی کنیت ہوئی، لیکن شاہ شہید کے سلسلے میں اس کنیت کا ذکر کبھی نہیں سنا۔

اہل معقول بنے انکے بیاں سے معقول ❁ اہل ہیئت پہ رہی ان کی ہمیشہ ہیبت
ہر اشارہ تھا اشارات، شفا تھا ہر لفظ ❁ پور سینا کو کلام انکا سکھادے حکمت(۱)
جو ادب میں انہیں سکاکیؔ دوراں کہیے
کب بجا ہے کہ یہ ہے بے ادبی کی نسبت
علم تفسیر کو کیا کہیے کہ گویا ان کو ❁ ابن عباسؓ کی تھی روح سے حاصل قربت
کیا بیاں معنیٔ قرآں کیے، سبحان اللہ ❁ گویا ان آنکھوں کو دکھلا دیے نار و جنت
اس قدر علم احادیث رسول حق تھا ❁ نائب ختم رسل انکی مناسب ہے صفت
تھے وہ بے واسطہ تلمیذ بخاریؔ گویا ❁ ایسے شاگرد سے مسلمؔ کو بھی ہوتی راحت
ترمذیؔ کے وہ اگر عہد میں ہوتے تو ضرور ❁ نور چشم اپنا سمجھتے وہ انہیں بے منت
ہوتے مالکؔ کے زمانے میں اگر مولانا ❁ ملک تدریس کی دیتے وہ انہیں ملکیت
پاتے قسمت سے اگر دور سلیماں (۲) کی حدیث ❁ سارے شاگردوں سے لیجاتے وہ گوئے سبقت
ابن ماجہؔ کا اگر وقت میسر ہوتا ❁ کرتے وہ ان کیلئے سب سے زیادہ عزت
گو نہ محفوظ تھیں سینے میں احادیث صحاح
تھے خبردار خبر سے وہ بہت باخبرت
بوحنیفہؒ کا زمانہ بھی اگر وہ پاتے ❁ مجتہد ان کو بنا دیتی انہوں کی صحبت
ہوتے شاگردوں میں مانند ابو یوسفؒ وہ ❁ کرتے جو خدمت نعمان سے حاصل برکت
عالم و عامل قرآن وحدیث ایسے تھے ❁ ان کا دستور عمل تھا یہ کتاب و سنت
حاجی ایسے کہ طفیل انکے بہت سی مخلوق ❁ حاجیٔ کعبہ ہوئی زائر بیت حضرت
یعنی وہ شوق دلایا کہ سفر ہائے حجاز ❁ قطع کرنے میں سبھی ہو گئے بلند ہمت

---

(۱) پور سینا سے مراد بوعلی سینا ہے، اشارات و شفا اس کی مشہور کتابیں ہیں۔

(۲) مراد ہے سلیمان بن اشعث بن اسحاق الازدی السجستانی صاحب سنن۔

واعظ ایسے تھے کہ کیا انکے بیاں کا ہو بیاں ❁ سننے والوں کو عجب ہوتی تھی رغبت بیعت
جب حدیث نبوی کا وہ بیاں کرتے تھے ❁ ہوتا تھا قلق سے معدوم حدوث بدعت
ذکر دوزخ کا جو آتا تو جلا دیتی تھی ❁ آتش خوف خدا چہرۂ خواب غفلت
اور جنت کا بھی کچھ ذکر جو آتا تھا ❁ سن کے کفار بھی اسلام کی کرتے رغبت
اور جو کرتے تھے کبھی ہول قیامت کا بیان ❁ مجلس وعظ کی ہو جاتی تھی ایسی صورت
ایک کو دوسرے کی کچھ نہ خبر رہتی تھی ❁ اسقدر ہوتی تھی ہر ایک کے دل کو وحشت
سر کے نزدیک جو وہ شمس ہدیٰ ہوتا تھا ❁ شرم افعال سے ہوتی تھی عرق کی شدت

توبہ توبہ میری یارب یہ ہر اک کہتا تھا
اس قدر ہوتی تھی واں ہیبت رب العزت

سر کو سجدے میں جھکا دیتے ہی بن پڑتی تھی ❁ بے نمازوں کی بدل جاتی تھی ایسی حالت
فرض جن سے نہ ادا ہوتا تھا، وہ صورت قرض ❁ کرتے نفلیں بھی ادا کرنے میں اپنی نیت
اکل و شرب اپنا فراموش وہ کر دیتے تھے ❁ روزہ خوروں کو تھی اس وعظ کی اتنی ہیبت
پھر تو عیدین سے تشریق سے لاچار تھے وہ ❁ سال بھر روزے کی تھی انکو وگرنہ رغبت
جو نہ دیتے تھے زکوٰۃ انکا یہ ہوتا تھا حال ❁ صرف کل مال میں کرتے تھے وہ صرف ہمت

عیش میں گھر سے بھی تھا جن کو نکلنا مشکل
سفر حج کی پیادہ ہوئی ان کو رغبت

ہو گئے سیکڑوں زانی بھی زنا سے تائب اور میخوار بھی توبہ سے ہوئے پاک صفت
زانیہ عورتیں بھی ان کی نصیحت سن کر باندھتی تھیں کسو دیندار سے عقد حلت
ہے یہ مشہور کہ دہلی میں وہ ایک روز کہیں اک زن فاحشہ کے در پہ گئے با عزت
اس کو کچھ ذکر قیامت جو سنایا تو وہیں وہ بھی تائب ہوئی اور اسکی جو تھیں ہم صحبت

اور ان سب کے باندھ دیے اسی لحظہ نکاح
اللہ اللہ یہ تھی ان کے بیاں کی ہیبت
اور دہلی ہی کی مسجد میں یہ مشہور ہے بات ❁ حوض تک رہتا تھا بازار لگا بے دہشت
خیر کی جائے کو کر ڈالا تھا اک موقع شر ❁ اس قدر شہر میں تھی اہل ہوا کی کثرت
بہ طفیل ان کے وہاں سے بلا دور ہوئی ❁ موضع خیر میں افزوں ہوئی بس خیریت
مسجدیں سیکڑوں آباد ہوئیں انکے سبب ❁ مرد و زن لاکھوں نمازی ہوئے صافی طینت
گریۂ طفل کو سنتی ہی نہ تھی مادر طفل ❁ اس زمانے کی نمازوں میں یہ تھی محویت
ہر نمازی کو ہوا شوق تہجد ایسا ❁ بستر خار بنا بستر خواب راحت
خواب شیرینِ سحر کا نہ مزہ تھا ان کو
طاعتِ حق میں انہیں آتی تھی کیا کیا لذت
ہر جگہ دین محمد کا رواج ان سے ہوا ❁ ظلمتِ دہر میں روشن ہوا نور سنت
دیکھو دشوار تھا کیا کچھ زنِ بیوہ کا نکاح ❁ وہ بھی آسان ہوا ان سے علیہ الرحمت
ورنہ اس ہند پہ آفات میں اہلِ اسلام ❁ عار اس کام سے رکھتے تھے برہمن کی صفت
شکر لاکھوں ہے رحمت کے خدایا کہ یہاں
بہ طفیل ان کے ادا ہونے لگی یہ سنت
اک جگہ سنتے ہیں فرماتے تھے مولانا وعظ ❁ پیر زن ایک ہوئی سن کے غضب ناک
اور کہنے لگی یہ مولوی ایسا آیا ❁ اپنے رانڈوں کے تو اے لوگو بھی کھو دیے ست
دانہ بی بی کا جو کھاتے تھے وہ محروم ہوئے ❁ کیونکہ ہر رانڈ ہوئی اب تو دو خصمی عورت
اس کو نرمی سے یہ سمجھایا نہ کیجئے غصہ ❁ مجھ کو کہنے میں نہیں اپنی طرف سے جرأت
بلکہ فرماتے ہیں یوں بی بی(۱) کے بادا صاحب ❁ میں جو کہتا ہوں یہ سب کچھ ہے پیامِ حضرت

---

(۱) یہاں بی بی سے اشارہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی طرف ہے۔

اور سب چھوٹ گئیں آپ کے سمجھانے سے
رسم بد شادیوں کی اور غمی کی بدعت
اور مہاجر بھی وہ ایسے تھے کہ سبحان اللہ ❁ ما نہی اللہ سے تھی ان کو ہمیشہ نفرت
ظاہراً مال سے اولاد سے، گھر سے ان کو ❁ اس قدر عشقِ الٰہی میں ہوئی تھی نفرت
سب دیا چھوڑ مگر ہاتھ سے چھوڑا نہ کبھی
رشتۂ ہجرت فی اللہ بل بے ہمت
غازی ایسے تھے کہ کیا ان کی غزا کا بیاں ❁ آبِ شمشیر کو پیتے تھے وہ مثلِ شربت
ان کی شمشیر کا زہراب ملا دیتا تھا ❁ فوجِ کفار کے دریا میں عجب سمیت
یہ سنا ہوگا کہ سکھوں کو بہت قتل کیا ❁ سکھ سے پھر رہ نہ سکے سکھ ہوئے ایسے غارت
مال سے، ملک سے اور جاہ سے کچھ کام نہ تھا ❁ تھا تو یہ کام تھا، عالی ہو یہ دین و ملت
راہِ مولا میں بھی قربان ہوئے واہ نصیب
اور حیاتِ ابدی پائی علیہ الرحمت
جو برا کہتے ہیں ایسوں کو، برا کرتے ہیں ❁ عیب اپنے بیاں کرتے ہیں وہ بد طینت
ظاہراً بے ادبی ہے یہ کلامِ حق کی ❁ ایسے حافظ کو برا کہتے جو ہو بد خصلت
ایسے عالم کی مذمت جو کیا کرتے ہیں
مثلِ جاہل ہیں اگرچہ انہیں ہو علمیت